محبوب عالم

رات، ریل اور رُقعے

جرم وسزا پر مشتمل جذبات میں زلزلے برپا کر دینے والی 6 ناقابل فراموش کہانیاں

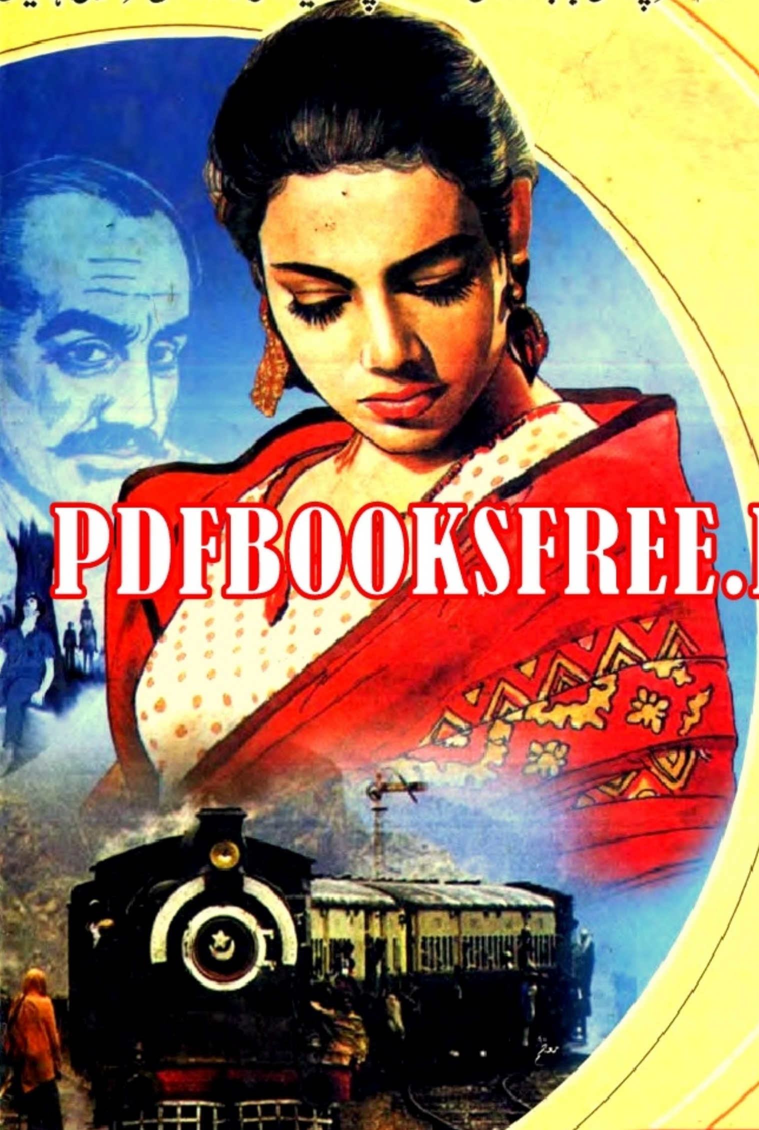

PDFBOOKSFREE.PK

مکتبہ داستان

پیش لفظ

جرم و جاسوسی ایک ایسا موضوع ہے جو کہانیوں اور فلموں کے شائقین کے لئے ہمیشہ سے دلچسپی اور پسندیدگی کا حامل رہا ہے۔ ایک وقت تھا جب لوگوں میں یہ تاثر تھا کہ جرم و جاسوسی کی کہانیاں صرف انگریزی ناولوں اور فلموں تک ہی محدود ہیں، اردو زبان میں یا ہمارے معاشرے میں ایسی کہانیاں ملنا ناممکن ہے۔ یہ بات کسی حد تک ٹھیک بھی تھی لیکن ادارہ حکایت نے اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور جرم و جاسوسی کی بجائے جرم و سزا کے عنوان سے اپنے معاشرے میں ہونے والے جرائم اور ان کی تفتیش کے ایسے ایسے ڈرامے پیش کئے کہ لوگ انگریزی کہانیوں کو بھول گئے۔

محترم احمد یار خان کے بعد محبوب عالم کا نام آتا ہے جنہوں نے اپنی تفتیشی کہانیوں سے مقبولیت حاصل کی۔ ان دونوں ریٹائرڈ انسپکٹر صاحبان نے ثابت کر دیا کہ اپنے معاشرے میں ہونے والے جرم و سزا کے ڈرامے کسی طور بھی انگریزی کی سراغرسانی کی کہانیوں سے کم نہیں۔ ان حقیقی تفتیشی کہانیوں میں ہونے والے جرائم ہمارے اپنے معاشرے کے ہیں، جرم و سزا کی ان کہانیوں میں آپ کو اپنی چار دیواری کی دنیا کے ایسے ڈھکے گوشے نظر آئیں گے جن پر عام آدمی کی نظر نہیں جاتی۔ زن، زر اور زمین کی روایتی مثلث ملے گی جو تقریباً ہر جرم کی بنیاد بنتی ہے۔

یہ تفتیشی کہانیاں من گھڑت قصے نہیں، حقیقی زندگی کی وارداتیں ہیں، انسانی فطرت کی نیرنگیاں ہیں جو ہر پل ایک نئے رنگ میں رنگی نظر آتی ہے۔ ان کہانیوں میں آپ کو جہاں تفریح کا سامان ملے گا وہیں انسان کی نفسیات اور نیکی بدی کا فلسفہ بھی ملے گا۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ اسے بلا جھجک گھر لے جا سکتے ہیں۔

شاہد جمیل

مدیر ''حکایت''

فہرست

پردہ جو میں نے ڈالا	7
سوہنی مہینوال اور قاضی	42
رات، ریل اور رقعے	83
سوکنیں، سالا اور سٹینو	125
دِلوں کے بھیدی	160
خودکُشی سے قتل تک	189
بہن، بیوی اور بلیک میلنگ	219

پردہ جو میں نے ڈالا

حال ہی میں ابوظہبی میں ایک پچاسی سالہ بوڑھا شیخ قتل ہوگیا ہے۔ میں نے یہ خبر این سی این سے سنی تھی اور امریکہ کے ہفتہ وار پرچے ''ٹائم'' میں پڑھی۔ یہ دیکھ کر بہت افسوس ہُوا کہ اس قتل کی خبر ساری دنیا میں مشہور ہوئی اور بہت سے ملکوں کے ٹی وی اور اخبار رسالے اس پر تبصرے بھی کرتے رہے لیکن پاکستان کے اخباروں نے اس واردات کو ذرا سی بھی اہمیت نہ دی اور یہ خبر شائع نہ کی۔

میں نے جب یہ خبر پڑھی اور سی این این پر سنی تو مجھ کو فوراً قتل کا ایک کیس یاد آ گیا جس کی تفتیش میں نے بحیثیت ایس ایچ او کی تھی۔ یہ پاکستان کی پیدائش سے کچھ سال پہلے کی واردات ہے جو یاد آئی تو میں نے اپنے پرانے کاغذات نکالے اور ورق الٹ الٹ کر اس صفحے پر پہنچا جہاں میں نے ڈائری کے طور پر یہ واردات اور تفتیش مختصراً لکھی ہوئی ہے۔ ہمارے وقتوں کے اکثر تھانیدار اور اُن سے بڑے افسر ڈائریاں لکھتے رہتے تھے۔ میرے پیر استاد جناب احمد یار خان صاحب نے تو ڈائریوں کا ڈھیر لگایا ہوا ہے۔ ایسے ہی میں بھی چیدہ چیدہ واقعات اور وارداتوں کو اپنی ڈائریوں میں قلمبند کرتا تھا۔

آج ہم اپنی کارگزاریوں کو پڑھتے ہیں یا کبھی یاد کرتے ہیں تو ہمارے اندر فخر پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے فرائض پوری ایمانداری اور وفاداری سے پورے کیئے تھے اور کوئی ایسی نازیبا حرکت نہیں کی جس کو یاد کرکے شرمندگی ہو۔ مجھ کو یہ بھی احساس ہے کہ میں یہ ڈائری اپنی نسلوں کے واسطے ورثے کے طور پر چھوڑ جاؤں گا تو وہ بھی میری اس کارگزاری پر فخر کریں گے۔ اب آپ خود سوچیں کہ آج کے وقت کے تھانیدار اگر اپنی ڈائریاں لکھیں تو اس میں کیا لکھیں گے؟ ...... وہ ایسا تو کبھی بھی نہیں لکھیں گے کہ ہم نے اتنے قتل اور اتنے ڈاکے ہضم کرکے اتنی دولت کمائی تھی اور ہمارا طریقہ کار مُک مُکا پر چلتا تھا۔ کوئی تھانیدار اور کوئی اس سے اونچا پولیس آفیسر ایسی تحریر نہیں لکھے گا کہ فلاں فلاں ڈکیت گینگ میرے

زیرِ سایہ پرورش پاتے تھے۔

یہ رونا صرف میرا نہیں، یہ تو سارے پاکستان کا رونا ہے۔ آیئے، مجھ کو جو واردات یاد آئی ہے، وہ مجھ سے سنیں۔ اس واردات والے میری ڈائری کے صفحے میرے سامنے کھلے تو ان پر بہت ہی مختصر فقرے لکھے ہوئے نظر آئے جس طرح کہ اشارے دیئے جاتے ہیں۔ واردات ایسی تڑپا دینے والی تھی کہ مجھ کو وہ وقت اس طرح یاد آ گیا جس طرح میں تھانے میں موجود ہوں اور تفتیش کر رہا ہوں۔ اکثر یادیں ذہن کے قبرستان میں دفن ہو جاتی ہیں لیکن بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ جب بھی یاد آتے ہیں تو اس طرح لگتا ہے جیسے یہ کل یا پرسوں کا واقعہ ہو...... یہ وقوعہ اس طرح ہُوا کہ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ مجھ کو بیوی نے جگایا کہ تھانے سے کانسٹیبل آیا ہے۔ کہتا ہے کہ ڈکیتی کی اور قتل کی واردات آئی ہے۔

اگر واردات معمولی سی ہوتی تو مجھ کو کوئی نہ جگاتا۔ تھانے میں رات کی ڈیوٹی والے ساری کارروائی کر لیتے تھے لیکن ڈکیتی اور قتل دو ایسی وارداتیں تھیں جو انگریز کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا کرتا تھا اور ہمارے واسطے حکم تھا کہ جونہی ان دونوں وارداتوں کی رپورٹ آئے، اُسی وقت جائے وقوعہ پر پہنچو اور وہاں سے اُس وقت واپس آؤ جب تمہارے پاس ملزم آ جائیں یا ملزموں کا قابلِ اعتماد سراغ آ جائے۔ اس کے بعد ڈی ایس پی تھانیداروں کی جان کو آئے رہتے تھے۔ تفتیش میں ذرا سی کوتاہی بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔

میں تیار ہو کر فوراً تھانے پہنچا۔ وہ ایک بڑا قصبہ تھا جس میں ایک ہی تھانہ تھا اور اس تھانے کے تحت کچھ دیہاتی علاقہ آتا تھا۔ چونکہ یہ علاقہ بعد میں پاکستان میں آ گیا ہے اس واسطے میں اس قصبے کا نام ظاہر نہیں کروں گا اور اس تحریر میں جن اشخاص اور مستورات کے نام آئیں گے وہ میں تبدیل کر کے لکھ رہا ہوں۔

وقوعہ یہ تھا کہ ایک بوڑھا آدمی قتل ہو گیا تھا جس کی عمر ساٹھ سال یا اس سے دو تین سال اوپر بتائی گئی۔ رپٹ لکھوانے جو اشخاص تھانے آئے تھے، ان میں ایک مقتول کا بڑا بیٹا تھا جس کا مکان مقتول کے مکان کے پچھواڑے تھا۔ دوسرا شخص مقتول کا چھوٹا بھائی تھا جس کی عمر پچاس سال سے کچھ اوپر تھی۔ وہ اسی گلی کے ایک مکان میں رہتا تھا۔ ان کے ساتھ نمبردار تھا۔ مقتول اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہتا تھا اور بیٹا دو تین دنوں کے واسطے اپنے کاروباری دورے پر کہیں گیا ہُوا تھا۔ گھر میں اس بیٹے کی بیوی تھی۔ بیوی ابھی تئیس چوبیس سال کی لڑکی تھی۔ اس کے خاوند کی عمر اس لڑکی سے ڈیڑھ دو سال زیادہ ہو گی۔

مقتول کی بیوی کبھی کی مر چکی تھی۔ یہ میں اس واسطے بتا رہا ہوں کہ گھر میں صرف یہ بوڑھا مقتول تھا اور اس کی یہ بہو۔

مجھ کو ان لوگوں نے بتایا کہ رات بارہ بجے کے کچھ پہلے یا کچھ بعد ان کو اس لڑکی کی چیخیں اور شور شرابہ سنائی دیا۔ لڑکی چھت پر چلی گئی تھی اور اوپر سے اُس نے مقتول کے بڑے بیٹے کو پکارا اور کہا کہ جلدی آؤ ابا قتل ہو گئے ہیں۔ اس لڑکی کا نام شاہینہ تھا۔ اس کی چیخ و پکار اتنی بلند تھی کہ محلے کے لوگ جاگ اٹھے اور مقتول کا چھوٹا بھائی بھی آ گیا۔

ان لوگوں نے پہلے تو شاہینہ کو شک سے دیکھا۔ شاہینہ کے کپڑے یعنی قمیض دو تین جگہوں سے پھٹی ہوئی تھی اور قمیض اور شلوار پر بھی بہت سا خون لگا ہوا تھا۔ گھر کے اندر منظر یہ تھا کہ ایک برآمدے میں چارپائی کے قریب فرش پر مقتول کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ کپڑے خون سے لال سرخ ہو گئے تھے اور فرش پر خون بہہ رہا تھا۔

شاہینہ نے ان لوگوں کو بتایا کہ وہ گہری نیند سوئی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ دو آدمی تھے۔ ایک آدمی نے اس پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی۔ شاہینہ اٹھ بیٹھی اور ان دونوں سے اپنے آپ کو بچانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے سسر کو آواز دی۔ یہ دونوں اس کو چارپائی پر لٹانے اور کپڑے اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سسر یعنی مقتول جاگ اٹھا اور دوڑتا آیا۔ وہ صحن کے دوسری طرف والے برآمدے میں سویا ہُوا تھا۔ وہ جب آیا تو ان دونوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ شاہینہ نے بتی جلا دی۔ حملہ آوروں نے مقتول کو چاقو مارے وہ گر پڑا۔ شاہینہ نے زیادہ شور مچایا تو وہ دونوں بھاگ گئے۔

سسر بہو پر قربان ہو گیا

میں وہاں گیا تو گلی میں لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ کسی عقلمند آدمی نے یہ عقلمندی کی کہ لوگوں میں سے کسی کو اندر نہ جانے دیا۔ میں اندر گیا۔ یہ ایک کشادہ حویلی تھی۔ صحن کے ایک طرف ڈیوڑھی تھی ایک طرف برآمدہ تھا سامنے اور بائیں طرف بھی برآمدہ تھا ان برآمدوں کے پیچھے کمرے تھے۔ ان برآمدوں کے اور صحن کے بلب جل رہے تھے۔ مقتول کی لاش برآمدے کے قریب چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ چارپائی کے پاس ایک جوان لڑکی کھڑی تھی جس کی قمیض دو تین جگہوں سے پھٹی ہوئی تھی اور خون سے رنگی ہوئی بھی تھی۔ وہ

شاہینہ تھی۔ وہ کھڑی رو رہی تھی اور اس کے چہرے پر دہشت صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ خاص طور پر خوبصورت لڑکی نہیں تھی لیکن وہ بری صورت والی بھی نہیں تھی۔ چہرے پر نوجوانی کے تاثرات اچھے لگتے تھے اور قد کاٹھ بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔

میں نے چارپائی کو دیکھا۔ اس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ بستر کی چادر جس طرح اکٹھی ہو گئی تھی اور اس کی جو سلوٹیں تھیں، ان سے پتہ لگتا تھا کہ اُس پر دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ بستر پر ٹوٹی ہوئی کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے لڑکی کے دونوں بازو دیکھے یہ چوڑیاں اسی کی تھیں جو دھینگا مشتی میں ٹوٹی تھیں۔ اس کے ایک بازو کی کلائی سے خون نکل رہا تھا۔ کوئی ٹوٹی ہوئی چوڑی اس کلائی میں چبھ گئی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس لڑکی کا ہی بیان لینا تھا لیکن اطمینان سے بیٹھ کر...... سب سے پہلے تو دوسری چیزیں دیکھنی تھیں۔

لاش کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کو سینے میں اور پیٹ میں چاقو لگے تھے۔ لاش کو اچھی طرح دیکھ کر ہیڈ کانسٹیبل کو جو میرے ساتھ جائے وقوعہ پر گیا تھا، کہا کہ وہ لاش پوسٹ مارٹم کے واسطے لے جائے۔ یہ بندوبست اس نے کرنا تھا۔

''کیا تم بتا سکتی ہو''—— میں نے شاہینہ سے دریافت کیا—— ''کہ یہ دونوں آدمی کدھر سے مکان میں داخل ہوئے تھے؟''

''نہیں''—— شاہینہ نے لرزتی کانپتی آواز میں جواب دیا—— ''میں نے اس وقت دیکھا جب انہوں نے مجھ کو پکڑ لیا تھا۔ صرف یہ بتا سکتی ہوں کہ وہ ڈیوڑھی کے راستے باہر نکلے تھے''۔

وہ ٹھیک کہتی تھی۔ اگر وہ ان کو اندر آتا دیکھ لیتی تو اُسی وقت شور مچا دیتی۔ یہ میں نے دیکھنا تھا کہ مکان کے اندر آنے کا راستہ کون سا ہو سکتا ہے۔

''ایک بات بتاؤ''—— میں نے شاہینہ سے پوچھا—— ''کیا باہر والا دروازہ اندر سے بند تھا اس کی زنجیر چڑھی ہوئی تھی؟''

''جی ہاں''—— اُس نے جواب دیا—— ''یہ مجھ کو یقین ہے کہ دروازہ اندر سے پکا بند تھا۔ مقتول (سسر) رات کو دروازہ بند کیا کرتے تھے اور پھر سونے سے پہلے میں بھی دیکھ لیا کرتی تھی کہ دروازہ اندر سے پکا بند ہے''۔

میں نے صحن میں کھڑے ہو کر مکان کو اچھی طرح دیکھا۔ گلی کی طرف ڈیوڑھی تھی۔

کوئی ایسی دیوار نہیں تھی جس پر کوئی باہر سے چڑھ کر اندر آ سکتا۔ دائیں بائیں پچھواڑے میں بھی مکان تھے۔ سیڑھیوں کا دروازہ تھا ہی نہیں۔ میں اوپر چلا گیا۔ میرے ہاتھ میں لمبی ٹارچ تھی۔ اوپر جا کر ہر طرف دیکھا پھر میں اُس چھت پر گیا جو گلی کی طرف تھی۔ وہاں دیوار کے بالکل قریب بجلی کا کھمبا تھا۔ صرف یہ ایک راستہ تھا یعنی کھمبے پر چڑھ کر آدمی بڑی آسانی سے چھت پر آ سکتا تھا۔

میں نے منڈیر پر ٹارچ جلا کر دیکھا۔ مجھ کو توقع یہ تھی کہ منڈیر پر گرد ہو گی اس پر قدموں کے نشان ہوں گے لیکن بدقسمتی سے اُسی روز بڑی تیز بارش برسی تھی جس نے منڈیر کو دھو دیا تھا۔ وہاں سے میں اس مکان کے ساتھ ملے ہوئے مکانوں کی چھتوں پر چلا گیا اور گھوم پھر کر دیکھا، شاید کسی مکان کی طرف سے اوپر آنے کا راستہ نظر آ جائے۔ یہ تو میں نے دوران تفتیش معلوم کرنا ہی تھا کہ وقوعہ والے مکان کے ساتھ جن مکانوں کی چھتیں ملی ہوئی ہیں، ان میں کون لوگ رہتے ہیں اور وہ کیسے ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ ان مکانوں میں رہنے والے کسی خاندان یا کسی شخص کی دشمنی مقتول کے ساتھ یا مقتول کے خاندان کے ساتھ ہو۔

مجھ کو کھمبے والا راستہ ہی نظر آتا تھا...... ایک بات بتا دوں یہ اس واسطے کہ آج کل لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی کے گھر میں داخل ہو کر گھر کی کسی خاتون پر مجرمانہ حملہ کرنا اور ایک دو آدمیوں کو قتل کر کے نکل آنا ایک عام اور بڑا آسان جرم ہے۔ آپ اخباروں میں پڑھتے رہتے ہوں گے کہ یہ سنگین اور گھناؤنی وارداتیں ہر روز ہوتی ہیں اور بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ شرمناک بات یہ ہے کہ کوئی بھی مجرم پکڑا نہیں جاتا۔ میں آج کے دور کی نہیں بلکہ خاصے پہلے دور کی بات کر رہا ہوں جب حکومت انگریزوں کی تھی جس میں قانون کو مذہبی کتاب کی طرح مقدس اور متبرک سمجھا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں ایسی وارداتیں بہت ہی کم ہُوا کرتی تھیں۔ اگر کہیں ایسی واردات ہو جاتی تو اس علاقے میں یوں لگتا تھا کہ جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ ایسی واردات عام جرائم پیشہ لوگ نہیں کرتے تھے۔ کوئی بہت ہی بڑے جرائم پیشہ بھی ایسی واردات کر گزرتے تھے یا ایسی واردات انتقامی طور پر ہوتی تھی۔ یہ واردات بھی مجھ کو انتقامی نظر آ رہی تھی۔ اگر مقتول عین وقت پر اپنی بہو کو بچانے کے واسطے پہنچ گیا تھا تو یہ دونوں ملزم اس بوڑھے آدمی کو ویسے ہی مار پیٹ کر بے ہوش کر دیتے یا اس کو پرے پھینک کر بھاگ جاتے لیکن انہوں نے اس کو چاقو کے متعدد وار کر کے قتل کیا۔ اس سے مجھ کو شک

ہوتا تھا کہ یہ واردات انتقامی طور پر کی گئی ہے۔ بہر حال یہی تو میں نے تفتیش کرنی تھی کہ اس واردات کی بیک گراؤنڈ کیا ہے۔

میں چھت سے نیچے آیا۔ سب سے پہلے تو میں نے شاہینہ کا بیان لینا تھا اور اسی محلے میں کہیں بیٹھنا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے ڈیوڑھی کا باہر والا دروازہ دیکھا اور اس کی زنجیر کو اچھی طرح چیک کیا، چڑھایا اور دیکھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ زنجیر چڑھی ہوئی ہو تو باہر سے کسی طریقے سے نہیں کھولی جا سکتی ...... میں نے نمبردار کو کہا کہ کہیں میرے بیٹھنے کا بندوبست کریں۔ میں وقوعہ والے گھر کی بیٹھک میں ہی ڈیرے ڈال سکتا تھا لیکن مجھ کو پتہ تھا کہ لاش جو پوسٹ مارٹم کے واسطے چلی گئی ہے، واپس آئے گی تو اس گھر میں ماتم شروع ہو جائے گا۔ ایسے ماحول میں تفتیش ٹھیک طرح نہیں کی جا سکتی۔ تھوڑی ہی دیر بعد نمبردار آیا اور بتایا کہ اس نے اپنی بیٹھک میں میرے واسطے بیٹھنے کا بندوبست کر دیا ہے۔ اس کا گھر اسی گلی میں کچھ آگے جا کر تھا۔ میں شاہینہ کو ساتھ لے کر وہاں چلا گیا اور اس کو بیٹھک میں اپنے سامنے بٹھا لیا۔

وہ بہت ہی زیادہ دہشت کی ماری ہوئی لگتی تھی اور وہ رو بھی رہی تھی۔ مجھ کو اس طرح دیکھتی تھی جیسے میں اس کو کھا جاؤں گا یا اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کروں گا۔ میں نے اس کو تسلیاں دیں اور کہا اپنے آپ کو میری پناہ میں سمجھے اور دل میں مجھ کو اپنے بڑے بھائی کا درجہ دے دے۔ اس طرح تسلی اور دلاسے والی بہت سی باتیں کیں تو اس کے چہرے پر جو کھچاؤ تھا وہ صاف ہو گیا۔ میں نے اس کو یہ بھی بتایا کہ وہ جو بھی بیان دے گی، وہ باہر کسی کو معلوم نہیں ہو گا اس واسطے وہ کوئی بات چھپا کر نہ رکھے۔

پہلے تو اس نے وہی باتیں بتائیں جو مجھ تک پہلے پہنچ چکی تھیں، مثلاً یہ کہ اس کا خاوند کاروبار کے سلسلے میں کچھ دنوں کے واسطے باہر گیا ہُوا ہے اور پھر یہ کہ سامنے والے برآمدے میں اس کا سسر سویا ہُوا تھا اور وہ اس برآمدے میں سوئی ہوئی تھی۔ اس سے آگے اس نے جو بیان دیا وہ میں اپنی زبان میں سناؤں گا، یہ اس واسطے کہ اُس کی زبان سے سنایا تو بات لمبی ہو جائے گی۔

اس نے بیان دیا کہ وہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل خوف سے ڈوب گیا کہ ایک آدمی اس کی ٹانگوں پر بیٹھ گیا تھا اور اس کو ننگا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چاندنی رات تھی۔ چاند کی روشنی برآمدے میں نہیں آتی تھی لیکن صحن میں

چاندنی پڑنے سے آدمی صاف پہچانا جاتا تھا۔ شاہینہ نے دیکھا کہ اس آدمی نے جو چارپائی پر چڑھ آیا تھا، اپنی ناک کے اوپر تک رومال باندھا ہُوا تھا۔ شاہینہ پہلے تو ڈری لیکن اپنی عزت کا خیال آیا تو وہ یک لخت دلیر ہو گئی اور اٹھ بیٹھی لیکن جو آدمی اس کی ٹانگوں پر بیٹھا ہوا تھا، اس نے اس کو سینے پر دھکا مار کر پھر گرا دیا۔

شاہینہ پھر اٹھی اور اس کے ساتھ ہی اپنے سسر کو اس طرح پکارا —— ''بابا ...... بابا جان!'' —— اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو اس آدمی سے چھڑانے لگی۔ دوسرے آدمی نے شاہینہ کے منہ پر ہاتھ رکھا لیکن شاہینہ نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا تو اس آدمی کا ہاتھ پھسل کر آگے چلا گیا اور اس کا بازو شاہینہ کے منہ تک آ گیا۔ شاہینہ نے اس کا بازو پکڑ کر اپنے دانت بازو میں اتار دیئے۔ بازو کی یہ جگہ کہنی کے قریب تھی جہاں بازو کا پٹھہ ہوتا ہے۔

شاہینہ نے دانت اتنی زور سے بازو میں گاڑے کہ اس آدمی کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس آدمی نے شاہینہ کی قمیض دو تین جگہ سے پکڑی جس سے قمیض پھٹ گئی۔ شاہینہ کو معلوم نہیں تھا یہ کس طرح ہُوا کہ جو آدمی اس کی ٹانگوں پر بیٹھ کر اس کو ننگا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ ٹانگوں سے ذرا ہٹ گیا۔

شاہینہ کی ایک ٹانگ آزاد ہوئی تو اس نے بڑی تیزی سے یہ ٹانگ اکٹھی کر کے پاؤں اس آدمی کے پیٹ میں اتنی زور سے مارا کہ وہ آدمی چارپائی سے نیچے فرش پر جا پڑا۔ یہ قدرت کا نظام ہے کہ خطرے میں انسان کی ڈھکی چھپی ہوئی طاقتیں بھی بیدار ہو جایا کرتی ہیں۔ اس دھینگا مشتی میں شاہینہ کی کئی چوڑیاں ٹوٹیں اور اس کی قمیض بھی تین چار جگہوں سے پھٹی اور شلوار بھی ایک جگہ سے پھٹ گئی، یہ اس طرح کہ دوسرا آدمی اس کی شلوار کھینچ رہا تھا۔

اتنے میں شاہینہ کو اپنے سسر کی آواز سنائی دی —— ''کون ہیں یہ؟'' —— شاہینہ نے اور زیادہ شور مچایا اور کہا کہ انہوں نے مجھ پر سوتے میں حملہ کیا ہے۔ سسر نے ایک آدمی کو پیچھے سے پکڑا اور ایک طرف گرا دیا۔ اس موقعہ پر شاہینہ آزاد ہو گئی اور اچھل کر چارپائی سے اتری۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ برآمدے کا سوئچ آن کر کے بتی جلا دی۔ تب اس کو نظر آیا کہ دونوں آدمیوں کے چہروں پر رومال بندھے ہوئے تھے۔ اُن کے سروں پر سفید پگڑیاں بُنی ہوئی تھیں لیکن باقی لباس سے وہ دیہاتی نہیں لگتے تھے۔

ایک آدمی نے چاقو نکال کر مقتول کو مارنا شروع کر دیا۔ شاہینہ اپنے سسر کی مدد کے واسطے پہنچی لیکن اس کو یہ خیال نہ آیا کہ کوئی چیز مثلاً ڈنڈا، چاقو، چھری وغیرہ ہاتھ میں لے لیتی، اُس نے یہ کیا کہ ایک آدمی اس کی طرف ہُوا تو شاہینہ نے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان نیچے سے بڑی زور سے کک ماری۔ وہ آدمی پہلے تو سیدھا ہُوا پھر دوہرا ہو گیا۔ شاہینہ نے دوسرے آدمی کے پہلو میں ویسی ہی کک ماری۔ اس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑا۔ شاہینہ چاقو کی طرف لپکی تو ان دونوں میں سے ایک نے اس کے پہلو سے ایسا زوردار دھکا دیا کہ وہ اپنے سسر کے اوپر گری جو معلوم نہیں کہ چاقو کے کتنے ہی زخم کھا کر گر چکا تھا۔ سسر کا خون اس کے کپڑوں کو لگا۔

شاہینہ کو امید یہ تھی کہ اب اس کے جسم میں بھی چاقو اتریں گے۔ وہ بہت پھرتی سے اٹھی لیکن اس نے دیکھا کہ دونوں آدمی بھاگ پڑے۔ وہ چاقو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ شاہینہ ان کے پیچھے دوڑنے لگی لیکن اپنے سسر کے بہتے ہوئے خون پر پاؤں پڑا تو وہ پھسل کر گر پڑی۔ وہ پھر اٹھی اور ڈیوڑھی کے باہر والے دروازے تک گئی مگر دونوں مجرم جا چکے تھے۔ واپس آ کر اُس نے صحن میں سے چیخنا چلانا شروع کیا اور چھت پر چیختی چلاتی چلی گئی۔ اس کی پکار پر لوگ آ گئے۔ اس وقت تک اس کا سسر مر چکا تھا۔

گھٹیا، اوچھے اور ذلیل

یہ تو اُس لڑکی کا بیان تھا جس کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ اس میں کتنا سچ اور کتنا جھوٹ ہے یا کہ یہ بالکل سچا بیان ہے یا سارے کا سارا جھوٹ کا پلندہ ہے...... ایسے کیس میرے سامنے آ چکے تھے کہ کوئی عورت اپنے آشنا کے ساتھ پکڑی گئی تو اس نے شور مچا دیا کہ یہ آ[دمی مجھ] پر زبردستی کر رہا تھا۔ اس واردات میں بھی جس کی میں تفتیش کر رہا تھا، یہی ہو سکتا تھا کہ آدمی دو نہیں بلکہ ایک تھا اور وہ اس واسطے لڑکی کے پاس آیا تھا کہ اس کا خاوند گھر سے غیر حاضر ہے اور بوڑھا سسر اُس سے دور برآمدے میں سویا ہُوا ہو گا لیکن بوڑھے کی آنکھ عین وقت پر کھل گئی اور وہ پہنچ گیا۔ اس نے اس شخص کو پہچان لیا ہو گا جس کا علاج اس شخص نے یہ کیا کہ اس بوڑھے سسر کو قتل کر دیا۔ اسی نے شاہینہ کو بتایا ہو گا کہ یہ بیان دے۔

''ڈرنا نہیں شاہینہ! گھبرانے کی کوئی بات نہیں''—— میں نے کہا—— ''میں

کے رہنے والے تھے۔ ان کی شرافت میرے تھانے والے قصبے تک مشہور تھی۔

''میرے اس شک پر غور کرو چوہدری!''—— میں نے نمبردار سے کہا—— ''یہ دو آدمی نہیں تھے بلکہ ایک تھا اور وہ اس لڑکی کی مرضی سے گھر کے اندر آیا تھا''۔

''کم از کم میں تو نہیں مانوں گا''—— نمبردار نے کہا—— ''اندر کے بھید تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن جہاں تک میں اس لڑکی کو جانتا ہوں، اس کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں مانوں گا جیسی آپ نے شک میں کہی ہے...... یہ بھی صحیح ہے کہ لڑکی برقعے کے بغیر باہر نکلتی ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ وہ بہت ہی کم باہر نکلتی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ ہر روز ہی گلی میں نظر آتی ہو''۔

''پھر یہ بتاؤ چوہدری!''—— میں نے کہا—— ''مجھ کو یہ واردات انتقامی لگتی ہے۔ تم اس گھر کے اندر کے حالات بھی جانتے ہو پھر تو تم باہر کی باتیں بھی جانتے ہو گے۔ مقتول گھٹیا درجے کا عورت باز تھا۔ شاہینہ کا خاوند جوئے باز اور بدکردار ہے۔ ایسے اشخاص کی دشمنی کسی نہ کسی کے ساتھ ضرور ہوتی ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو یا معلوم کر سکتے ہو کہ ان کی دشمنی کس کے ساتھ تھی؟''

''یہ میں معلوم کر کے بتا سکتا ہوں''—— نمبردار نے کہا—— ''شاہینہ کے خاوند کی دشمنی کسی نہ کسی کے ساتھ ضرور ہو گی یا اس نے اپنی عادت اور فطرت کے مطابق کسی کے ساتھ پنگا لیا ہو گا یا کاروبار میں کسی کی رقم ہضم کر گیا ہو گا''۔

یہ تو میں نے خود بھی معلوم کرنا ہی تھا۔ نمبردار کی رائے لینا میرے واسطے ضروری تھا۔ اُس نے مجھ کو بڑی پکی بنیاد دے دی تھی۔ وہ یہ تھی کہ مقتول کا پورے کا پورا خاندان گھٹیا اور پست ذہن والا تھا اور ان لوگوں کو کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ نمبردار کی رپورٹ پر میں نے یہ بھی ذہن میں رکھ لیا کہ شاہینہ شریف لڑکی ہے جس کے چال چلن پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کا خاندان پُروقار اور شریف تھا۔

نمبردار کے بعد میں نے اُس محلے کے دو معزز افراد کو باری باری بلایا اور ان سے بھی یہی باتیں پوچھیں جو نمبردار سے بھی پوچھی تھیں۔ یہ دونوں معززین میرے پاس تھانے میں آتے رہتے تھے اور مخبری اور چغل خوری ان کی ہابی تھی۔

میں بات کو لمبا نہیں کروں گا، ان دونوں سے جو مجھ کو حاصل ہُوا، میں وہ بتا دیتا ہوں۔ دونوں نے نمبردار کی طرح لڑکی کو اور لڑکی کے خاندان کو مکمل طور پر شریف اور نیک

چلن کہا اور مقتول اور اس کے خاندان کے واسطے وہی الفاظ استعمال کئے جو نمبردار نے کئے تھے، یعنی گھٹیا، اوچھے اور رذیل وغیرہ...... دونوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ انتقامی واردات ہے اور اس میں ایک بے گناہ لڑکی بدنام ہوگئی ہے۔ اس بے چاری کو اب تھانے کے چکر پڑیں گے پھر عدالتوں میں گھسیٹی جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ مقتول اگر مارا گیا ہے تو ٹھیک مارا گیا ہے۔ ان میں سے ایک نے یہ بھی کہا کہ ایک نہ ایک دن اس خاندان کے ساتھ کسی نے تنگ آ کر یہی سلوک کرنا تھا۔

دوسرے معزز آدمی نے شاہینہ کے خاوند حامد کی بابت کہا کہ جناب یہ شخص جواریا ہے، شرابی ہے، چرسی ہے اور رنڈی باز بھی ہے...... اس معزز آدمی نے اس قصبے سے پچیس چھبیس میل دور ایک شہر کا نام لے کر کہا کہ حامد وہاں رنڈی بازی کے واسطے جاتا ہے اور اپنے یہ کرتوت کسی سے چھپاتا نہیں بلکہ فخر کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

ان معززین سے مجھے یہ رائے بھی ملی کہ حامد نے کسی عورت پر دست درازی کی ہوگی اور اس عورت نے اپنے گھر جا کر بتایا ہوگا اور اس گھر کے آدمیوں نے انتقام لے لیا۔ وہ دراصل اپنی عورت کی بے عزتی کے بدلے میں حامد کی بیوی کو بے آبرو کرنے آئے تھے لیکن حامد کا باپ درمیان میں آ گیا اور مارا گیا۔

اس کے بعد میں نے مقتول کے چھوٹے بھائی کو بلایا جس کی عمر پچاس سال سے اوپر تھی۔ اس سے میں نے پوچھا کہ سوچ کر بتائے کہ مقتول کی یا مقتول کے بیٹے حامد کی کسی کے ساتھ دشمنی ہوگی۔ میں اس سے یہ سوال تھانے میں بھی پوچھ چکا تھا جب وہ رپورٹ لکھوانے آیا تھا۔ اُس وقت اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ کسی کے ساتھ دشمنی نہیں لیکن اب میں نے یہی سوال پوچھا تو اس نے کچھ اور ہی انداز سے جواب دیا۔

''توبہ کرو جی!''۔۔۔ اُس نے بڑے تکبر سے کہا۔۔۔ ''ہمارے ساتھ کسی نے دشمنی مول لے کر اپنا بیڑہ غرق کروانا ہے؟''

''ابھی تو تمہارے خاندان کا بیڑہ غرق ہو رہا ہے''۔۔۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔۔۔ ''تمہارا بڑا بھائی قتل ہوگیا ہے اور اس بھائی کی بہو بدنام ہو رہی ہے۔ اب دیکھ لینا کہ لوگ اس کی بابت کیا کیا باتیں مشہور کریں گے...... میں جو پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ۔ ڈینگیں مت مارو''۔

وہ دبک گیا اور اس نے اتنا ہی کہا کہ کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔

''اب ایک اور بات بتاؤ''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''شاہینہ کے چال چلن کی بابت اس کا کیا خیال ہے؟''

''بہت اچھا خیال ہے جناب!''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''شاہینہ کے چال چلن کی بابت آپ اس کے کسی دشمن سے بھی پوچھیں گے تو وہ اس کی تعریف کرے گا''۔

میں نے اس شخص کو بہت کریدا اور اپنا تفتیش کا تجربہ پوری طرح استعمال کیا لیکن اس سے مجھ کو کچھ بھی حاصل نہ ہُوا۔ اس کے بعد میں نے مقتول کے بڑے بیٹے کو بلایا۔ اس سے بھی اسی طرح تفتیش کی لیکن وہ بھی مجھ کو کوئی ایسی بات نہ بتا سکا جس سے مجھ کو تفتیش میں مدد ملتی۔

اس نے اپنے چھوٹے بھائی حامد کے چال چلن اور اخلاق کے بارے میں ایسی اچھی باتیں کیں جیسے حامد پکا مومن، زاہد اور پارسا ہو۔

میں نے تفتیش میں ان لوگوں پر ہی بھروسہ نہیں کرنا تھا۔ یہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ مقتول کا چھوٹا بھائی اور بڑا بیٹا کس ٹائپ کے آدمی ہیں۔ یہ مجھ کو جھوٹے اور مکار نظر آئے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اب تھانے چل کر تفتیش جاری رکھی جائے اور جن کی مجھ کو فوری طور پر ضرورت ہے ان کو ساتھ لے لیا جائے۔ تھانہ قصبے میں ہی تھا اور اس جگہ سے دور بھی نہیں تھا۔

رات گزر گئی تھی۔ نمبردار نے مجھ کو اور میرے عملے کو بڑا پُرتکلف ناشتہ کرایا تھا اور اب دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ میں نے ان افراد کو اکٹھا کیا جن کو تھانے لے جانا تھا۔

اتنے میں پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی اور اس کے پیچھے پیچھے مقتول کی لاش بھی آ گئی۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں چھ زخم لکھے گئے تھے۔ چار سینے میں اور دو معدے کے مقام پر تھے۔ یہ زخم تیز دھار آلے کے تھے جو چاقو بھی ہوسکتا تھا اور چھری بھی۔

میں اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں ایک عرض کرتا ہوں کہ اب بہت بوڑھا ہوگیا ہوں اس واسطے اچھی طرح لکھنے کی طاقت نہیں رہی۔ ہاتھ تھک جاتا ہے اور لکھنا چھوڑ دیتا ہوں۔ اپنی یہ کمزوری دیکھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات کو نظر انداز کر کے چیدہ چیدہ اور اہم واقعات لکھوں گا۔ بہرحال آپ کو کہانی مکمل ملے گی اور کہیں بھی آپ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ یہاں خلاء آ گیا ہے اور معلوم نہیں یہاں کیا ہُوا تھا۔

داشتہ اور ہیجڑا خاوند

میں نے تھانے جا کر جو کارروائی کی، وہ اس طرح تھی کہ اپنے اے ایس آئی کو یہ کام سونپا کہ وہ اس واردات کے پیشِ نظر شہر کے جرائم پیشہ افراد اور مشتبہوں کو اکٹھا کرے اور اُن سے تفتیش بھی کرے۔ اے ایس آئی جانتا تھا کہ عادی مجرموں اور مشتبہوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے اور ان سے تفتیش کس طرح سے کی جاتی ہے۔ میں نے اس کو بتایا کہ واردات کے ایک ملزم کے دائیں بازو پر دانتوں کے گہرے نشان ہوں گے۔ اس کو بازو کی وہ جگہ بھی بتائی جہاں ان نشانات کا ہونا ممکن تھا۔ یہ جگہ کہنی کے قریب تھی۔

اپنے ایک سینئر اور تجربہ کار ہیڈ کانسٹیبل کو یہ کام دیا کہ وہ مخبر اکٹھے کرے یا ان کے پاس جائے اور ان کو کہے کہ بہت جلدی مجھ تک اپنی رپورٹیں پہنچائیں۔ ہیڈ کانسٹیبل کو میں نے یہ بھی کہا کہ آڑھت کی منڈی سے یہ معلوم کرنا ہے کہ حامد کا کسی سے لین دین پر جھگڑا ہو گیا یا اس نے کسی کی رقم ہضم کر لی ہو گی۔

یہ پولیس کی ایک خفیہ مشینری ہوتی ہے یا اس کو آپ ایک زمین دوز نظام کہہ لیں جو کسی بھی واردات کے فوراً بعد اپنے آپ حرکت میں آ جاتا ہے اور تھانیدار کو وہ باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں جو عام لوگوں کو معلوم نہیں ہو سکتیں۔ میں اس نظام کی بابت کوئی زیادہ بات نہیں کروں گا، صرف یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض مخبر اپنی کارگزاری سے تھانیداروں کو بھی حیران کر دیا کرتے ہیں۔

یہ بات تو میں اپنی کہانیوں میں اور جناب احمد یار خان صاحب بھی لکھ چکے ہیں کہ ہر تھانے کے علاقے میں خواہ وہ علاقہ شہری ہو یا دیہاتی، ایسے باحیثیت اور معزز اشخاص موجود ہوتے ہیں جو تھانیداروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے واسطے چوری چوری مخبری کا کام کرتے ہیں۔

میں تھانے میں تفتیش اور دیگر کارروائیوں میں مصروف ہو گیا لیکن میں آدھی رات کا جاگا ہوا تھا اور مسلسل محنت اور دماغ سوزی کر رہا تھا۔ مجھ کو تھوڑے سے وقت کے واسطے آرام کی سخت ضرورت تھی۔ میں اپنے دماغ کو تر و تازہ کرنا چاہتا تھا۔ گھر جانا مناسب نہیں تھا۔ اس واسطے کہ واردات سنگین تھی اور خطرہ تھا کہ کسی بھی وقت انگریز ڈی ایس پی آن دھمکے گا اور پوچھے گا کہ اب تک میں نے کیا کیا ہے اور کوئی سراغ حاصل کیا ہے یا نہیں۔ میں کانسٹیبلوں کی

بارک میں چلا گیا اور ایک کانسٹیبل کی چارپائی پر لیٹا اور لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔

میں دو گھنٹوں سے کچھ زیادہ وقت سویا۔ آنکھ کھلی تو دماغ میں تازگی آ گئی تھی۔ میں فوراً اٹھا اور اپنے دفتر والے کمرے میں پہنچا۔ دو ویسے ہی معزز حضرات آئے بیٹھے تھے جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ میں نے دونوں کو اکٹھے ہی بٹھا لیا اور انہوں نے اس واردات اور مقتول کے خاندان کی بابت باتیں شروع کر دیں۔ میں ان سے سوال بھی پوچھتا رہا اور وہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی بتاتے رہے۔

میں مناسب نہیں سمجھتا کہ ہر فرد و بشر نے مجھ کو جو جو باتیں بتائیں وہ الگ الگ لکھوں، اس سے کہانی لمبی ہی ہوتی جائے گی، میں دراصل آپ کو وہ واقعہ سنانا چاہتا ہوں جو آپ کو چونکا دے گا۔ ان دو معززین نے میرا خاصا وقت لے لیا اور ان کی باتیں تو ویسی ہی تھیں جو پہلے ہی میں سن چکا تھا لیکن دو تین باتیں میرے واسطے نئی تھیں۔

اس کے بعد اور مخبر آنے لگے اور کچھ باتیں مجھ کو یہاں کے پرانے کانسٹیبلوں نے بھی بتائیں اور ایسی ہی باتیں اور رپورٹیں سنتے دن گزر گیا۔

میں نے پہلے ذکر نہیں کیا، اب بتاتا ہوں کہ میں نے تکیئے کے دو ملنگوں کو بھی بلایا تھا جو تکیئے پر ہی رہتے تھے اور وہاں جوا کھلواتے تھے۔ وہاں پیشہ ور جواری اور بدمعاش اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ یہ ملنگ ان کی ذاتی زندگی کی باتوں سے پوری طرح واقف ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ آج بھی چلتا ہے۔ ان دونوں ملنگوں سے مجھ کو حامد کے بارے میں ایک دو بڑی کارآمد باتیں معلوم ہوئی تھیں۔

سورج غروب ہونے والا تھا جب مجھ کو بتایا گیا کہ مقتول کا بیٹا حامد جو شاہینہ کا خاوند تھا، آیا ہے۔ یہ میں بتا چکا ہوں کہ وہ اپنے کاروبار کی بابت باہر گیا ہوا تھا۔ اس کو باپ کے قتل کی اطلاع مل گئی اور وہ گھر آ گیا۔ گھر سے ہو کر وہ تھانے میں آیا۔ میں نے اس کو اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا۔ رسمی طور پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا پھر اس سے پوچھا کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہے یا نہیں۔ اس نے صاف لفظوں میں کہا کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں۔

''کیا ان دو آدمیوں کا کوئی سراغ ملا ہے یا نہیں؟'' ـــــ حامد نے مغموم آواز میں پوچھا اور کہا ـــــ ''یہ تو بڑے ہی خطرے والی بات ہے جناب! یہ آدمی اگر پکڑے نہ گئے تو پھر بھی ایسا ہی حملہ کر سکتے ہیں''۔

"جب تک تم اپنے دل میں چھپی ہوئی باتیں باہر نہیں نکالو گے، ان آدمیوں کا سراغ نہیں ملے گا"—— میں نے کہا—— "یہ واردات دشمنی والی ہی لگتی ہے۔ کسی نے تم سے انتقام لیا ہے"۔

"میری کسی کے بھی ساتھ اتنی سخت دشمنی نہیں"—— حامد نے کہا—— "یہ تو خونی دشمنی ہے بلکہ خونی سے بھی زیادہ، انہوں نے تو میری بیوی پر حملہ کیا تھا"۔

"پھر ایک بات بتاؤ"—— میں نے پوچھا—— "اپنی بیوی کے چال چلن پر تم کو پورا اعتبار ہے؟"

"ہاں جناب!"—— اس نے کہا—— "مجھ کو اپنی بیوی کے چال چلن پر ذرا سا بھی شبہ نہیں...... لیکن جو عقل اور تجربہ آپ کا ہے وہ میرا تو نہیں ہو سکتا، کیا کوئی ایسی بات سامنے آئی ہے جس سے پتہ لگے کہ میری بیوی کا چال چلن مشکوک ہے؟"

"میں شک شبہے کی بات کر رہا ہوں"—— میں نے کہا—— "تمہاری بیوی کی کسی کے ساتھ درپردہ دوستی ہوگی۔ اس نے اس کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ دوستی لگا لی ہوگی یا یہ ہو سکتا ہے کہ کسی نے اس کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی اور تمہاری بیوی نے اس کی بے عزتی کر کے اسے دھتکار دیا، پھر یہ شخص اپنے کسی ساتھی کو لے آیا اور تمہاری بیوی پر مجرمانہ حملہ کیا"۔

میں یہ باتیں ویسے ہی کر رہا تھا، میرے دل میں کوئی اور بات تھی۔ ایک ملنگ اور دو تین مخبروں نے میرے کانوں میں بڑی کارآمد بات ڈال دی تھی۔ میں نے جب اس کی بیوی شاہینہ پر یہ شک ظاہر کیا تو حامد نے پُرزور طریقے سے کہا یہ بالکل غلط اور بے بنیاد شک ہے۔

"میری بیوی میں اتنی جرأت ہے ہی نہیں"—— اس نے کہا—— "وہ مجھ کو جانتی ہے۔ اگر وہ ایسی حرکت کرتی تو میں اس کو زندہ نہ چھوڑتا"۔

"ہاں حامد بھائی!"—— میں نے کہا—— "تم ذرا ذرا سی بات پر اس کو مار پیٹ لیتے ہو۔ وہ کوئی شکایت زبان پر لائے تو تم اس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہو۔ اس کو تم سے ڈرنا ہی چاہئے...... اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہاری بیوی ہر لحاظ سے ٹھیک ہے تو یہ کوئی تمہارے دشمن ہیں جنہوں نے تم پر وار کیا ہے"۔

"میرا کوئی دشمن نہیں"—— اس نے کہا—— "میں بڑے اچھے اخلاق کا آدمی

ہوں"۔

"اپنے والد صاحب کے اخلاق کی بابت تمہارا کیا خیال ہے؟"—— میں نے پوچھا۔

"وہ تو جی آپ کسی سے بھی پوچھیں، ہر کوئی ان کو قابل عزت اور قابل احترام کہے گا"—— حامد نے کہا—— "وہ تو بڑے نیک بزرگ تھے"۔

"ہاں حامد!"—— میں نے کہا—— "وہ اپنی جمعدارنی، نوکرانی اور ان بھکارنوں کی نگاہوں میں بھی قابلِ احترام تھے جن کے ساتھ وہ ہوس کاری کے واسطے جھک مارتے تھے...... تم اپنے آپ کو بھی بڑے اچھے اخلاق کا آدمی کہہ رہے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ پولیس کا مخبری کا نظام تمہارے گھر کے اندر سے بھی راز لے آتا ہے اور میرے مخبر قبروں کے نیچے سے راز لے آیا کرتے ہیں...... اب میری بات کان کھول کر سنو۔ تم نے جھوٹ بولا تو ہڈیاں توڑ دوں گا...... کیا رحیم نام کے ایک شخص کی بیوی تاجی کے ساتھ تمہارے ناجائز تعلقات نہیں؟"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ آ گئی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ بولا۔

"اتنا بھی نہ گھبراؤ حامد!"—— میں نے اپنا غصہ قابو میں لا کر دوستانہ لہجے میں کہا—— "تمہارے جائز یا ناجائز تعلقات کسی کے بھی ساتھ ہوں، مجھ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ سچ بولو۔ تم نے جھوٹ بول بول کر اپنے باپ کو قتل کروا دیا ہے اور بیوی کو بے عزت کروایا ہے...... میں تم کو بتاتا ہوں کہ یہ ہُوا کیا ہے۔ تم نے رحیم کی بیوی کو اپنی داشتہ بنایا ہُوا ہے جس کا اس کو دیر سے علم ہُوا ہے۔ اس نے اپنی بے عزتی کا بدلہ اس طرح لیا ہے کہ دو آدمی بھیج کر تمہاری بیوی کو اغوا کروانے کی یا وہیں گھر میں ہی بے آبرو کرانے کی کوشش کی ہے......"

اچانک حامد ہنس پڑا اور اس نے دایاں ہاتھ اپنے منہ کے آگے اس طرح گھمایا جس طرح منہ پر بیٹھی ہوئی مکھی اڑائی جاتی ہے۔ مجھ کو بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح ہنس پڑے گا۔

"کس کی بات کرتے ہیں جناب!"—— اس نے میری بات کو کاٹ کر کہا—— "اگر رحیم میں اتنا دم ہوتا تو اس کی بیوی کسی غیر مرد کے ساتھ تعلق قائم نہ کرتی۔ آپ کو ٹھیک بتایا

گیا ہے کہ رحیم کی بیوی کے ساتھ میری دوستی ہے لیکن مجھ کو یہ بھی یقین ہے کہ رحیم کو اس کا علم نہیں...... اگر جناب کو رحیم پر یہ شک ہے تو اس کو تھانے ضرور طلب کریں۔ کسی انسان کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ تنگ آ کر کیا کر گزرے۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ رحیم اپنی بیوی کے ہاتھوں تنگ ہے لیکن بیوی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا نہ اس میں جرأت ہے کہ بیوی کے آگے بولے''۔

حامد اب ٹھیک ٹھاک باتیں کرنے پر آ گیا تھا۔ رحیم اور اس کی بیوی تاجی کی بابت بہت باتیں ہوئیں۔ میرا خیال یہ تھا کہ حامد رحیم کے بارے میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ رحیم اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ حامد کو میں نے اچھی طرح جانچا اور پرکھا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ بھی ڈینگیں مارنے والا آدمی ہے۔ میں نے سوچ سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ پہلے میں رحیم کی بیوی کو تھانے بلاؤں گا۔ حامد نے کچھ ایسی باتیں کی تھیں کہ مجھ کو تفتیش کے پیش نظر حامد کی بیوی زیادہ اہم معلوم ہوتی تھی۔

رات ہو گئی تھی۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اس وقت تاجی کو تھانے بلواؤں۔ حامد کو میں نے یہ کہہ کر گھر بھیج دیا کہ وہ کسی کے ساتھ بات نہ کرے کہ میری اور اس کی آپس میں کیا بات چیت ہوئی ہے...... میں نے اپنے اے ایس آئی سے رپورٹ لینی تھی۔ اس نے میری ہدایت کے مطابق کچھ عادی مجرم، ہسٹری شیٹر اور کچھ مشتبہے وغیرہ بلائے تھے اور ان کے ساتھ مصروف رہا تھا۔ میں نے اس کو کہا تھا کہ جس کے بازو پر دانت لگے ہوئے ہیں اور زخم تازہ ہے، وہ ہمارا ملزم ہے۔

اے ایس آئی کو بلا کر پوچھا تو اس نے کہا کہ کسی ایک بھی آدمی کے بازو پر دانتوں کے نشان نہیں۔ اس کے باوجود اے ایس آئی ان لوگوں کے پیچھے پڑا ہُوا تھا کہ شاید کوئی سراغ مل جائے۔

میرے بازو پر کاٹو

اگلی صبح میں تھانے جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک بڑا ہی معزز شخص میرے دفتر کے دروازے پر آ کھڑا ہوا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور آنے کی اجازت مانگی۔ میں نے اس کا لباس، چہرہ اور ڈیل ڈول دیکھ کر بڑے احترام سے کہا کہ وہ اندر آ جائے اور بیٹھے۔

اس کی سلیقے سے تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی داڑھی اس کے چہرے پر بڑی ہی بھلی لگ رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ میں قیاس آرائی کی کہ یہ شخص اگر کہیں ملازم ہے تو کسی سکول کا ہیڈ ماسٹر ہو گا اور اگر کسی سرکاری محکمے میں ہے تو ہیڈ کلرک یا آفس سپرنٹنڈنٹ ہو گا۔ بہرحال میرا جی چاہتا تھا کہ اس شخص کا احترام کیا جائے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میں اس کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ اس نے بتایا کہ وہ شاہینہ کا باپ ہے۔ میرا قیاس بالکل صحیح نکلا وہ اپنے قصبے کے اسلامیہ ہائی سکول میں سیکنڈ ماسٹر تھا۔

''میں آپ کی تفتیش میں دخل اندازی نہیں کرنے آیا'' ——اس نے تہذیب اور ادب سے بات کرتے ہوئے کہا—— ''میں صرف اپنی یہ تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ میری بیٹی پر تو کوئی حرف نہیں آئے گا؟'' ——اتنا ہی کہہ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور پھر آہ لے کر اس نے کہا—— ''ہم تو بڑے دھوکے کا شکار ہو گئے ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں آتی کیا کریں''۔

''آپ میرے ساتھ بے تکلفی سے بات کریں'' ——میں نے کہا—— ''مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا میں کروں گا بلکہ یہ کوشش بھی کروں گا کہ قاعدے قانون سے تھوڑا سا منحرف ہونا پڑا تو ہو جاؤں گا، آپ بات کریں''۔

وہ بات کرتے جھجک رہا تھا۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی لیکن لوگوں کے دلوں میں تھانیدار اور پولیس کا ایسا رعب بیٹھا ہُوا تھا کہ وہ کھل کر بات کرنے سے ڈرتے تھے۔ یہی کیفیت اس شخص پر طاری تھی۔ اس زمانے میں استادوں کی عزت اور قدر اتنی زیادہ ہوتی تھی جتنی آج پیروں اور درویشوں کی نہیں ہوتی۔ میرے دل میں اس کا بحیثیت استاد احترام تھا۔ میں نے اس سے کچھ باتیں کیں، کچھ اس نے کیں اور جب اس کا حوصلہ قائم ہُوا تو وہ اصل بات کہنے پر آ گیا۔

''میں نے اپنی بیٹی اس گھر میں نہیں دینی تھی'' ——اس نے کہا—— ''میرے ملنے والے ایسے دو آدمیوں نے جن پر مجھ کو اعتماد تھا، ان لوگوں کے واسطے رشتہ مانگا اور کہا کہ کاروباری لوگ ہیں اور خوش حال بھی ہیں اور بہت ہی شریف اور باوقار خاندان ہے۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ یہاں ان کے گھر آیا تو ان لوگوں نے ایسی تعظیم اور ادب اور احترام کا مظاہرہ کیا کہ میں ان سے متاثر ہو گیا۔ یوں لگتا تھا کہ ان لوگوں نے سر آنکھوں پر بٹھا لیا ہے اور باقی عمر اسی طرح میرے ممنون اور مشکور رہیں گے۔ مقتول اور اس کا بھائی میرے پاس

آئے تو اس طرح پتہ چلتا تھا کہ ان میں احساس کمتری بھی ہے اور عجز و انکسار بھی۔ میرا اپنا کوئی عزیز اور رشتہ دار نہیں۔ میں دھوکے میں آ گیا اور اپنی بیٹی دے بیٹھا......

''شادی ہونے کی دیر تھی کہ ان لوگوں نے اپنی اصلیت ظاہر کرنی شروع کر دی۔ مختصر یہ کہ انہوں نے آنکھیں ماتھے پر رکھیں اور ہم کو طرح طرح سے لتاڑنا شروع کر دیا۔ ہماری بیٹی کو تو یہ لوگ مارتے پیٹتے تھے۔ تب مجھ کو اِدھر اُدھر سے پتہ لگا کہ میرا یہ داماد جواری اور شرابی ہے اور بہت ہی بدنام آدمی ہے۔ بیٹی کے سسر کے بارے میں تو بہت گندی باتیں معلوم ہوئیں۔ ہم لوگ اپنی شرافت میں رہے اور بیٹی کو یہی کہتے رہے کہ نبھاہ کرنے کی کوشش کرے۔ اس بے چاری نے میری عزت کی خاطر یہ جہنم برداشت کیے رکھا اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اتنی بڑی واردات ہو گئی۔ لوگ مجھ کو بتاتے ہیں کہ یہ واردات ان لوگوں کی اپنی بدمعاشی کے جواب میں کچھ بدمعاشوں نے انتقام کے طور پر کی ہے''۔

میں اس قسم کی باتیں پہلے بھی سن چکا تھا جو آپ کو سنا دی ہیں، میں اس معزز شخص سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ مجھ سے کس قسم کی مدد یا حفاظت چاہتا ہے۔ یہ میں نے اس سے پوچھا۔

''آپ قانون سے واقفیت رکھتے ہیں''—— اس نے کہا—— ''ایک عرض تو یہ کروں گا کہ اگر آپ کے اختیار میں ہے تو میری بیٹی پر کوئی تہمت نہ آئے اور ایک مشورہ آپ سے یہ لینا ہے کہ میں ان لوگوں سے کس طرح آزاد ہو سکتا ہوں یعنی میں اپنی بیٹی کے واسطے کس طرح طلاق حاصل کر سکتا ہوں''۔

''آپ تفتیش ختم ہونے دیں''—— میں نے اس کو احترام سے تسلی دیتے ہوئے کہا —— ''مجھ کو پہلے یہاں کے معززین نے بتایا ہے کہ آپ کے ساتھ دھوکہ ہُوا ہے اور یہ لوگ بڑے ہی گھٹیا اور بدنام ہیں۔ میں اسی واردات کو آپ کے واسطے بہانہ بنا دوں گا اور اس کو بنیاد بنا کر آپ عدالت کی معرفت طلاق لے سکیں گے۔ میں خود یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی بیٹی یہاں سے آزاد ہو کر آپ کے پاس چلی جائے۔ ابھی وہ نوجوانی کی عمر میں ہے انشاء اللہ اس کی کہیں شادی ہو جائے گی۔ آپ مطمئن رہیں، میں آپ کی بیٹی پر کوئی تہمت یا غلط حرف نہیں آنے دوں گا''۔

وہ بے اختیار ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ اس کا میرے دل پر بہت ہی اثر ہُوا۔

میں نے دل کی گہرائی سے اس کے ساتھ عدہ کیا کہ میں اس کو اور اس کی بیٹی کو بدنام نہیں ہونے دوں گا، البتہ یہ اس کو برداشت کرنا پڑے گا کہ اس کی بیٹی ہر پیشی پر عدالت میں جائے گی۔ یہ کوئی بدنامی والی بات نہیں...... اس کو بہلا کر اور تسلی دلاسہ دے کر رخصت کر دیا۔

یہ دھوکہ اور فریب ہمارے ملک میں ہوتا آیا ہے اور ہو رہا ہے کہ شریف لوگوں کی لڑکیاں غنڈوں بدمعاشوں کے گھروں میں بیاہی جاتی ہیں اور پھر وہ اس جہنم میں سسک سسک کر زندگی گزارتی ہیں۔ یہ ایسا جرم ہے جس کو کوئی پکڑ نہیں سکتا۔

میں نے گزشتہ رات سوچا تھا کہ رحیم کی بیوی تاجی کو پہلے بلاؤں اور اُس کے ساتھ بات چیت کر کے اُس کے خاوند کو بلاؤں گا لیکن صبح جب دماغ میں کچھ تازگی آئی تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں کو اکٹھے ہی بلا لوں تا کہ رحیم کو، اگر وہ ملزم ہوا، تو اپنے بچاؤ کے واسطے پیش بندی کا موقعہ نہ ملے۔ ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ رحیم اور اُس کی بیوی کو ساتھ لے آئے اور احتیاط یہ کرے کہ راستے میں وہ آپس میں کوئی بات نہ کر سکیں۔

دونوں جب تھانے میں آئے تو میں نے پہلے رحیم کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا۔ اُس کے آنے کا اور چلنے کا اور میرے سامنے بیٹھنے کا انداز ایسا تھا جس میں مجھ کو مردانگی نظر نہ آئی۔ پولیس کا خوف صاف نظر آ جاتا ہے لیکن یہ شخص کسی اور ہی قسم کا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس کو یہ کہا کہ اپنے دائیں بازو کی آستین اوپر کرے اور بازو کہنی تک ننگا کر دے۔

اُس نے آستین کہنی سے بھی اوپر کر دی۔ یہ دیکھ کر مجھ کو بہت خوشی ہوئی کہ کہنی سے ذرا نیچے اس کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ زخم کیسے آیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ ایک لکڑی کی نوک بڑی زور سے لگ گئی تھی۔ میں نے اس کو کہا کہ پٹی کھول دے۔ وہ بائیں ہاتھ سے پٹی کھولنے میں دشواری محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر اُس کی پٹی کھول دی۔ یہ زخم پر چپکی ہوئی نہیں تھی۔ زخم ننگا ہوا تو میں خوشی سے دیوانہ ہونے لگا۔ یہ دانتوں کے صاف نشان تھے اور دانت گوشت میں گہرے اترے ہوئے تھے۔

''یہ تو کسی انسان کے دانتوں کے نشان ہیں''—— میں نے کہا—— ''انسانی دانتوں کے نشان چھپائے نہیں جا سکتے۔ اب یہ بتاؤ کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا ہے کہ لکڑی کی نوک لگی تھی''۔

وہ کچھ مسکرایا اور سنجیدہ بھی ہوا اور پھر چپ ہی رہا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں

اس کو کس نے کاٹا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اس نے صحیح بات نہ بتائی تو اس پر قتل کا مقدمہ بن جائے گا۔ وہ چپ رہا تو میں نے کہا کہ یہ حامد کی بیوی کے دانتوں کے نشان ہیں اور تم نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ حامد کے باپ کو قتل کیا ہے۔

''نہیں جناب عالی!''—— وہ تو تڑپ کر اچھل پڑا اور بولا—— ''میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا اور دانتوں کے یہ نشان حامد کی بیوی کے نہیں بلکہ میری اپنی بیوی کے ہیں۔ میں شرمندگی کے باعث چپ تھا''۔

''یہ دانت کب لگے ہیں؟''—— میں نے پوچھا۔

اس نے جو وقت بتایا وہ واردات کی رات تھی۔ اس رات رحیم کی اپنی بیوی کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میری بیوی یہاں موجود ہے، اُس سے پوچھ لیا جائے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بیوی کے ساتھ لڑائی کیوں ہوئی تھی؟

''بدمعاش عورت ہے''—— اُس نے کہا—— ''میرے قابو سے باہر ہوگئی ہے۔ میں اس کو قابو کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو میرے گلے پڑ جاتی ہے۔ کبھی تو خاموش رہتا ہوں اور جب کبھی تنگ آ کر کچھ کہہ بیٹھتا ہوں تو میرے واسطے مصیبت کھڑی کر دیتی ہے''۔

''کیا اس کے کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں؟''—— میں نے پوچھا۔

''ہاں جی!''—— اُس نے جواب دیا—— ''مجھ کو کچھ دن پہلے معلوم ہُوا ہے کہ اس نے مقتول فضل کے بیٹے حامد کے ساتھ تعلق جوڑا ہوا ہے اور وہ اُس کو پیسے کھلاتا رہتا ہے۔ میں نے بیوی کی منت بھی کی اور سختی بھی کی کہ حامد کے ساتھ تعلق توڑے لیکن پرسوں رات بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ میں نے سوچا تھا کہ اس کو گھر سے ہی نکال دوں لیکن اُس نے میرے بازو میں ایسے دانت گاڑے کہ چھوڑتی ہی نہیں تھی۔ یہ زخم آپ خود دیکھ لیں۔ مجھ کو سمجھ نہیں آتی کہ میں کیا کروں''۔

یہ شخص تو میرے آگے مظلوم بنا ہوا تھا اور وہ واقعی ہی مظلوم تھا اور بیوی کے ہاتھوں بہت ہی دکھی تھا لیکن وہ جس انداز سے بات کرتا تھا، اس سے مجھ کو ہنسی آ رہی تھی اور میں ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ تھا تو مرد لیکن وہ بولتا تھا تو اپنے ہاتھ بھی ہلاتا تھا اور اس کا بولنے کا انداز اور ہاتھ ہلانے کا طریقہ بالکل ہیجڑوں جیسا تھا۔ مجھ کو سمجھ آ گئی کہ اس کو بیوی کیوں اچھا نہیں سمجھتی اور اس نے باہر کیوں دوستی لگائی ہوئی ہے۔

''کیا اس لڑائی کے بعد تم گھر سے باہر چلے گئے تھے؟''—— میں نے ایک شک کی

بنا پر اس سے پوچھا۔

''نہیں جی!''—— اس نے جواب دیا—— ''باہر کہاں جانا تھا۔ آدھی رات کے بعد تک تو لڑائی جھگڑا جاری رہا۔ ہاتھا پائی کے بعد زبانی کلامی لڑائی ہوتی رہی اور پھر اُس کے بعد میں دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور آنکھ لگ گئی۔ صبح بہت دیر بعد آنکھ کھلی''۔

مجھ کو یہ مایوسی ہوئی کہ یہ شخص میرا ملزم نہیں۔ میں تو خوش ہُوا تھا کہ اُس کے بازو پر شاہینہ کے دانتوں کا زخم ہے۔

میں نے اُس کی بیوی تاجی کو اندر بلایا۔ وہ تیس بتیس سال عمر کی عورت تھی۔ وہ چہرے کے نقش ونگار کے لحاظ سے کوئی خاص خوبصورت نہیں تھی لیکن اس کا جسم اتنا متوازن اور ایسا جچا تلا اور لمبوترا تھا کہ اس پر یہ چہرہ بہت ہی اچھا لگتا تھا۔ اس عورت کی آنکھوں میں کوئی خاص چمک تھی۔ مختصر یہ کہ اس کو دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر اور اس کو دیکھا جائے۔ میں نے اُس کو اپنے قریب بلایا اور اپنا دایاں بازو ننگا کر کے اس کے منہ کے قریب کیا۔

''یہاں اسی طرح کاٹو جس طرح تم نے اپنے اس خاوند کو کاٹا ہے''—— میں نے کہا۔

وہ جھجک گئی اور ذرا سا مسکرائی۔ میں نے اُس سے پوچھا پہلے یہ بتاؤ کہ اپنے خاوند کے بازو پر تم نے خود کاٹا تھا؟...... اس نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ اپنے خاوند کے بازو پر اُسی نے کاٹا تھا۔

''اب اسی طرح میرا بازو کاٹو''—— میں نے کہا اور ہنس کر بولا—— ''دانت اس طرح کھال کے اندر اتار دینا جس طرح تو نے اپنے خاوند کو زخمی کیا ہے''۔

اُس نے پھر کچھ پس وپیش کی لیکن میں نے اپنا بازو اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا اور اس کو منوا لیا کہ وہ یہاں اسی طرح کاٹے۔ اُس نے منہ کھولا اور دانت میرے بازو میں گاڑے۔ میں نے اس کو کہا کہ ذرا اور دبائے۔ اس نے دانتوں کو مزید دبایا اور جب میں نے دیکھا کہ اس سے زیادہ دباؤ ڈالنے سے دانت کھال میں اتر جائیں گے میں نے اُس کو روک دیا۔

اُس کے منہ سے بازو نکال کر میں نے بازو رحیم کے بازو کے ساتھ رکھا اور دونوں نشانات کا جائزہ لینے لگا۔ دونوں کے بازو پر جو دانت لگے تھے اُن کے نشانات کی لمبائی اور

چوڑائی بالکل ایک جیسی تھی...... میں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میں کوئی ایکسپرٹ نہیں تھا۔
نے یہ دیکھا تھا کہ شاہینہ کا منہ کم چوڑا تھا اور تاجی کا منہ اس کی نسبت کچھ زیادہ چوڑا تھا۔
یہ دانت شاہینہ کے لگے ہوتے تو اُن کے نشانات اس سے بالکل مختلف ہوتے۔

میں نے رحیم کو باہر بھیج دیا اور تاجی کو اپنے پاس بٹھالیا۔

سسر مردود

رحیم کی طرف سے تو میں مطمئن ہو گیا تھا لیکن تاجی کو میں نے دیکھا تو مجھ کو محسوس
کہ یہ عورت میری کچھ نہ کچھ مدد ضرور کرے گی۔ اُس کا تعلق بلکہ بڑا گہرا تعلق حامد
ساتھ تھا۔ مجھ کو امید تھی کہ اس کے پاس حامد کے کچھ راز بھی ہوں گے۔ ایسی
وارداتوں کی تفتیش میں جس کا کوئی سراغ ہی نہ ملے، تفتیشی افسر کو تنکوں کے سہار
ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے۔ یہی حالت
ہو رہی تھی۔ میں نے تاجی کے دل سے تھانے اور تھانیدار کا خوف نکال دیا جس کا ذریعہ
تھا کہ میں اُس کے ساتھ دوستانہ انداز میں باتیں کرتا رہا اور کچھ اشارے ایسے بھی د
جیسے وہ مجھ کو پسند آ گئی ہے اور میں اس کی دوستی کا خواہشمند ہوں۔

''رحیم کے ساتھ لڑائیاں کیوں ہوتی ہیں؟''—— میں نے دوستانہ لہجے میں پ
—— ''میں تم سے یہ بات تھانیدار کی حیثیت سے نہیں پوچھ رہا۔ ویسے ہی تمہارے سا
دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہو گئی ہے، اس واسطے پوچھ رہا ہوں''۔

''اُس شخص کو آپ نے دیکھ لیا ہے''—— تاجی نے مسکراتے ہوئے کہا——
آپ اس کو مرد سمجھتے ہیں؟ یہ تو زنخا ہے۔ عورتوں کی طرح باتیں کرتا ہے اور اس کی حر
بھی عورتوں جیسی ہوتی ہیں۔ مرد میں تو ایسا رعب ہونا چاہئے کہ عورت اپنے دل سے اس
زیر ہو جائے اور اُس کی قدر کرے''۔

یہاں سے بات چلی تو میں نے یہ انداز اختیار کر لیا کہ اس کی ہر بات پر میں ہنس
اور اُس سے کچھ نہ کچھ پوچھ بھی لیتا۔ یہ انداز ایسا تھا جیسے ہم آپس میں وقت گزارنے
لئے گپ شپ لگا رہے ہوں۔ میرے رویے سے اس کی زبان ایسی رواں ہوئی کہ اس
منہ میں جو آئی اس نے کہہ ڈالی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے رحیم کو کاٹا کیوں تھا

کے خفیہ ذرائع مخبری بڑے مضبوط اور بہت دور گہرائی تک پہنچنے والے ہوتے ہیں۔

''تمہارے خاندان کے ساتھ کسی کی دشمنی ہو گی''—— میں نے کہا—— ''یا تمہارے خاوند کا کوئی دشمن ہو گا؟''

''کوئی دشمن نہیں''—— شاہینہ نے بتایا—— ''اگر میرے خاوند کی کسی کے ساتھ دشمنی ہے تو میں بتا نہیں سکتی۔ وہ واپس آئے گا تو آپ اس سے پوچھ لینا''۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اس کو یہ حکم دیا کہ اس لڑکی کو اس کے گھر لے جائے اور اس کے یہ خون آلود کپڑے تبدیل کروا کر ساتھ لے آئے۔ میں نے اس کی چارپائی سے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے اکٹھے کر لئے تھے۔ اس کے یہ کپڑے عدالت میں پیش کرنے تھے...... کانسٹیبل شاہینہ کو ساتھ لے گیا۔ میں نے نمبردار کو بلایا۔ اس سے پوچھا تھا کہ لڑکی کا خاندان اور اس کے سسرال کا خاندان کیسا ہے اور ان کی شہرت کیا ہے۔ نمبردار نے بتایا کہ لڑکی صحیح معنوں میں شریف اور پردہ دار ہے اور اُس کا خاندان بھی مشہور شریف اور پُر وقار خاندان ہے۔ نمبردار کے بیان کے مطابق لڑکی کے سسرال ٹھیک لوگ نہیں تھے۔ گھٹیا اور کمینے سے لوگ تھے اور ان کو کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ سسر یعنی مقتول کی بابت نمبردار نے بتایا کہ پکا ٹھرکی آدمی تھا۔ اس کی بیوی کبھی کی مر چکی تھی۔ عورت باز تھا لیکن اس کے تعلقات گھروں میں کام کرنے والی عورتوں، جمعدارنیوں اور بھکارنوں کے ساتھ ہوتے تھے۔

''لڑکی والے معلوم نہیں کس دھوکے میں اس گھر میں اپنی بیٹی دے بیٹھے تھے''—— نمبردار نے کہا—— ''اس کا خاوند بھی بدکردار آدمی ہے۔ اچھے پیسے کما لیتا ہے۔ عادی جوئے باز ہے اور قبرستان کے تکیے پر باقاعدہ جا کر جوا کھیلتا رہتا ہے۔ یہ تو اس لڑکی شاہینہ کا صبر اور شکر ہے کہ وہ اڑھائی تین سال سے اس گھر میں گزارہ کر رہی ہے۔ اس گھر کے پیچھے فضل (مقتول) کا چھوٹا بھائی رہتا ہے جس کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ وہ پورے کا پورا خاندان اوچھا اور کمینہ ہے۔ پھر مقتول فضل کا بڑا بیٹا ہے جس کے بچے ابھی جوان نہیں ہوئے۔ وہ بھی اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں جیسا ہے۔ دھوکا اور فریب کاری اور جھوٹ ان کی زندگی کے اصل اصول ہیں''۔

میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے نمبردار نے بتایا کہ شاہینہ کے والدین اس قصبے کے رہنے والے نہیں۔ وہاں سے بیس بائیس میل دور ایک بڑا قصبہ ہے۔ یہ لوگ وہاں

ہوں اور تم کو صاف لفظوں میں کہا ہے کہ مجھ کو اپنے دل میں بڑے بھائی کا درجہ دو...... تم کو ان باتوں کا کوئی تجربہ نہیں۔ غلط بیان دو گی تو تم نے نہ پھنسنا ہوا تو بھی پھنس جاؤ گی۔ میں تم کو بتاتا ہوں کہ پولیس کا چکر بہت بُرا چکر ہوتا ہے۔ اس سے بچو اور اس سے بچنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ سچ بول دو۔ میں تمہارے ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر پردہ ڈالوں گا اور سارا معاملہ ہی گول کر دوں گا''۔

''میں نے سچ تو بول دیا ہے''— شاہینہ نے کہا— ''اگر آپ کو یقین نہیں آیا تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں...... یا یہ بتا دیں کہ آپ کو مجھ پر کیوں اعتبار نہیں آیا؟''

''میں بات صاف کروں گا شاہینہ!''— میں نے کہا— ''آدمی دو نہیں تھے بلکہ ایک تھا۔ اس کو تم نے خود بلایا تھا۔ تمہارے سسر کی آنکھ کھل گئی......''

شاہینہ نے پہلے تو آنکھیں پھاڑ کر مجھ کو دیکھا پھر اپنے دونوں ہاتھ بڑی زور سے دائیں بائیں سے اپنے سر پر مارے اور سر جھکا لیا۔ میں نے اس کا سر اوپر کیا تو وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

''اس سے تو بہتر تھا کہ وہ مجھ کو بھی قتل کر جاتے''— شاہینہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا— ''میری ساری دولت یہی ایک عزت اور عصمت ہے، آپ نے اس پر بھی تہمت لگا ڈالی۔ اس کے ساتھ آپ یہ کہتے ہیں کہ میں آپ کو بڑا بھائی سمجھوں''۔

اس مسئلے پر میری اور اس کی بہت بحث ہوئی۔ میں اس کی باتیں ذرا کم ہی سن رہا تھا، میں یہ جائزہ لے رہا تھا کہ یہ لڑکی کتنی کچھ چالاک ہے یا بالکل ہی گھریلو لڑکی ہے۔ وہ روتی زیادہ تھی اور بولتی کم تھی۔ میں تجربہ کار پولیس آفیسر تھا۔ میں نے اپنی زبان کا ہر حربہ استعمال کر ڈالا مگر وہ اپنے اسی بیان پر قائم رہی۔ مجھ کو اس پر اعتبار آنے لگا۔

''پھر مجھ کو ایک اور شک ہے''— میں نے کہا— ''تمہاری دوستی کسی اور کے ساتھ ہو گی اور کوئی اور آدمی تم کو اس ٹائپ کی لڑکی سمجھ کر تمہارے ساتھ ایسی ہی دوستی لگانا چاہتا ہو گا، مگر تم نے اسے دھتکار دیا ہو گا یا گالیاں بھی دی ہوں گی۔ اس آدمی نے اس طرح انتقام لیا کہ تمہارے ساتھ زبردستی زیادتی کرنے آیا تھا لیکن تمہارے سسر کے جاگ اٹھنے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا''۔

اب شاہینہ کا ردعمل پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ اس نے کہا کہ اس کے چال چلن اور ہر طرح کے اخلاق کی بابت دوسروں سے پوچھا جائے۔ یہ تو میں نے پوچھنا ہی تھا۔ پولیس

''اُس رات تو اُس نے حد ہی کر دی تھی''— تاجی نے بڑے ہلکے پھلکے موڈ اور لہجے میں کہا— ''مجھ کو کہتا تھا کہ حامد کو نہ ملا کرو۔ میں نے کہا کہ حامد کے ساتھ میری ناجائز دوستی نہیں۔ اس کو کسی نے بتا دیا تھا کہ میں اُس کی غیر حاضری میں حامد کو ملتی ہوں۔ رحیم کو میرے جواب سے تسلی نہ ہوئی تو میں نے غصہ جھاڑ دیا۔ اس وقت یہ بھی غصے میں تھا۔ اس نے مجھ پر ایسا حملہ کیا کہ مجھ کو گرا کر میرے سینے پر چڑھ بیٹھا اور بولا کہ آج میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔ اُس کا دایاں بازو میرے منہ کے قریب تھا۔ میں نے اس بازو کو منہ میں لے لیا اور دانت اتنی زور سے دبائے کہ اُس کے گوشت میں اتر گئے۔ اُس نے عورتوں کی طرح چیخ ماری تب میں نے اُس کے بازو کو چھوڑا۔ یہ اٹھ کر ایک طرف بیٹھ گیا اور عورتوں کی طرح رونا شروع کر دیا''۔

تاجی نے تسلیم کر لیا کہ حامد کے ساتھ اس کی ناجائز دوستی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے حامد کو کیسے پسند کر لیا ہے، وہ تو شرابی، جواریا اور چرسی ہے اور دھوکا باز بھی ہے۔

''وہ طوائف باز بھی ہے''— تاجی نے کہا— ''وہ جھوٹا اور فریب کار بھی ہے لیکن مجھ کو اُس سے کیا؟...... میں اس سے جو کچھ بھی مانگوں وہ فوراً حاضر کرتا ہے۔ روپے پیسے سے میری مٹھی گرم رکھتا ہے۔ ہر عید پر میرے اور میرے بچوں کے کپڑے سلوا کر دیتا ہے اور عیدی الگ ہوتی ہے۔ وہ ہر طرح سے میرے ہاتھ میں ہے۔ اپنا گھر برباد کرتا ہے تو کرتا رہے''۔

''کیا تم اس کی بیوی سے کبھی ملی ہو؟''— میں نے پوچھا۔

''شاہینہ کو تو میں نے بڑی پکی سہیلی بنایا ہوا ہے''— تاجی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا— ''اس بے چاری کو تو پتہ ہی نہیں کہ اس کا خاوند میرے ہاتھ میں ہے اور اس کے گھر میں میرا حکم چلتا ہے۔ اگر میں شاہینہ کے ساتھ دوستی نہ رکھوں تو پھر حامد کو ملنے میں مشکل پیدا ہوتی ہے۔ شاہینہ مجھ کو اپنی ہمدرد اور راز دار سمجھتی ہے''۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے تاجی!''— میں نے کہا— ''پھر تو تم اس گھر کی کئی راز کی باتیں بھی مجھ کو بتا سکتی ہو''۔

''آپ پوچھیں تو سہی''— تاجی نے کہا— ''میں ہر بات بتاؤں گی لیکن آپ نے یہ پردہ رکھنا ہے کہ ایسی باتیں آپ کو کہاں سے معلوم ہوئی ہیں''۔

میں نے مقتول کے اخلاق کی بابت بات کی اور کہا کہ سنا ہے کہ جمعدارنی، نوکرانی اور کوئی بھکارن اُس کے ہاتھ چڑھ جائے تو ان پر ہاتھ صاف کر جاتا تھا...... تاجی نے اس بات کی تصدیق کی اور اس نے یہ الفاظ کہے کہ یہ شخص عمر کے لحاظ سے تو بوڑھا ہو گیا تھا لیکن کرتوتوں کے لحاظ سے یہ جوان ہوتا جا رہا تھا۔

''ایسا سسر اپنی بہو کے حق میں بھی نیک نیت نہیں ہوتا'' — میں نے کہا — ''مجھ کو شک ہے کہ یہ شاہینہ پر بھی بُری نیت رکھتا ہوگا''۔

''لیکن شاہینہ اس کے ہاتھ نہیں آئی'' — تاجی نے کہا — ''شاہینہ میرے ساتھ ذکر کرتی رہتی تھی۔ وہ تو بے چاری بہت ہی پریشان تھی۔ اس نے ایک بار مجھ کو بتایا کہ سسر نے اس کو کہا ہے کہ تم بیوی تو میرے بیٹے کی ہو لیکن میرے ساتھ بھی تعلق پیدا کر لو۔ جو مانگو گی اور جتنا پیسہ مانگو گی فوراً حاضر کروں گا۔ شاہینہ کو اپنی ہوس کاری میں پھانسنے کے واسطے اس بڈھے مقتول نے بہت جتن کئے تھے۔ شاہینہ نے اُس کو کہا تھا کہ وہ حامد کو بتا دے گی۔ سسر مردود نے کہا کہ بتا دو اور میں اس کے جواب میں تم پر ایسا الزام تھوپوں گا کہ حامد نے تم کو قتل نہ کیا تو طلاق دے کر تو فوراً گھر سے نکال دے گا''۔

''کیا اس بڈھے نے شاہینہ پر کبھی دست درازی بھی کی تھی؟'' — میں نے پوچھا۔

''شاہینہ نے کبھی ایسی بات مجھ کو نہیں بتائی'' — تاجی نے کہا — ''لیکن شاہینہ پر وہ جس طرح جال پھینکتا رہتا تھا وہ دست درازی سے زیادہ ناقابل برداشت تھا...... شاہینہ نے مجھ کو بتایا تھا کہ اس نے حامد کو اس کے باپ کی ان حرکتوں کے متعلق کہا تو ہر بار حامد نے شاہینہ کو دو تین تھپڑ جڑ دیئے اور کہا کہ تم میرے اتنے شریف باپ کو بدنام کرتی ہو...... شاہینہ تو اکثر رو پڑتی تھی اور کہتی تھی کہ میں اپنے ماں باپ کی عزت کی خاطر یہ صورتِ حال قبول کر رہی ہوں۔ اس واردات سے دو روز پہلے اس نے مجھ کو کہا تھا کہ وہ اب مزید برداشت نہیں کر سکتی اور ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ وہ خودکشی کر لے گی''۔

''ایک بات سوچ کر بتاؤ تاجی!'' میں نے کہا — ''کیا یہ ہو سکتا ہے کہ حامد تو گھر سے غیر حاضر تھا، حامد کے باپ نے رات کو شاہینہ کی عزت پر حملہ کیا ہو اور شاہینہ نے اس کو قتل کر دیا ہو...... کیا شاہینہ میں اتنی جرأت ہے؟''

''لڑکی عقل والی ہے اور غیرت والی بھی'' — تاجی نے جواب دیا — ''وہ اتنی مظلوم تھی کہ کوئی بڑی ہی خطرناک کارروائی بھی کر سکتی تھی۔ خودکشی کا تو اُس کا پکا ارادہ

تھا''۔

تاجی نے جب اس قسم کی باتیں کیں تو میرے دماغ میں روشنی ہونے لگی۔ میں نے مزید کریدنا شروع کیا تو نئی سے نئی بات سامنے آتی گئی۔ میں نے تاجی کو یہ بھی کہا کہ ایسی بات تو نہیں کہ تم شاہینہ کو راستے سے ہٹا دینے کے لئے اس کو اس واردات میں پھنسانا چاہتی ہو؟

''نہ جی!'' — تاجی نے کہا — ''شاہینہ میرے راستے کی رکاوٹ کبھی بھی نہیں بنی۔ اس بے چاری کو تو شک بھی نہیں تھا کہ میرے تعلقات اس کے خاوند کے ساتھ ہیں۔ خاوند کے ہاتھوں میں وہ اتنی مجبور تھی کہ دل کی ہر بات وہ میرے ساتھ کرتی تھی۔ آپ کو شاید مجھ پر اعتبار نہ آئے، میں تو اس کو بچانے کی کوشش کروں گی''۔

تاجی کے ساتھ بہت ہی زیادہ باتیں ہوئیں اور آخر میں نے اس کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ چلی گئی تو میں نے اپنے دماغ پر زور دینے لگا۔ شاہینہ کا بیان تھا کہ دو آدمیوں نے اس پر حملہ کیا۔ میں دو آدمیوں کا گھر میں داخل ہونا تسلیم تو کر چکا تھا لیکن یہ پتہ نہیں لگتا تھا کہ وہ کس طرف سے اس گھر میں داخل ہوئے۔ صرف بجلی کا کھمبا تھا جس کے ذریعے وہ اوپر جا سکتے تھے۔ یہ میرا قیاس تھا لیکن میں نے جب غور کیا تو یہ خیال آیا کہ دو آدمی ایک سوئی ہوئی لڑکی پر قابو نہیں پا سکے۔ وہ جو اتنی دلیری سے اس گھر میں داخل ہوئے تھے وہ اتنے بے وقوف اور بزدل نہیں ہو سکتے تھے کہ ایک لڑکی پر قابو نہ پا سکتے۔ میں غور کرتا گیا تو میرا شک مضبوط ہوتا گیا۔ میرے شک کو تاجی کی باتوں نے پکا کر دیا۔

بڈھا دھوکے میں آ گیا

شاہینہ جب میرے سامنے آئی تو مجھ کو یوں لگا کہ جیسے اس لڑکی کو میں نے بہت مدت بعد دیکھا ہے۔ حالانکہ اس کو صرف ایک دن اور ایک رات یا اس سے کچھ زیادہ وقت پہلے دیکھا تھا۔ اُس وقت شاہینہ کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی تو ضرور تھی لیکن چہرے پر جوانی کی تازگی بھی موجود تھی۔ اس کی باتوں میں بھی جان تھی لیکن اب اس شاہینہ کو دیکھا تو وہ بالکل ہی مُرجھا گئی تھی۔ چہرے پر جوانی کا ذرا سا بھی نور نہیں تھا۔ اُس کے کندھے آگے جھک آئے تھے اور سر بھی کچھ آگے جھکا ہوا تھا۔ میرے اشارے پر وہ اس طرح کرسی پر

بیٹھی جیسے بڑے لمبے سفر کے بعد تھک کر چُور ہو گئی ہو اور کرسی پر آ گری ہو۔ اس کی آنکھیں بھی بے نُور ہو گئی تھیں۔

''شاہینہ!''—— میں نے شفقت کے لہجے میں کہا —— ''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اتنا زیادہ پریشان ہونے کی تو کوئی ضرورت نہیں تھی''۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے پتہ لگتا تھا کہ وہ سوئی بھی نہیں اور بہت ہی بُری حالت میں ہے۔ اس کے آنسو بہنے لگے۔

''دیکھو شاہینہ!''—— میں نے ذرا آگے ہو کر کہا —— ''تمہارے والد صاحب میرے پاس آئے تھے۔ وہ تمہاری بابت بہت پریشان تھے۔ وہ کہتے تھے کہ تم پر کوئی حرف یا تہمت نہ آئے۔ وہ معزز آدمی ہیں...... میں نے اُن کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ آپ کی بیٹی پر پردہ ڈالنا اور اس کی نیک نامی کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے اور میں یہ فرض ادا کروں گا''۔

''آپ کو معلوم نہیں''—— شاہینہ مری مری سی آواز میں بولی —— ''میرے خاوند بدبخت نے اور اس خاوند کے چچا نے میرے ابا جان کی بے عزتی کر کے گھر سے نکال دیا ہے...... میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ اگر آپ مجھ کو یہاں نہ بلاتے تو آج رات میں ریلوے لائن پر جا کر ریل گاڑی کے نیچے آ جاتی۔ اگر آپ مجھ کو خودکشی کی مہلت دے دیں تو میں آپ کو دعائیں دیتی ہوئی جان دے دوں گی''۔

''خودکشی کیوں؟''—— میں نے کہا —— ''کیوں ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھی ہو؟ میرے ساتھ صاف صاف بات کرو۔ میں نے تم کو پہلے کہا ہے کہ مجھ کو اپنے دل میں بڑے بھائی کا درجہ دو۔ اب بتاؤ کیوں تم اپنی جان لینا چاہتی ہو؟''

''اس لئے کہ میں نے اب تو مرنا ہی ہے''—— اس نے کہا —— ''اگر میں خودکشی نہیں کروں گی تو آپ مجھ کو پھانسی کی سزا دلوا دیں گے لیکن میں جلدی مرنا چاہتی ہوں''۔

''میں تم کو سزا کیوں دلواؤں گا؟''—— میں نے پوچھا۔

''اس لئے کہ اس مردود سسر کو میں نے قتل کیا ہے''—— شاہینہ نے کہا اور یکلخت بیدار ہو گئی۔ میز پر زور سے ہاتھ مار کر بولی —— ''مجھ کو گرفتار کر لیں۔ اس بدبخت اور بدطینت آدمی کو میں نے قتل کیا ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت اور ہمت نہیں کہ اپنے اس جرم کو اپنے سینے میں دبا کر رکھتی''۔

مجھ کو یہ شک تو پہلے ہی تھا لیکن یہ شک اتنا مضبوط نہیں تھا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے اب شاہینہ نے خود ہی بتا دیا کہ اپنے سسر کی قاتل وہ خود ہے تو مجھ کو بجلی کے کرنٹ کی طرح دھچکا لگا اور میں کچھ دیر شاہینہ کے منہ کو دیکھتا رہا...... ہو سکتا ہے یہ کہانی پڑھنے والے کچھ حضرات یہ کہیں کہ اس لڑکی نے اچانک اعترافِ جرم کیوں کر لیا جبکہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی نہ اس کو شاملِ تفتیش کیا گیا تھا۔ اس کا جواب میں یہ دیتا ہوں کہ اس وقت شاہینہ کی ذہنی حالت نارمل نہیں تھی بلکہ بُری طرح ابنارمل تھی۔ ایسی ذہنی کیفیت سے اس کا اپنے ضمیر سے بوجھ اتار کر پھینک دینا میرے واسطے حیرانی کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی میرے اوپر سکتے والی حالت طاری ہو گئی۔

معلوم نہیں لوگ مجھ پر یقین کریں گے یا نہیں، بہرحال میں ایک حقیقت پیش کر رہا ہوں۔ وہ یہ تھی کہ مجھ کو ایسا لگا جیسے میرا دماغ اور میرا دل کسی غیبی طاقت کے قبضے میں آ گیا ہو اور میں نے یہ محسوس کیا کہ اب میں خود کچھ بھی کہہ یا کر نہیں سکوں گا۔ میری زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے —— ''شاہینہ! نہ تم خودکشی کرو گی نہ تم پھانسی چڑھو گی۔ اللہ کو یاد کرو اور اسی کی ذات تم کو اپنی پناہ میں لے لے گی''—— مجھ کو یہ احساس تھا کہ یہ الفاظ میری زبان سے نکلے ہیں لیکن مجھ کو کچھ احساس نہیں تھا کہ یہ الفاظ کس نے میری زبان پر رکھے تھے۔ شاید یہ ضمیر کی آواز تھی یا یہ میرے ایمان کی آواز تھی۔

اب مجھ کو شاہینہ کے بیان کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خود اس کا بیان لکھ سکتا تھا اور اگر میں لکھتا اور اس کو بتاتا کہ یہ پڑھ کر بتاؤ کہ یہ تمہارا بیان ہے کہ نہیں تو وہ حیران ہو کر کہتی کہ یہ میرا بیان ہے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور اس کو کہا کہ وہ پورا بیان دے اور پھر میں اس کو بتاؤں گا کہ میں اس کے واسطے کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے اس کو صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں اس کو گرفتار نہیں کروں گا اور اس کے باپ کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا وہ انشاء اللہ پورا کروں گا۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر کچھ سکون نظر آنے لگا۔

اس نے پہلے تو یہ بتایا کہ اس کی شادی اس خاندان میں کس دھوکے میں ہوئی تھی۔ یہ میں پہلے اس کے باپ کی زبانی سنا چکا ہوں۔ شاہینہ نے بتایا کہ وہ جب اس گھر میں آئی تو ساس نہیں تھی۔ وہ پہلے کی مر چکی تھی لیکن سسر نے ساس کی جگہ پُر کر دی اور ویسا ہی بُرا اور گھٹیا سلوک شاہینہ کے ساتھ شروع کر دیا جیسا گھٹیا قسم کی ساسیں کیا کرتی ہیں۔ خاوند اس کے ساتھ حکم اور ڈانٹ ڈپٹ کے لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس کے زیورات پر خاوند نے

قبضہ کرلیا اور اس کے پاس سلامیوں کے جو پیسے تھے وہ بھی لے لئے۔

ان کے مکان کے پچھواڑے حامد کا چچا رہتا تھا۔ اس کی بیوی بھی تھی اور بچے بھی۔ یہ عورت دوسرے تیسرے دن شاہینہ کے گھر آجاتی اور ہر کام میں ٹوکتی۔ پھر شاہینہ کے سسر اور اس کے خاوند کے کان بھرتی۔ شاہینہ کو جلد ہی پتہ لگ گیا کہ اُس کا خاوند بہت بُرے کردار والا آدمی ہے۔ جوا کھیلتا ہے، شراب اور چرس پیتا ہے اور باہر بدکاری بھی کرتا ہے۔

ان اذیتوں کی داستان بڑی لمبی ہے جس سے ہم سب واقف ہیں۔ آج بھی ہمارے گھروں میں یہی کچھ ہو رہا ہے اس واسطے میں تفصیل سے نہیں سناؤں گا۔ سنانے والی اصل بات یہ ہے کہ شاہینہ کا سسر بڑا ہی بدکردار آدمی نکلا۔ شاہینہ نے بتایا کہ ان کے غسل خانے کے دروازے میں درزیں ہیں جو ذرا کھلی ہیں۔ اس نے کئی بار دیکھا کہ وہ غسل خانے میں نہانے گئی تو اس کا سسر درز سے آنکھ لگائے جھانک رہا ہے۔

ایک روز شاہینہ نے اپنے خاوند کو بتایا کہ اُس کا باپ یہ حرکت کرتا ہے۔ خاوند نے شاہینہ کو دو تین تھپڑ جڑ دیئے اور کہا کہ آئندہ اُس نے ایسی بات کی تو وہ اس کی زبان کھینچ لے گا۔

شاہینہ کے بیان کے مطابق، اس خاندان کے سارے مرد عورتوں میں بیٹھ کر ننگی باتیں کرتے اور گالیاں بکتے تھے۔ عورتیں بھی مردوں کی طرح انتہائی بیہودہ باتیں کرتی تھیں اور پھر یہ مرد اور عورتیں خوب قہقہے لگاتے تھے۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے خاوند کی یہ عادت تھی کہ جب اس کے رشتہ دار اس کے گھر آئے ہوتے تو خاوند شاہینہ کے خلاف زیادہ نفرت کا اظہار کرتا اور اس کو گالیاں دیتا اور اس کو رشتہ داروں کے سامنے ذلیل کر کے رکھ دیتا تھا۔ اب کوئی پوچھے کہ یہ لوگ ایسا کیوں کرتے تھے تو اس کا ایک ہی جواب ہے کہ اس خاندان کی فطرت اور ان کا کلچر ہی یہی تھا۔ ان کے مرد آپس میں مل بیٹھتے تو بڑے فخر سے اپنے اپنے دھوکا دہی کے کارنامے سناتے تھے۔ مثلاً یہ کہ فلاں کی پیشگی رقم بہانہ تراش کر ہضم کر لی ہے یا مال کا نمونہ اچھا دکھا کر گھٹیا مال سپلائی کر دیا ہے۔

شاہینہ نے یہ ساری اذیت برداشت کی اور اپنے والدین کو کچھ بھی نہ بتایا۔ اس کا سسر اور خاوند اس کو اپنے والدین کے گھر جانے ہی نہیں دیتے تھے۔ کبھی کبھار وہ جاتی تو اگلے ہی دن خاوند یا سسر وہاں جا دھمکتا اور ساتھ لے کر واپس آجاتا۔ یہ تو شاہینہ نے برداشت کیا لیکن اپنے سسر کی یہ حرکت اس کی برداشت سے باہر تھی کہ سسر اس پر بُری نظر

رکھتا۔ سسر نے اس کو صاف لفظوں میں کہا تھا کہ بیوی تو میرے بیٹے کی ہو لیکن میری داشتہ بن جاؤ اور عیش کرو۔ شاہینہ نے اس کو یہ الفاظ کہے کہ میں اپنی جان دے دوں گی، اپنی آبرو نہیں دوں گی۔ سسر اس کو قیمتی کپڑوں اور پیسوں کا لالچ دیتا رہتا تھا اور اُس کے ساتھ چھیڑ خانی بھی کرتا تھا۔

یہاں میں تھوڑی سی اپنی رائے دوں گا۔ میں بھی اسی معاشرے کا فرد ہوں اور میں نے بہت کچھ دیکھا ہے اور دیکھ رہا ہوں۔ بعض سسر اپنی بہوؤں کے ساتھ پیار کرتے ہیں لیکن ان کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے یہ بہو نہیں بلکہ اپنی بیٹی ہو۔ میں نے ایسے سسر بھی دیکھے ہیں جو بہو کے پیار میں ذرا زیادہ جذباتی ہو جاتے ہیں جس سے بہو کو شک ہو سکتا ہے لیکن پیار کی پاکیزگی خود ہی سارے شک رفع کر دیتی ہے۔ تقریباً ایک سال گزرا، میں اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی کہ ایک نوجوان بہو کا سسر حرکت قلب بند ہو جانے سے فوت ہو گیا۔ اس کی میت ابھی گھر میں پڑی تھی کہ بہو کی حرکت قلب بھی بند ہو گئی۔ یہ صدمے کا اثر تھا۔ صدمہ یہ کہ اس بہو کا سسر اسے بہت پیار کرتا تھا۔

یہ معزز اور قابل قدر سسر ہیں جن کے پیار کی پاکیزگی اپنے آپ ہی ظاہر ہو جاتی ہے لیکن شاہینہ کا سسر اس کو صاف لفظوں میں اپنی ہوس کے جال میں لانا چاہتا تھا۔ شاہینہ نے بتایا کہ چند مرتبہ ایسا ہُوا کہ سسر اس کو کسی بہانے کمرے میں لے گیا اور اس کو اپنے بازوؤں میں لے کر بے ہودہ حرکتیں کرنے لگا۔ جو پیار میں نہیں بلکہ حیوانیت کے جذبے کے تحت کی جاتی ہیں۔ شاہینہ نے خاوند کا رویہ جانتے ہوئے بھی ایک دو مرتبہ اپنے خاوند کو پھر بتایا کہ اُس کا باپ اس کے ساتھ ناجائز تعلق قائم کرنا چاہتا ہے۔ خاوند نے اُس کو گالیاں بھی دیں اور کبھی ایک دو تھپڑ بھی لگا دیئے۔

اگر شاہینہ بھی کسی ایسے ویسے خاندان کی بیٹی ہوتی تو وہ بھی انہی لوگوں کے رنگ میں رنگی جاتی اور خاوند کے ساتھ سسر کی بیوی بھی بنی رہتی اور عیش موج کرتی لیکن شاہینہ تصور میں بھی اس صورت کو قبول نہ کر سکی۔ آخر یہ رات آئی۔ شاہینہ کا خاوند شہر سے باہر چلا گیا تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا کہ سسر نے اُس کو بستر پر دبوچ لیا۔ شاہینہ کی آنکھ کھلی تو اس نے سسر کو اپنے بستر پر دیکھا۔ شاہینہ آخر جوان لڑکی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے واسطے پوری طاقت استعمال کر ڈالی۔

اس دھینگا مشتی میں شاہینہ کی قمیض دو تین جگہوں سے پھٹی اور ایک جگہ سے شلوار بھی

پھٹ گئی۔ اس نے مجھ کو بتایا کہ یہ بوڑھا بالکل درندہ بن گیا تھا۔ وہ شاہینہ کے بازو پکڑنے کی کوشش کرتا تھا جس سے اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ آخر شاہینہ نے اس کو چارپائی پر ہی ایک طرف گرادیا اور خود اُس پر چڑھ بیٹھی۔ اس نے سوچا کہ یہ معرکہ کب تک چلے گا اور اس کا انجام کیا ہوگا، اس کے دماغ کو خون چڑھ گیا اور ایک ترکیب دماغ میں آ گئی۔ اُس نے سسر سے کہا، چلو آج آپ کا دل خوش کر دیتی ہوں لیکن آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ سسر خوش ہو گیا۔ شاہینہ نے بڑے پیار سے کہا کہ آپ لیٹیں، میں پیشاب کر کے آتی ہوں۔ جنسیت کا مارا ہوا بڈھا دھوکے میں آ گیا۔ شاہینہ بیت الخلاء میں جانے کی بجائے باورچی خانے میں چلی گئی اور چھوٹے سائز کی چھری اٹھا لائی۔

اس نے سسر کو دیکھا جو لیٹا ہوا تھا۔ شاہینہ کو دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ شاہینہ نے اُس کو گریبان سے پکڑا اور بڑی زور سے جھٹکا دے کر چارپائی سے اٹھایا۔ اب وہ فرش پر کھڑا تھا۔ شاہینہ نے اس کو چھ مرتبہ چھری ماری۔ چار زخم سینے پر اور دو زخم معدے پر لگے، سسر گر پڑا۔ شاہینہ ذرا بھی نہ گھبرائی۔ وہ پاک خیالات کی لڑکی تھی، اللہ اُس کے ساتھ تھا۔ شاہینہ نے بڑے اطمینان سے سسر کی نبض دیکھی۔ چند منٹ نبض چلتی رہی اور پھر رک گئی۔ شاہینہ کے دماغ میں ایک اور سوچ آئی۔ وہ ایک پہلو کے بل سسر پر لیٹی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دماغ اس کے کنٹرول میں رہا اس واسطے اس نے یہ کیا کہ دوڑتی ہوئی باورچی خانے میں گئی اور چھری کو اچھی طرح دھو ڈالا۔ باہر آ کر وہ صحن میں رکی اور بڑی زور سے چیخیں مار کر لوگوں کو مدد کے لئے پکارنے لگی اور پھر چھت پر چلی گئی اور پچھواڑے والوں کو پکارنے لگی۔ لوگ اکٹھے ہو گئے تو اس نے سب کو بتایا کہ دو آدمیوں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ سسر اس کو چھڑانے آیا تو ان آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ شاہینہ نے ڈیوڑھی کا باہر والا دروازہ کھول دیا تھا تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ وہ آئے تو دروازہ اندر سے بند تھا۔

پردہ جو میں نے ڈالا

یہ سنانے سے پہلے کہ میں نے شاہینہ کے ساتھ اس اقبالی بیان کے بعد کیا سلوک کیا، آپ کی دلچسپی کے واسطے وہ خبر سناتا ہوں جو پڑھ کر مجھ کو یہ واردات یاد آ گئی تھی...... میں نے ستمبر 1995ء کے آخر میں امریکہ کے ہفتہ وار رسالے ''ٹائم'' میں یہ خبر پڑھی کہ

فلپائن کی ایک مسلمان لڑکی سارہ ابوظہبی ملازمت کے لئے چلی گئی۔ لڑکی کی عمر پندرہ اور سولہ سال کے درمیان ہے۔ وہ 1994ء کے مئی کے مہینے میں وہاں پہنچی اور اس کو ایک متمول آدمی محمد بلوشی کے گھر ملازمت مل گئی۔ اتنی کم عمر لڑکی یا لڑکے کو ویزہ نہیں ملا کرتا لیکن سارہ نے اپنی عمر 28 سال لکھوائی تھی۔

سارہ جس شخص کے گھر ملازم رکھی گئی اس شخص کی عمر 85 برس تھی اس نے ایک دو ہفتوں بعد ہی کم سن سارہ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے اور سارہ اس سے بچتی رہی۔ آخر ایک روز اس شخص محمد بلوشی نے سارہ کو کسی کام سے اپنے بیڈروم میں بلایا اور اس کو پکڑ کر اپنے بیڈ پر گرا لیا اور خنجر نکال کر اس کی نوک سارہ کی شہ رگ پر رکھ دی۔ سارہ کی کہانی اس وجہ سے دردناک بنتی ہے کہ اس کا باپ مر چکا ہے اور باقی بہن بھائی اس سے چھوٹے ہیں اور گھر میں غربت ہے۔ سارہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو غربت کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے ابوظہبی گئی تھی۔

جب اس کے آقا نے اس کی شہ رگ پر خنجر کی نوک رکھی تو وہ ڈر گئی۔ وہ اپنے یتیم بہن بھائیوں کے واسطے زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اس کے آقا نے زبردستی اس کی آبروریزی کی۔ سارہ جب اٹھی تو دیکھا کہ جس خنجر کی نوک اس کی شہ رگ پر رکھی گئی تھی وہ خنجر فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اُس کا 85 سالہ بوڑھا آقا ابھی پلنگ سے اٹھا نہیں تھا۔ سارہ نے خنجر اٹھا لیا اور اپنے آقا کے جسم میں 34 بار اتارا اور اُس کو مار ڈالا اور اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

پہلے اس کو سات سال سزائے قید دی گئی۔ فلپائن کے سفارت خانے نے شور شرابہ کیا تو ابوظہبی کے حکمران شیخ بن زائد نے مقدمہ دوسرے ججوں کو دے دیا۔ پہلے ججوں نے کہا تھا کہ لڑکی کی آبروریزی ہوئی ہے اس واسطے اس کو تھوڑی سزا ملنی چاہئے لیکن دوسرے ججوں نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ لڑکی کی آبروریزی نہیں ہوئی اور اس طرح اس کو سزائے موت دے دی۔ یہ خبر یورپ اور دیگر ممالک کے اخباروں میں شائع ہوئی تو فلپائن کی حکومت کے علاوہ تمام حکومتوں نے ابوظہبی کے حکمران کو لکھا کہ وہ ایک معصوم لڑکی پر یہ ظلم نہ ہونے دے۔ حقوقِ انسانی کی تنظیمیں بھی چلا اٹھیں۔ سی این این پر بھی یہ پروگرام دکھایا گیا۔ آخر سارہ کی سزائے موت تو ختم کر دی گئی لیکن اس کو اتنا زیادہ جرمانہ کیا گیا جو وہ کبھی بھی نہیں دے سکے گی لیکن فلپائن کی حکومت اس کی پوری مدد کر رہی ہے۔

یہ تو ایک الگ داستان ہے۔ میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا۔ وہ یہ کہ امریکہ اور یورپ کے پرچوں نے اس واقعہ کو اتنا اچھالا ہے کہ اسلام کو بدنام کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایشیا کے ملکوں کی لڑکیاں مشرقِ وسطیٰ میں ملازمت کے واسطے جاتی ہیں اور ان کو وہاں شیخوں اور امیروں کے گھروں میں ملازمت مل جاتی ہے لیکن ان کے ساتھ سلوک یہی ہوتا ہے جو سارہ کے ساتھ ہُوا۔ عیسائی پرچے یہ لکھ رہے ہیں کہ یہ اسلامی قانون ہے جس میں کمزور کو انصاف نہیں ملتا۔

میں معافی چاہتا ہوں کہ کہانی کو روک کر کسی اور طرف نکل گیا ہوں لیکن میں نے سارہ کا حادثہ بڑی دردمندی اور دلچسپی سے پڑھا تھا۔ سارہ نے مجھ کو شاہینہ کی یاد دلا دی۔

خود ہی دیکھ لیں کہ سارہ اور شاہینہ کا کیس ایک جیسا ہے یا نہیں۔ آج جس طرح ہر ملک کے حکمران کے دل میں سارہ کی ہمدردی پیدا ہو گئی ہے اور حقوقِ انسانی کی عالمی تنظیم نے ہمدردی کے عملی اظہار کے واسطے اپنا وفد ابوظہبی کے حکمران کے پاس بھیجا ہے بالکل ایسی ہی جذباتی حالت میری اُس وقت ہوئی تھی جب شاہینہ نے اپنا اقبالی بیان دیا تھا۔ آج میں جس کو بھی سارہ کی خبر سناتا ہوں وہ تڑپ اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس معصوم لڑکی نے اپنی آبرو کا جو انتقام لیا ہے وہ ٹھیک لیا ہے ار یہ اس کا جائز حق تھا۔

''شاہینہ!'' ــــ میں نے آدھی صدی پہلے شاہینہ سے کہا تھا ــــ ''تم نے مجھ کو جو بیان دیا ہے، اس کو بھول جاؤ۔ کسی کے ساتھ اشارتاً بھی بات نہ کرنا کہ تم نے مجھ کو یہ بیان دیا تھا۔ تم کو کوئی سزا نہیں ملے گی''۔

شاہینہ مجھ کو حیرت زدگی کے عالم میں دیکھ رہی تھی اور اس کا منہ کھلتا جا رہا تھا۔ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کو میں ایک انسان کا قتل بخش دوں گا۔ بخشنے نہ بخشنے والا تو اللہ ہے لیکن میرے اختیار میں جو تھا وہ میں نے کیا۔ شاہینہ کو اچھی طرح سمجھا دیا اور اس کو کہا کہ اپنے جذبات پر قابو رکھے اور پھر اس کے ذہن میں یہ ڈالا کہ اس نے جس طرح اپنی بے عزتی کا انتقام لیا ہے یہ بالکل جائز ہے۔ میں نے اس کو یہ بھی کہا کہ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو مہینوں بعد میں اس کو طلاق دلوا دوں گا۔

میں آج پہلی بار انکشاف کر رہا ہوں کہ میں نے ایک قاتل پر پردہ ڈال دیا تھا۔ انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں یہ کام تقریباً ناممکن تھا لیکن بعض وارداتوں کے کیس عدم پتہ قرار دے دیئے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی ایسا ٹھوس جواز لکھنا پڑتا تھا جو اوپر

والے افسروں کو قائل کر سکے۔ میں نے اپنی نوکری کو خطرے میں ڈال کر اس کیس کو عدم پتہ قرار دینے کا فیصلہ کر لیا۔ شاہینہ کو میں نے گھر بھیج دیا اور اس وقت کے بعد تفتیش کو لٹکانا اور ویسے ہی گھسیٹنا شروع کر دیا۔ کبھی میں حامد کو تھانے بلا لیتا اور کبھی شاہینہ کو۔ حامد کے ساتھ میری کچھ اور باتیں ہوتی تھیں لیکن شاہینہ کو میں حوصلہ افزائی کے واسطے بلاتا تھا۔ اُس کے چہرے پر رونق واپس آ گئی تھی۔

چار مہینے گزر گئے تو میں نے ڈی ایس پی کے سامنے کیس رکھ کر کچھ جواز پیش کئے اور درخواست کی اس کیس کو عدم پتہ قرار دینے کی اجازت دی جائے۔ میں نے مقتول اور اس کے خاندان کی اخلاقی حالت ڈی ایس پی کو بتائی تھی اور کہا تھا کہ یہ لوگ دوسروں کی عورتوں کے ساتھ بدمعاشیاں کرنے والے لوگ ہیں اور کسی نے انتقاماً ان کے ساتھ یہ واردات کر دی ہے۔

یہ میرا ذاتی معاملہ سمجھیں یا یہ پولیس کے محکمے کا مسئلہ کہہ لیں، اس میں آپ کے واسطے کوئی دلچسپی نہیں۔ آخر کار ہُوا یہ کہ یہ کیس عدم پتہ قرار دے کر اس کی فائل ایسی ہی دوسری فائلوں کے انبار میں رکھ دی۔

اس کے بعد میں نے ایک روز شاہینہ کو تھانے طلب کیا۔ اس کا خاوند یہی سمجھتا رہا کہ اس کو تفتیش کے سلسلے میں بلایا گیا ہے۔ میں نے شاہینہ کو کہا کہ وہ اپنے والد صاحب کو خط لکھے کہ کسی روز میرے پاس آ جائیں۔

آٹھ دس دنوں بعد شاہینہ کا باپ آ گیا۔ میں نے اس کو کہا کہ وہ عدالت میں درخواست دے دے کہ وہ اپنی بیٹی کی طلاق چاہتا ہے۔ میں نے اُس کو کہا کہ سول جج تک پہنچنا اور اس کو منوانا میرا کام ہے اور وہ کچھ بھی نہ سوچے اور بے دھڑک درخواست دے۔ ضلعے کی سول کورٹ میں میری اچھی خاصی پہنچ تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ چار پانچ مہینوں بعد شاہینہ کو طلاق مل گئی اور وہ اپنے گھر چلی گئی۔ اس کے بعد مجھ کو کچھ پتہ نہیں کہ شاہینہ نے دوسری شادی کی تھی یا نہیں۔

* * *

سوہنی مہینوال اور قاضی

یہ واردات پاکستان سے پہلے کی ہے اور یہ اُس علاقے کی واردات ہے جو آج کل پاکستان کا وسطی علاقہ ہے۔ یہ بات مجھ کو اکثر کہنی پڑتی ہے جواب پھر کہوں گا کہ علاقہ پاکستانی ہونے کی وجہ سے میں کسی جگہ کا اور کسی مرد یا عورت کا صحیح نام نہیں لکھوں گا، فرضی نام استعمال کروں گا تا کہ ان خاندانوں کی نشاندہی نہ ہو سکے۔

وہ درمیانہ سا ایک قصبہ ہُوا کرتا تھا جس کا میں ایس ایچ او تھا۔ اس کے ارد گرد دور دور تک پھیلی ہوئی زرعی اراضی ہُوا کرتی تھی مگر اب وہ ہری بھری کھیتیاں دور ہٹ گئی ہیں اور تھوڑی بھی رہ گئی ہیں اس واسطے کہ آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور کھیتوں کی جگہ مکان کھڑے ہو گئے ہیں اور کوٹھیاں بھی بن گئی ہیں۔ اس کو لوگ اب شہر کہتے ہیں۔ چار پانچ بڑی فیکٹریاں بھی چل رہی ہیں۔ میں جس وقت کی کہانی سنانے لگا ہوں اُس وقت آبادی تھوڑی تھی اور فیکٹری ایک بھی نہیں تھی۔

زرعی اراضی کے مالک آٹھ دس مسلمان خاندان تھے جن کی مالی حیثیت بہت اچھی تھی اور ان لوگوں کے گھروں میں تعلیم بھی تھی۔ یہ مالکان خود ہل کدال نہیں چلاتے تھے، ان کے نوکر اور مزارعے کھیتی باڑی کے سارے کام کرتے تھے۔ ان میں سے تین چار کا آڑھت کا کاروبار بھی تھا۔

اسی کلاس کے تین آدمی میرے پاس تھانے میں آئے۔ وقت دن کا تقریباً ایک بجے کا تھا۔ آندھی بڑی زور شور سے چلی تھی اور اب بارش برسنے لگی تھی اور ہوا آندھی کی رفتار سے تیز چل رہی تھی۔ ایسے خراب موسم میں ان کا آنا یہی بتاتا تھا کہ یہ لوگ خیریت کی کوئی خبر نہیں لائے۔ انہوں نے چھتریاں بند کر کے برآمدے میں رکھیں اور میرے دفتر میں داخل ہوئے۔

انہوں نے خبر یہ سنائی کہ ان کی ایک عورت گھر میں مری پڑی ہے۔ میں نے ان کو

بٹھا کر کچھ باتیں پوچھیں تو یہ رپورٹ اس طرح بنی کہ یہ عورت جس کی عمر تیس اور پینتیس سال کے درمیان بتائی گئی تھی، گھر میں اکیلی تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ ایک آٹھ سال کا اور دوسرا دس سال کا تھا۔ وہ سکول گئے ہوئے تھے۔ اس کا خاوند اپنے کام کاج کے واسطے باہر نکلا ہُوا تھا۔ وہ کھانے کے واسطے گھر آیا تھا تو اپنی بیوی کی لاش فرش پر پڑی ہوئی دیکھی۔

ان تین آدمیوں میں سے ایک اس عورت کا خاوند تھا، دوسرا عورت کا بھائی تھا اور تیسرا خاوند کا بڑا بھائی تھا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ لاش کے گلے کے گرد دوپٹہ لپٹا ہُوا ہے اور دوپٹے کے دونوں طرف سے عورت نے مری ہوئی حالت میں بھی دوپٹہ مٹھیوں میں پکڑا ہُوا ہے۔

میں نے اس وقوعہ کی بابت سوال پوچھنے شروع کر دیئے اور بہت ہی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی پوچھیں۔ یہ اس واسطے پوچھیں کہ دو ہی مہینے پہلے ایک نوجوان لڑکی نے بالکل اسی طرح خودکشی کر لی تھی۔ میں موقعہ پر گیا تو لاش کی یہی حالت دیکھی کہ دوپٹہ اس کے گلے کے اردگرد لپٹا ہُوا تھا اور دونوں طرف سے دوپٹہ لڑکی کی مٹھیوں میں پکڑا ہُوا تھا۔ میں نے اُس واردات کو سامنے رکھ کر ان تینوں سے بہت ساری باتیں پوچھیں۔

''آپ کو یاد ہو گا'' ــــ میں نے کہا ــــ ''دو مہینے پہلے ایک لڑکی نے اسی طرح خودکُشی کی تھی''۔

''وہ ہمارے ہی محلے کی لڑکی تھی'' ــــ خاوند نے کہا ــــ ''وہ ہمارے محلے ہی کی نہیں تھی بلکہ ان کا مکان ہمارے مکان کے ساتھ ہے، دیوار سانجھی ہے اور چھتیں ملی ہوئی ہیں۔ میری بیوی کی لاش بالکل اسی پوزیشن میں ہے''۔

''آپ کا اپنا خیال کیا ہے'' ــــ میں نے پوچھا ــــ ''کیا اس کو بھی آپ خودکُشی کہیں گے؟''

''ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے جناب!'' ــــ خاوند نے کہا ــــ ''خودکشی کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ میرے بھائی ہیں اور یہ صاحب میری بیوی کے بھائی ہیں۔ ان سے پوچھ لیں، میری بیوی کو ایسی کوئی پریشانی نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ کو ہلاک کر دیتی''۔

''باقی رہی بات دشمنی کی'' ــــ دوسرے دونوں میں سے ایک نے کہا ــــ ''ہماری کسی کے ساتھ ایسی دشمنی نہیں کہ نوبت قتل تک پہنچ جاتی۔ نہ زمینوں کا کسی کے ساتھ تنازعہ نہ کاروبار میں کسی کے ساتھ کوئی کھٹ پٹ ہے''۔

میرے دماغ میں خودکشی کا ہی خیال بیٹھ گیا، وہ اس واسطے کہ اتنے قریبی پڑوس میں ایک لڑکی نے اپنے دوپٹے سے اپنے آپ کو پھانسی دی تھی۔ اس عورت کا بھی کوئی سنگین مسئلہ ہوگا اور اس نے خودکشی کا یہی طریقہ بہتر سمجھا اور کامیاب ہوگئی۔ یہ تو یہ تینوں کہہ رہے تھے کہ مرنے والی کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ان کو تو اپنا پردہ رکھنا ہی تھا۔ مجھ کو جو کچھ بھی معلوم کرنا تھا وہ ان تینوں سے ہی نہیں کرنا تھا بلکہ میرے پاس اور بھی ذریعے تھے اور مخبری کا یہ نظام اتنا اچھا تھا کہ زمین میں دفن کی ہوئی بات بھی باہر آجاتی اور مجھ تک پہنچ جاتی تھی۔ پہلے تو جا کر لاش کو دیکھنا ضروری تھا۔

میں نے جو کاغذی کارروائی کرنی تھی وہ کی اور تھانے سے اپنی روانگی تحریر کی اور ان تینوں کے ساتھ چل پڑا۔ اس دن کی بارش مجھ کو آج بھی یاد ہے۔ بڑی ہی موسلا دھار تھی اور جھکڑ بڑے ہی تیز چل رہے تھے لیکن اُن وقتوں میں پولیس کو اپنی ڈیوٹی سے ایسے طوفان روک نہیں سکتے تھے...... میں موقعۂ واردات پر جا رہا تھا۔ ایک عام انسان کی حیثیت سے مجھ کو افسوس تھا کہ پہلے ایک نوجوان لڑکی نے خودکشی کر لی تھی اور اب ایک عورت نے خودکشی کر لی ہے جس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے لیکن اس وقت میری حیثیت ایک پولیس افسر کی تھی جس نے تفتیش کرنی تھی اور یہ پولیس افسر کچھ خوش تھا کہ چلو یہ قتل کی واردات نہیں، خودکشی ہے اور یہ کیس آج ہی ختم ہو جائے گا۔

میں اس عورت کے گھر میں داخل ہُوا۔ بڑا اچھا گھر تھا۔ گھر کی بناوٹ اور سامان کو دیکھ کر پتہ لگتا تھا کہ یہ لوگ اس وقت کی اپر مڈل کلاس کے لوگ ہیں۔ مجھ کو ایک کمرے میں لے جایا گیا جس میں فرش پر عورت کی لاش پیٹھ کے بل پڑی ہوئی تھی۔

میں نے پاس بیٹھ کر لاش کو دیکھا۔ دوپٹہ ذرا مروڑا ہُوا اس کی گردن کے گرد لپٹا ہُوا تھا۔ دوپٹے کے دو رول گردن کے گرد لپٹے ہوئے تھے۔ دائیں اور بائیں کندھوں کے قریب سے عورت نے مری ہوئی حالت میں بھی دوپٹے کو اپنے ہاتھوں میں جکڑا ہُوا تھا۔ دیکھنے والا ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ اس عورت نے دوپٹہ اپنے گلے کے اردگرد لپیٹا اور دائیں بائیں زور سے کھینچ کر اپنے آپ کو پھانسی دے دی۔

میں اپنے تھانیداری تجربے کی بات بتاتا ہوں۔ اس طریقے سے خودکشی کرنے والے عام طور پر کامیاب نہیں ہُوا کرتے۔ یہ اس واسطے کامیاب نہیں ہوتے کہ جب انسان کا سانس رکتا ہے تو وہ بڑی زور زور سے تڑپتا ہے۔ تڑپنے کے دوران ہاتھ ڈھیلے پڑ

جاتے ہیں اور گلے کا پھندا اتنا ڈھیلا ہو جاتا ہے کہ سانس اندر باہر آنے جانے لگتا ہے۔ اس طریقے سے بعض لوگ خودکشی میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ اس واسطے ہوتا ہے کہ جب خودکشی کرنے والا دوپٹے کو یا رسی کو دائیں بائیں کھینچتا ہے تو سانس رک جاتا ہے اور اتنی اذیت ہوتی ہے کہ ہاتھ ڈھیلے ہونے کی بجائے ان کی پکڑ اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ شدید درد کی حالت میں انسان دانت پیستا ہے اور اپنی مٹھیاں زور سے بھینچ لیتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر پھندا ڈھیلا ہونے کی بجائے اور تنگ ہو جاتا ہے اور خودکشی کی کوشش کامیاب ہو جاتی ہے۔

اس عورت کے معاملے میں ایسے ہی ہُوا اور جس لڑکی نے دو مہینے پہلے اسی طرح خودکشی کی تھی وہ بھی ایسے ہی ہوا۔ دونوں کی مٹھی کی پکڑ بڑی سخت تھی اور ہاتھ اور بازو وہیں اکڑ گئے لیکن اس لڑکی اور اس عورت کے کیس میں ایک فرق نظر آیا۔ لڑکی کے بازوؤں میں چوڑیاں تھیں جو بالکل صحیح سلامت تھیں۔ اس کے کپڑے بھی ٹھیک ٹھاک تھے اور چہرے پر یا جسم پر کسی بھی تشدد کا نشان نہیں تھا۔ میں نے بڑی ہی گہری نظر سے معائنہ کیا اور جائزہ لیا تھا۔ خودکشی کے سوا کوئی اور وجہ موت کی نظر نہیں آتی تھی۔ خود گھر والوں نے کہہ دیا تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے لیکن اس عورت کی لاش کے دائیں بائیں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ مجھ کو آج بھی یاد ہے کہ ایک کلائی میں صرف ایک چوڑی رہ گئی تھی اور دوسری کلائی میں دو چوڑیاں تھیں۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے تڑپتے وقت اس کی چوڑیاں ٹوٹی ہوں لیکن اپنی عقل اور اپنا تجربہ استعمال کیا تو یہ خیال آیا کہ اتنا زیادہ فرش پر گری ہوئی حالت میں یہ عورت تڑپتی تو ہاتھ ڈھیلے ہو سکتے تھے پھر یہ پھندے سے مر نہیں سکتی تھی۔

اگر یہ واردات آج یعنی موجودہ زمانے میں ہوئی ہوتی تو پولیس تھانے میں بیٹھے بیٹھے فیصلہ سنا دیتی کہ مرنے والی نے خودکشی کی ہے۔ اگر تھانیدار اپنا فرض بادلِ نخواستہ پورا کرنے کے واسطے موقعہ پر چلا بھی جاتا تو فیصلہ دے کر کاغذات میں لکھ دیتا کہ یہ خودکشی کی واردات ہے۔ گھر والے اگر قتل کا شک بتاتے اور زور دیتے کہ یہ خودکشی نہیں قتل ہے تو تھانیدار کسی اچھے یا بُرے طریقے سے گھر والوں کو ٹرخا دیتا لیکن وہ زمانہ کچھ اور تھا۔ انگریزوں کی حکومت تھی جس میں لاقانونیت نہیں تھی بلکہ قانون کا راج تھا۔ اُس وقت قانون پولیس سے نہیں ڈرتا تھا بلکہ پولیس قانون سے ڈرتی تھی۔

دبوچنے کی کوشش، عورت کی مزاحمت

میں نے جب چوڑیوں کے ٹکڑے دیکھے تو یہ ضرورت محسوس کی کہ لاش کا بغور معائنہ کیا جائے۔ میں نے لاش کو سر سے پاؤں تک دیکھنا شروع کیا۔ ایک یہ چیز نظر آئی کہ گردن کے ایک طرف جبڑے سے ذرا نیچے ایک خراش تھی جو لمبی نہیں تھی۔ اس پر خون جما ہوا تھا۔ اس سے میں یہ سمجھا کہ اس عورت نے اپنی گردن سے پھندا ڈھیلا کرنے کے واسطے انگلیاں گردن اور پھندے کے درمیان ڈالنے کی کوشش کی تو اس کا ناخن جبڑے کے ذرا نیچے کھال میں اُتر گیا۔ میں نے عورت کا اس طرف والا ہاتھ دیکھا۔ عورت کے ناخن بڑھے ہوئے تھے۔

عورت کی قمیض کا گلا زیادہ نیچے نہیں تھا، کسی حد تک مردانہ قمیضوں جیسا بغیر کالر کے گلا تھا۔ اس قمیض کے بٹن جہاں نیچے ختم ہوتے تھے وہاں سے قمیض تین ساڑھے تین انچ لمبائی میں پھٹی ہوئی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ یہ کچھ دیر پہلے پھٹی ہے۔ یہ پرانی پھٹی ہوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ایسا ہوتا تو یہ عورت وہاں سلائی کر لیتی۔

ایک کلائی پر چھوٹی سی خراش تھی اور اس پر بھی خون جما ہوا تھا۔ یہاں ٹوٹی ہوئی چوڑی کا سرا لگا ہوگا۔ پہنے ہوئے کپڑوں کی حالت دیکھ کر یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس عورت پر کسی نے حملہ کیا اور اس کو دبوچنے جکڑنے کی کوشش کی اور عورت نے مزاحمت کی۔ عورت کی عزت پر حملہ نہیں ہوا تھا، جدوجہد کے آثار بڑے صاف تھے۔ میں نے انہیں اپنا فیصلہ سنا دیا کہ یہ قتل کی واردات ہے۔

اُس عورت کے خاوند نے تھانے میں کہا تھا کہ خودکشی کی کوئی وجہ نہیں تھی اور کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں تھی کہ نوبت قتل تک آتی۔ اب خاوند نے اور خاوند کے بڑے بھائی نے یہی الفاظ ذرا زوردار طریقے سے کہے۔ مجھ کو امید تھی کہ عورت کا بھائی قتل کا ہی شک کرے گا لیکن اس نے بھی ذرا ڈھیلی زبان میں ان دونوں کی تائید کر دی۔ میں نے سوچا یہ تھا کہ قاتل خاوند بھی ہو سکتا ہے۔

میرے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور چار کانسٹیبل تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ وہ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے لے جانے کا بندوبست کرے۔ اس قصبے میں ایک سرکاری ہسپتال تھا جس کا ڈاکٹر پوسٹ مارٹم کیا کرتا تھا۔ کوئی پیچیدگی ہوتی تو پھر بات لاہور تک پہنچتی تھی......

میں نے تفتیش وہیں بیٹھ کر کرنی تھی۔ میرے کہنے پر واردات والے گھر سے چار پانچ گھر آگے اسی گلی میں ایک مکان کی بیٹھک میں میرے واسطے بیٹھنے کا انتظام فوراً کر دیا گیا۔

یہ ذہن میں رکھیں کہ مقتولہ کے چہرے پر کرب اور اذیت کا بڑا گہرا تاثر تھا۔ یہ تو ہونا ہی تھا اس واسطے کہ اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ تکلیف اور درد کے اس تاثر کے باوجود مقتولہ کے چہرے کے نقش بتاتے تھے کہ خوبصورت عورت تھی۔ اب تو اس کے چہرے پر موت کا رنگ آ گیا تھا پھر بھی اس کے قدرتی رنگ کا اندازہ ہوتا تھا۔ یہ چہرہ یقیناً دلکش تھا اور گردن لمبوتری تھی۔

میں نے سب سے پہلے اس کے خاوند کو اپنے پاس بٹھایا۔ دونوں امکانات سامنے رکھے......خودکشی بھی اور قتل بھی...... میں نے معلوم یہ کرنا تھا کہ مقتولہ کی ازدواجی زندگی خوش و خرم تھی یا کوئی گڑبڑ والی بات تھی۔ مجھ کو یہ بھی معلوم تھا کہ خاوند یہی ثابت کرے گا کہ وہ اپنی بیوی کو ہر لحاظ سے خوش رکھتا تھا اور اس کو کوئی شکایت نہیں تھی اور وہ کسی پریشانی میں مبتلا بھی نہیں تھی۔

''سراج بھائی!''—— میں نے اس کو کہا—— ''میں آپ سے بہت ساری باتیں پوچھوں گا۔ جواب دینے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ یہ پہلی واردات نہیں جس کی میں تفتیش کر رہا ہوں۔ آپ جھوٹ بولیں گے تو آپ کا چہرہ مجھ کو بتا دے گا کہ یہ جھوٹ ہے۔ پھر یہ بھی سوچ لیں کہ میرے پاس مخبری کے ایسے ایسے ذریعے موجود ہیں جو آپ کے گھر کے اندر کی ہر ایک بات جانتے ہیں۔ کسی نہ کسی مقام پر آپ کا جھوٹ پکڑا جائے گا۔ پھر آپ کے ساتھ میرا رویہ ایسا ہوگا جس کو آپ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آپ ہر بات بالکل صحیح مجھ کو بتا دیں اور رازداری کا فائدہ مجھ سے لیں؟''

قدرتی بات تھی کہ اس نے سچ بولنے کا وعدہ کیا۔ میں نے اپنے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ جواب دیتا رہا اور اس کا ہر جواب یہی ظاہر کرتا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو جیسے تخت پر بٹھا رکھا تھا۔ مثلاً اس نے کہا کہ بیوی کو اس نے پوری آزادی دی ہوئی تھی اور بیوی ہنس مکھ، زندہ دل اور ملنسار تھی۔ میں نے جرح شروع کی تو وہ کچھ پریشان ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ مجھ کو اس پر اعتبار نہیں آ رہا۔

''ایک کام کریں جناب!''—— اس نے کہا—— ''میری بیوی کا بھائی یہیں ہے اور اس کے ماں باپ بھی میرے گھر آ گئے ہیں اور میرے پڑوسی بھی موجود ہیں جن کے ساتھ

میری دیواریں اور چھتیں ملی ہوئی ہیں۔ آپ ان سب سے الگ الگ پوچھ لیں کہ میرے گھر میں میری بیوی کی زندگی کس طرح گزر رہی تھی۔ میری باتوں پر آپ کو یقین آنا نہیں چاہیئے‘‘۔

صرف اس کے رشتہ داروں سے ہی نہیں بلکہ میں نے کئی اور لوگوں سے یہ باتیں پوچھنی تھیں۔ اس خاوند نے بات اس پر ختم کی کہ اس کی بیوی کو گھر میں کوئی تنگی اور کوئی پریشانی نہیں تھی۔

سراج کا بڑا بھائی بھی اس کے ساتھ تھانے رپورٹ لکھوانے آیا تھا۔ میں اس کو بلانا چاہتا تھا لیکن معلوم ہُوا کہ وہ لاش کے ساتھ ہسپتال چلا گیا ہے۔ میں نے مقتولہ کے بھائی بلا لیا اور سراج کو بھیج دیا۔ مجھ کو توقع تھی کہ مقتولہ کا یہ بھائی کچھ تو مخالفانہ بات کرے گا لیکن وہ بھی سراج کی تائید ہی کرتا جا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ سراج بہت ہی بھلا آدمی ہے اور مقتولہ کے اشاروں پر چلتا تھا۔ اس بھائی نے اپنی بہن کو کبھی پریشانی کی حالت میں نہیں دیکھا تھا اور بہن نے کبھی اپنے خاوند کی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ میں نے اس شخص پر بہت بہت جرح کی لیکن کوئی ایسی بات اس کی زبان پر نہ آئی جو مجھ کو تفتیش کے کسی راستے پر ڈال دیتی۔ میں نے اس کو بھی اٹھا دیا اور سوچنے لگا کہ اب کس کے ساتھ بات کروں۔ مقتولہ کی ماں کا خیال آ گیا۔ یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے مجھ کو کوئی نہ کوئی اشارہ مل سکتا تھا۔ ایک تو وہ ماں تھی اور دوسرے عورت تھی۔ عورت ذات جب دکھی ہوتی ہے تو فالتو باتیں بھی کر دیتی ہے۔ میں نے اس وقت مقتولہ کی ماں کو بلوایا اور وہ آ گئی۔

میری توقع کے مطابق وہ روتی ہوئی آئی اور میں نے اس کو بٹھا لیا۔ اس کی بیٹی کی موت پر اظہارِ افسوس کیا اور دو چار کلمے ہمدردی کے کہے۔ اس کے آنسوؤں کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ میں نے اس کو کہا کہ وہ مجھ کو ذرا سا اشارہ دے دے کہ اس کی بیٹی نے خودکشی کی ہے تو اس کو کس نے اتنا دکھ پہنچایا تھا اور اگر وہ سمجھتی ہے کہ اس کی بیٹی کو قتل کیا گیا ہے تو قاتل کون ہو سکتا ہے تو میں اس مرد یا عورت کو ابھی گرفتار کر کے ایک ہفتے کے اندر اندر پھانسی پر لٹکا دوں گا۔

’’میری بیٹی خودکشی نہیں کر سکتی تھی‘‘ —— ماں نے کہا —— ’’خاوند نے تو اس کو گھر کی ملکہ بنا کر رکھا ہُوا تھا۔ گھر کی طرف سے یا خاوند کی طرف سے اس کو کوئی دُکھ نہیں تھا، کوئی تکلیف اور کوئی شکایت نہیں تھی۔ دُکھ اور تکلیف کا خطرہ ساس سے ہوتا ہے، سسر سے ہوتا

ہے یا ان کی اولاد سے ہوتا ہے لیکن میری بیٹی کی ساس بھی نہیں تھی، سسر بھی نہیں تھا، گھر میں اس کا اپنا ہی راج تھا۔ خاوند تو اس کے آگے بچھا بچھا رہتا تھا۔ خودکشی تو بندہ اس وقت کرتا ہے جب دنیا کے بندوں سے وہ تنگ آ جاتا ہے اور خدا کی طرف سے بھی مایوس ہو جاتا ہے۔ میری بیٹی کو تو پتہ ہی نہیں تھا کہ اداسی اور غمی کیا ہوتی ہے۔ خدا کی قسم سراج اتنا اچھا داماد تھا کہ میری ایک اور بیٹی ہوتی تو میں یہ بیٹی بھی سراج کے ساتھ بیاہ دیتی‘‘۔

اس رپورٹ کو میں سو فیصد صحیح اور مصدقہ سمجھتا تھا۔ یہ اس واسطے سمجھتا تھا کہ شادی شدہ بیٹیوں کی مائیں ان کے خاوندوں اور خاوندوں کے جملہ رشتہ داروں کو برا ہی کہا کرتی ہیں اور ان کے واسطے خیر کا ایک کلمہ بھی نہیں کہتیں۔ اپنی بیٹیوں کو وہ فرشتوں کے روپ میں پیش کیا کرتی ہیں اور ان کو مظلوم ہی ثابت کرتی رہتی ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ مبالغہ آرائی اور سفید جھوٹ ہوتا ہے بلکہ یہ جھوٹ بولنے والی عورتیں خود بھی ایسی کہانیوں کو جھوٹ سمجھتی ہیں لیکن یہ ہمارے معاشرے کا ایک بڑا پکا رواج ہے اسی واسطے تو میں حیران ہو گیا تھا کہ یہ عورت عام رواج کے الٹ بات کر رہی تھی اور مجھ کو یہ سچ جھوٹ معلوم ہو رہا تھا لیکن یہی سچ تھا جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ لڑکی کی ماں یہ بیان دے رہی تھی۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ خودکشی کی واردات نہیں۔

پھر میں نے اس ماں کو یہ خیال دماغ میں رکھ کر کریدنا اور کھنگالنا شروع کر دیا کہ یہ قتل کی واردات ہے اور اتنی دشمنی مقتولہ کی اپنی یا اس کے خاوند کی کس کے ساتھ تھی جو قتل کا باعث بنی۔ ماں تو مان ہی نہیں رہی تھی کہ اس کی بیٹی قتل ہوئی ہے۔ وہ کہتی تھی کہ اس کی بیٹی ہنستی تھی اور دوسروں کو ہنساتی تھی۔

’’کوئی ایسی بات ہوتی تو بیٹی مجھ کو ضرور بتاتی‘‘ —— ماں نے کہا —— ’’ماں بیٹی ایک دوسرے کے راز جانتی ہیں اور آپس میں دل کی باتیں کیا کرتی ہیں...... مجھ سے پوچھنے کی بجائے آپ اس کے پڑوسیوں سے اور سارے محلے کے گھر گھر سے پوچھ لیں کہ میری بیٹی کا ان کے ساتھ برتاؤ کیا تھا۔ ہر کوئی میری بیٹی کا سجن ہی ہو گا دشمن ایک بھی نہیں ملے گا‘‘۔

’’کیا آپ اپنی بیٹی سے ملتی ملاتی رہتی تھیں؟‘‘ —— میں نے پوچھا۔

’’ملنا ملانا تو لگا ہی رہتا تھا‘‘ —— ماں نے جواب دیا —— ’’میرا گھر بیٹی کے گھر سے دور تو نہیں، اسی گلی کے آخر میں میرا گھر ہے‘‘۔

یہ بات میں نے اس واسطے پوچھی تھی کہ شاید ماں کچھ لمبے وقفے کے بعد بیٹی سے ملتی

ہوگی اور اس کو بیٹی کے گھر کی زیادہ باتوں کا علم نہیں ہوگا۔ اس کے جواب سے میرا یہ شک رفع ہوگیا۔ ماں نے کہا کہ وہ ایک روز پہلے بیٹی کے ہاں آئی تھی اور بیٹی خوش وخرم تھی۔

یہ کوئی پاکیزہ محبت نہیں تھی

ماں نے تو مجھ کو مایوس کر دیا۔ میں نے اس سے اس کے اپنے اور مقتولہ کے خاوند کے قریبی رشتہ داروں کے نام معلوم کئے۔ ماں کو فارغ کر دیا اور نمبردار کو بلا کر چار نام بتائے اور کہا کہ ان کو یہاں لے آئے۔ ان چاروں میں دو رشتہ دار مقتولہ کے تھے اور دو اس کے خاوند کے۔ نمبردار نے ان کو بلا دیا۔

میں نے ان چاروں کو باری باری اپنے پاس بٹھا کر پوچھ گچھ کی۔ مجھ کو امید تھی کہ کوئی نہ کوئی نئی بات سامنے آ جائے گی لیکن وہ حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ اس عورت نے خودکشی کی ہے یا قتل ہوئی ہے۔ وہ چاروں کہتے تھے کہ کوئی ایسی وجہ نہیں تھی، البتہ اندر ہی اندر رازداری میں کوئی وجہ تھی تو اس سے وہ واقف نہیں تھے۔

صرف ایک نے ذرا رازداری کے لہجے میں کہا کہ مقتولہ کچھ زیادہ ہی زندہ دل عورت تھی۔ اس کے خاوند کی بابت اس نے یہ رائے دی کہ بیوی کے آگے اتنا جھکا رہتا تھا کہ اُس کو زن مرید کہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ مردوں کے ساتھ بھی مقتولہ اس طرح بے تکلفی سے بات کرتی تھی جس طرح عورتیں عورتوں کے ساتھ کیا کرتی ہیں۔

اس شخص کی بابت میری رائے یہ تھی کہ یہ کچھ زیادہ عقل کی بات کرتا ہے اور پس پردہ باتیں بھی اگر پوری طرح نہیں جانتا تو کچھ اشارے دے سکتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ مقتولہ کے خاوند کے قریبی دوستوں کی بابت اس کی رائے کیا ہے۔

''دراصل جناب! ایک بات زبان پر آتی ہے''—— اس نے کہا—— ''دوست تو ہر کسی کے ہوتے ہیں لیکن سراج کا ایک دوست کچھ مشکوک اخلاق والا ہے اور اس کے ساتھ سراج کی اتنی گہری دوستی ہے کہ اس کی غیر حاضری میں اس کے گھر جاتا اور بہت دیر وہیں رہتا ہے''۔

اس نے اس دوست کا نام بتایا۔ میں اصل نام ظاہر نہیں کروں گا جو میری ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔ اس کو رفاقت لکھوں گا۔ اصلی نام اس سے ملتا جلتا تھا۔ رفاقت کی بابت اس

نے بتایا کہ ان کی برادری کا ہی آدمی ہے۔ خوشحال زمیندار ہے۔ خوبرو آدمی ہے اور اس کی عمر مقتولہ جتنی ہی تھی یعنی تیس سے اوپر پینتیس سے کم۔ اس کی بابت اس نے جو باتیں بتائیں ان سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ رفاقت ایسا شخص ہے جس کو ہم پولیس والے سفید پوش بدمعاش کہا کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ گھٹیا قسم کا بدمعاش یا جرائم پیشہ نہیں لیکن اس کے سارے انداز اور اس کا رویہ بدمعاشوں والا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ شراب پیتے ہیں جوا کھیلتے ہیں لیکن گھٹیا طریقے سے نہیں بلکہ جائز اور باعزت حرکات سمجھ کر اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ان کا یارانہ بدمعاشوں کے ساتھ ہوتا ہے جن کو وہ اپنے تحفظ اور اپنے مفادات کے واسطے استعمال کرتے ہیں۔

رفاقت کی بابت اس نے بتایا کہ وہ ایسا ہی بدمعاش ہے لیکن اس نے ایسی حیثیت بنائی ہوئی ہے کہ لوگ اس کو بدمعاش سمجھ کر بھی عزت دار آدمی سمجھتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب اس سے ڈرتے بھی تھے۔ اس شخص نے رفاقت کی بابت اتنا ہی بتایا کہ مقتولہ کے ہاں آتا جاتا رہتا تھا اور یہ بھی کوئی راز والی بات نہیں تھی کہ مقتولہ کے ساتھ اس کی بے تکلفی تھی۔ سراج تو اس کو اپنا سگا بھائی سمجھتا تھا اور اس پر پورا پورا اعتماد کرتا تھا۔

''میں اس واسطے زیادہ کچھ نہیں جانتا جناب عالی!''—— اس شخص نے کہا—— ''بعض لوگ شک کرتے تھے کہ رفاقت کے مقتولہ کے ساتھ کوئی اور تعلقات تھے لیکن کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ مقتولہ ایسی عورت نہیں تھی، یہ اس کی زندہ دلی تھی کہ رفاقت کے ساتھ بے تکلف رہتی تھی''۔

ان چاروں پر میں نے بہت محنت کی اور خاصا وقت لگایا اور صرف یہ بات معلوم ہوئی اور رفاقت کا نام میرے سامنے آیا۔ رفاقت جیسے اشخاص کو میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ایسے اشخاص آج بھی ہمارے معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سفید پوش بھی ہوتے ہیں، اپنی عزت اور اپنے وقار کو بھی قائم رکھتے ہیں اور پکے بدمعاش بھی ہوتے ہیں۔ آج کل تو اس نسل کے لوگ الیکشن میں کھڑے ہو کر اسمبلیوں میں بھی پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت میں حکومت میں شامل ہو جاتے ہیں۔

''تم ہی کچھ بتاؤ چوہدری!''—— میں نے نمبردار کو کہا—— ''مرنے والی کے اپنے سگے بھی کہتے ہیں کہ نہ خودکشی کی کوئی وجہ تھی نہ قتل کی...... تم یہ بتاؤ کہ اس رفاقت کا اس میاں بیوی کے ساتھ کیا تعلق تھا''۔

میں نمبردار کے ساتھ بات کر ہی رہا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔

ابھی میں نے اور کچھ بھی کہنا تھا لیکن اس کی مسکراہٹ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ نمبردار بہت کچھ جانتا ہے۔ میں چپ ہو گیا اور نمبردار نے اپنی بات شروع کر دی۔ پولیس افسروں کی ان تفتیشی کہانیوں سے آپ کو یہ تو پتہ ہی ہو گا کہ نمبردار اپنے علاقے کے تھانیدار کو اللہ اور رسولؐ کے بعد کا درجہ دیا کرتے تھے۔ اللہ کو ناراض کر کے بھی تھانیدار کو خوش رکھتے تھے۔ ہر گھر کے اندر خانے کی باتیں بھی ان کو معلوم ہوتی تھیں۔ انہوں نے مخبری کا اپنا ایک نظام بنایا ہُوا ہوتا تھا۔ اس طرح یہ تفتیش میں تھانیداروں کے دائیں بازو بن جاتے تھے۔

پھر بھی بتا دیتا ہوں کہ اکثر و بیشتر نمبردار خود بھی پکے بدمعاش ہوتے تھے۔ ان کی مکاری اور عیاری کو بعض تھانیدار بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ کسی ملزم کو بچانے کے واسطے تھانیدار کو چکر دینے پر آتے تو تھانیدار کو چکرا دیا کرتے تھے۔

اب یہ ذہن میں رکھ لیں کہ میں اس قصبے کے جس نمبردار کی بات کر رہا ہوں وہ کوئی دیہاتی اور ان پڑھ آدمی نہیں تھا۔ وہ قصبے کے شہری معاشرے کا آدمی تھا۔ دس جماعتیں پڑھا ہُوا تھا، گھر میں خوشحالی تھی اور اس شخص میں تہذیب اور شائستگی بھی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں استادی اور چالاکی بھی پوری پوری موجود تھی جس کو ہم آسانی سے مکاری اور عیاری کہہ سکتے ہیں۔

''خودکشی کو ذہن سے اتار دیں میری سرکار!'' ـــــ نمبردار نے بات یہاں سے شروع کی ـــــ ''یہ عورت قتل ہوئی ہے۔ میرا اپنا جو شک ہے وہ ابھی میرے دل میں ہی رہنے دیں۔ میں آپ کو اندر خانے کی ایک سٹوری سنا دیتا ہوں اور پھر آپ غور کریں کہ قاتل کون ہو سکتا ہے۔ یہ جو بات میں آپ کو سنانے لگا ہوں یہ اتنے گہرے پردوں کے پیچھے کی بات ہے جس کو شاید ایک دو آدمی ہی جانتے ہوں گے۔ ذہن میں یہ رکھ لیں کہ رفاقت میرا گہرا دوست ہے لیکن جھوٹ نہیں بولوں گا، میری وفاداری آپ کے ساتھ ہے''۔

یہ بات ذہن میں رکھ لیں کہ اُس زمانے میں دیہات میں خاندانی عداوتوں کی بنا پر قتل اور خون خرابے ہوتے تھے لیکن قصبوں اور شہروں میں کبھی مدت بعد شاذ و نادر ہی قتل کی کوئی واردات ہو جاتی تھی۔ آج کل دیہات میں قتل کی وارداتیں بہت کم ہو گئی ہیں۔ قصبوں اور بڑے شہروں میں تو یہ حال ہو گیا ہے کہ بندہ اس طرح مار دیا جاتا ہے جیسے مکھی

ماری جاتی ہے۔ یہ مُک مُکا کی ''برکتیں'' ہیں۔ میں نے اُس وقت سوچا تھا کہ یہ خودکشی ہے یا قتل، اس کی وجہ بہت ہی سنگین ہو گی۔

اب میں آپ کو نمبردار کی سنائی ہوئی سٹوری سناتا ہوں۔ سناؤں گا ذرا مختصر کر کے، اس نے تو بہت ہی لمبی بات سنائی تھی اور میں نے بہت سی باتیں اپنے مطلب کی بھی پوچھی تھیں۔ مختصر بات یہ سامنے آئی کہ رفاقت اور مقتولہ میں باقاعدہ عشق و محبت کا ڈرامہ چل رہا تھا۔ لیکن یہ کوئی پاکیزہ محبت نہیں تھی۔ رفاقت بھی شادی شدہ تھا اور مقتولہ بھی۔ دونوں کے دو دو بچے تھے۔

میں مقتولہ کے اصل نام کی بجائے حُسنہ لکھوں گا۔ حُسنہ کی بابت یہ بات ذہن میں رکھ لیں کہ وہ بدچلن عورت نہیں تھی۔ آپ کہیں گے کہ خاوند کے ہوتے ہوئے جس عورت نے ایک غیر مرد کے ساتھ تعلقات بنائے ہوئے تھے، وہ بدچلن نہیں تو اور کیا تھی۔ بدچلن سے میری مراد وہ عورت ہے جو اپنے آشنا بدلتی رہتی ہے یا بیک وقت ایک سے زیادہ آدمیوں کے ساتھ آشنائی لگائی ہوئی ہوتی ہے۔ حُسنہ کی بابت تو ہر کسی کی یہی رائے تھی کہ صاف ستھرے چال چلن کی عورت ہے۔ رفاقت کی بابت لوگ کہتے تھے کہ وہ حُسنہ کے خاوند سراج کا دوست ہے اور ان کی دوستی اتنی پکی ہے کہ رفاقت حُسنہ کے گھر بے تکلفی سے آتا جاتا ہے۔

میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے نمبردار نے بتایا کہ حسنہ اور رفاقت کی اس آشنائی کی وجہ یہ ہے کہ حسنہ شوقین مزاج اور ہنسنے کھیلنے والی عورت ہے اور اس کے مقابلے میں اس کا خاوند کچھ مُردہ دل اور کچھ غیر ذمہ دار سا آدمی ہے۔ کچھ ایسی ذمہ داریاں بھی جو مرد پوری کیا کرتے ہیں، حُسنہ کیا کرتی تھی اور ایسے سارے کام ہنسی خوشی بلکہ فخر سے کیا کرتی تھی۔

میں نے پوچھا کہ پھر تو یہ عورت کھانے پینے والی ہو گی۔ تحفے اور رقمیں وصول کرتی ہو گی۔ میں جانتا تھا کہ بعض عورتیں کپڑوں کی اور بعض زیور کی اتنی شوقین ہوتی ہیں کہ کسی کو دوست بنا کر اپنی عصمت بطور قیمت یا بطور تحفہ پیش کرتی ہیں لیکن حسنہ اس قسم کی عورت نہیں تھی بلکہ نمبردار نے بتایا کہ وہ تو کھلانے پلانے والی عورت تھی۔ رفاقت اس کا من پسند دوست تھا۔ خوبرو بھی اور ہنس مکھ بھی۔ ان دونوں نے سراج کو بڑی کامیابی سے اُلو بنایا ہُوا تھا۔ رفاقت رعب اور رسوخ والا آدمی تھا اس واسطے سراج کے کئی کام کروا دیتا تھا اور سراج

خوش ہو جاتا تھا کہ اس کی ذمہ داریاں ایک دوست نے پوری کر دیں۔

نمبردار نے یہ بھی بتایا کہ رفاقت اس کا راز دار دوست تھا اس واسطے رفاقت نے بتایا تھا کہ حسنہ نے سراج پر اپنی خوبصورتی کا یا اپنی نسوانیت کا جادو طاری کیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایسے ناز و انداز اور چونچلے کیا کرتی تھی کہ سراج یہ سمجھ کر کہ حسنہ اس پر جان نثار کرتی ہے، پھولا نہیں سماتا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ حسنہ کس ٹائپ کی عورت تھی۔ ایسی عورتیں ظاہری طور پر نیک اور پاک بنی رہتی ہیں اور انتہائی خفیہ طریقے سے اپنی پسند کے کسی ایک آدمی کو اپنی جسمانی اور جذباتی تسکین کا ذریعہ بنا کر رکھتی ہیں۔ کوئی اور آدمی ایسی عورت کے ساتھ دوستی لگانے کی کوشش کرے تو سرعام اس کی بے عزتی کر دیتی ہیں تاکہ سب کو یہ یقین ہو جائے کہ یہ تو بڑی باعصمت اور نیک عورت ہے۔

اس کے بعد نمبردار نے یہ انکشاف کیا کہ دو اڑھائی مہینوں سے رفاقت اور حسنہ کی دوستی ٹوٹ گئی ہے اور اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ نمبردار کے ساتھ اتنی گہری اور راز داری والی دوستی کے باوجود رفاقت نے اس کو نہیں بتایا کہ تعلقات ٹوٹ جانے کی اصل وجہ کیا تھی۔ نمبردار نے پوچھا تو رفاقت نے منہ بُرا سا بنا کر کہا کہ بدچلن اور بے وفا عورت ہے اور اپنے خاوند کو دھوکہ دے رہی ہے۔

نمبردار نے ایک شک کا اظہار کیا جو یہ تھا کہ حسنہ نے رفاقت جیسے ہی ایک اور آدمی کو پسند کر لیا تھا لیکن شاید ابھی ان کی دوستی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد نمبردار نے دماغ لڑایا اور کچھ رائے دی اور میں نے اس سے کچھ اور باتیں پوچھیں تاکہ تہہ تک پہنچ سکوں لیکن آگے ہم دونوں کے واسطے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

آگے جو اندھیرا تھا اسی میں سب کچھ تھا یعنی قتل کا سراغ اُس اندھیرے میں چھپا ہوا تھا۔ نمبردار نے مجھ کو ایک لائن پر ڈال دیا تھا۔ اس نے بڑی قیمتی بات سنائی تھی لیکن صرف ایک آدمی کی ایسی رپورٹ میرے واسطے کافی نہیں تھی۔ اس آدمی یعنی نمبردار کے اپنے مفادات اور اپنی دلچسپیاں بھی ہو سکتی تھیں۔ اس نے یہ تو کہا ہی تھا کہ رفاقت کے ساتھ اس کی گہری دوستی ہے لیکن در پردہ کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ مجھ کو تصدیق کی ضرورت تھی کہ رفاقت اور حسنہ کے ناجائز تعلقات چل رہے تھے۔

میں نے اب کچھ اور لوگوں سے پوچھ گچھ کرنی تھی اور مخبروں سے بھی معلومات لینی

تھیں۔ اس کے واسطے مجھ کو تھانے چلے جانا چاہئے تھا تاکہ کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ میں نے کس کس کو بلایا اور پوچھا تھا۔ بارش تھم کر پھوہار کی صورت اختیار کر گئی تھی اور جھکڑ بھی رک گئے تھے۔ میں تھانے چلا گیا۔

”تم میرے خاوند کی داشتہ بنی ہوئی ہو“

شام کا کھانا جو بڑا ہی پُر تکلف تھا، نمبردار نے کھلا دیا تھا۔ میں نے تفتیش جاری رکھنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اپنے دفتر میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی اور یہ پتہ بھی لگا کہ لاش اپنے گھر پہنچ گئی ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کا باعث دم گھٹنا لکھا تھا۔ مقتولہ کو گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ جسم پر تشدد کے کوئی نشانات نہیں تھے سوائے ان دو چھوٹی چھوٹی خراشوں کے جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ موت دن کے گیارہ ساڑھے گیارہ کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب آندھی بڑی ہی تیز چلی تھی اور ابھی بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ اب کس کو بلا کر تفتیش کو آگے بڑھاؤں۔ سوچتے سوچتے مقتولہ کے خاوند کے بڑے بھائی کا خیال آ گیا۔ میں بیان کر چکا ہوں کہ کتنے افراد سے میں پوچھ گچھ کر کے آیا تھا۔ ان میں سراج اور حسنہ کے رشتہ دار بھی شامل تھے۔ ان میں سے تین نے کہا تھا کہ سراج کے بڑے بھائی کو کچھ نہ کچھ معلوم ہوگا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص بڑا ہی صاف گو اور حقیقت پسند آدمی ہے۔ ان میں سے کسی نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ بھائی سراج اور حسنہ کو پند و نصیحت کرتا رہتا تھا۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ سراج کا بڑا بھائی لاش کے ساتھ گیا تھا اب لاش گھر چلی گئی تھی۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو دوڑایا کہ وہ اس شخص کو ساتھ لے آئے۔

میں نے ایک بات پہلے کہی ہے جو ایک بار پھر کہوں گا۔ اُس زمانے میں شہروں میں قتل کی وارداتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ آج کل کی طرح نہیں کہ ذرا سا غصہ آیا اور گولی چلا کر بندہ مار ڈالا۔ کسی لڑکی کا رشتہ مانگنے گئے اور لڑکی والوں نے انکار کر دیا تو لڑکی کو گولی مار دی یا خاوند بیوی کو میکے سے لینے گیا تو کسی وجہ سے بیوی نہ آئی تو خاوند ریوالور لے کر گیا اور بیوی سمیت اس کے میکے کے دو تین افراد کو گولی مار دی۔ قتل ایک انتہائی اور بڑا ہی سنگین اقدام ہوتا ہے۔ اس کو ایک لمحے کا پاگل پن کہتے ہیں۔ کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے جو

بندے کو پاگل کر دیتی ہے اور غصے سے اس کا دماغ بے قابو ہو جاتا ہے۔ مجھ کو یہ معلوم کرنا تھا کہ کس کے ساتھ کوئی ایسی بات ہو گئی تھی۔

سراج کا بڑا بھائی آ گیا۔ اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ نہایت اچھی طرح تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ لباس اور وضع قطع سے معزز لگتا تھا اور وہ تھا بھی معزز زمیندار۔ میں اس کا نام حماد لکھوں گا۔ رعب دار آدمی تھا اور پڑھا لکھا بھی معلوم ہوتا تھا۔

میں نے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کیا تو وہ خود ہی پورا بیان دینے پر آ گیا۔ اس نے کہا کہ مرنا تو ہر کسی کو ہے لیکن ایسی ذلیل موت اللہ میرے دشمن کو بھی نہ دے۔

''بھائی کو بہت سمجھایا اور ڈرایا تھا'' ——اس نے کہا—— ''لیکن اس پر معلوم نہیں کیا جادو سوار تھا کہ میری باتوں کو مٹی میں ملاتا رہا۔ ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ہی تھا۔ یہ توقع تو نہیں تھی کہ بات قتل یا خودکشی پر ختم ہو گی لیکن ایک دن پردے نے اٹھنا ہی تھا۔ کسی بدنام اور بدمعاش آدمی کی دوستی سے بدنامی اور برے انجام کے سوا حاصل ہی کیا ہو سکتا ہے!''

میں اپنے سوالات کے ذریعے اسے گائیڈ کرتا رہا اور وہ بولتا چلا گیا۔ اس طرح جو نئی بات میرے سامنے آئی وہ یوں تھی کہ اس شخص حماد کو بھی معلوم تھا کہ رفاقت کا عمل دخل اور اثر و رسوخ سراج اور اس کی مقتولہ بیوی حسنہ پر قابل اعتراض حد تک ہے۔ اس نے یہاں تک بتایا کہ رفاقت کو رات کے وقت بھی سراج کے گھر سے نکلتے دیکھا گیا ہے جب سراج گھر میں نہیں تھا۔ دن کے وقت بھی رفاقت سراج کی غیر حاضری میں اس کے گھر جاتا اور بہت دیر اندر ہی رہتا تھا۔ اس کو سراج کا کوئی ڈر نہیں تھا اس واسطے کہ سراج رفاقت کو اپنا پیر استاد مانتا تھا۔

سراج کی بابت حماد نے بتایا کہ اس نے حسنہ کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی اور حسنہ کو حسینہ بنا کر رکھا ہوا تھا۔ اس عورت کو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی اور سراج اس کے قدموں میں جھکا رہتا تھا۔

میں نے حماد سے پوچھا کہ چال چلن کے لحاظ سے حسنہ کیسی عورت تھی؟...... اس نے کہا کہ اپنی آنکھوں دیکھے بغیر یہ کہنا اچھا نہیں کہ اس عورت کا چال چلن قابل اعتراض تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ بدا اچھا بدنام بُرا، یہ بات بالکل صحیح ہے۔

''آپ شاید رفاقت کو نہیں جانتے'' ——حماد نے کہا—— ''سارا شہر اس کو جانتا ہے اور کوئی ایک بھی شخص ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہہ دے کہ حسنہ کے ساتھ رفاقت کی دوستی پاک اور صاف تھی۔ ایسے بدکردار آدمی سے نیکی کی توقع رکھنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پھر جہاں عورت کو پوری آزادی حاصل ہو اور وہ شادی شدہ بھی ہو تو اس کا نیکی سے پھسل کر بدی میں جا گرنا کوئی حیرت والی بات نہیں ہوتی''۔

میری کہانیاں پڑھنے والے خواتین و حضرات جان گئے ہوں گے کہ رفاقت اور حسنہ کی دوستی کیسی تھی اور ان دونوں نے سراج کو کس طرح شیشے میں اتارا ہوا تھا اور اپنے قابل اعتراض تعلقات کو آزادی سے چلا رہے تھے۔ اب ایک نئی بات سنیں جو حماد نے بتائی۔ حماد کی بابت مجھ کو یہ بتانے والوں نے ٹھیک بتایا تھا کہ یہ معزز شخص حقیقت پسند اور صاف گو ہے۔ حماد دراصل اسلامی اصولوں کی پابندی کرنے والا آدمی تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک روز اس کی بیوی حسنہ کے ہاں ویسے ہی گئی اور دونوں بیٹھی گپ شپ لگا رہی تھیں۔ اتنے میں رفاقت کی بیوی وہاں جا پہنچی اور جاتے ہی حسنہ پر برس پڑی۔ اس نے حسنہ کو بولنے کی مہلت ہی نہ دی اور واہی تباہی بکتی رہی۔

رفاقت کی بیوی دراصل ایک مظلوم بیوی تھی۔ اس کا خاوند ایک اور عورت کے جال میں آیا ہوا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ رفاقت کی بیوی کو معلوم تھا کہ اس کا خاوند حسنہ کے گھر آتا جاتا ہے اور ان کے تعلقات ایسے ویسے ہیں۔ اس عورت نے حسنہ کو کہا کہ تم میرے خاوند کی داشتہ بنی ہوئی ہو۔ اگر تمہیں میرا خاوند اتنا ہی پسند ہے تو ہمت کرو اور اپنے خاوند سے طلاق لے کر میری سوکن بن جاؤ اور میرے گھر آ جاؤ پھر دنیا دیکھے گی کہ تمہاری لاش کس طرح میرے گھر سے نکلتی ہے۔ اب میرا خاوند یہاں آیا تو میں گلی میں کھڑی ہو کر شور مچاؤں گی اور تمہیں دنیا کے تختے سے اٹھا دوں گی۔

حسنہ کا تو رنگ روپ ہی اڑ گیا۔ آخر حماد کی بیوی حسنہ کی حمایت میں بولی اور رفاقت کی بیوی کو بُرا بھلا کہا لیکن یہ عورت اتنی بھڑکی ہوئی تھی کہ اس نے حماد کی بیوی کی بھی بے عزتی کر ڈالی۔ پھر وہ واہی تباہی بکتی گھر سے نکل گئی۔

یہ بات سن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے حماد سے پوچھا کہ اس عورت کے بھائی ہوں گے، اگر ہیں تو وہ کیسے لوگ ہیں۔ حماد نے میری بات سمجھ لی اور پورے اعتماد کے ساتھ کہا کہ وہ کمزور سے لوگ ہیں، ان میں اتنی جرأت نہیں کہ قتل کی واردات کی سوچ بھی سکیں۔

میرے دماغ میں یہ شک بیٹھ گیا کہ رفاقت کی بیوی نے ہی حسنہ کا پتا نہ کاٹ دیا ہو۔

ایک مظلوم عورت جس کا خاوند کسی اور عورت کے چکر میں آیا ہوا ہو وہ زخمی شیرنی جیسی ہو جاتی ہے اور اس کا حملہ بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے۔

حماد نے ایک اور بات بتا کر میرا یہ شک پختہ کر دیا۔ اس نے بات یہ بتائی کہ سنا ہے رفاقت اپنی بیوی کو مارتا پیٹتا بھی ہے ظاہر ہے۔ رفاقت بیوی کو اسی وجہ سے مارتا پیٹتا ہوگا کہ وہ رفاقت اور حسنہ کے تعلقات پر غصے اور احتجاج کا اظہار کرتی ہوگی۔ اس عورت کی بابت یہ بھی پتہ لگا کہ سانولے سے رنگ کی عام سی عورت تھی اور حسنہ کے مقابلے میں اس کی نوکرانی لگتی تھی۔

اس کے بعد حماد نے بتایا کہ اس کی بیوی نے گھر آ کر حماد کو رفاقت کی بیوی کی یہ حرکت سنائی۔ حماد کو افسوس بھی ہوا اور اپنے بھائی سراج پر غصہ بھی آیا۔ اس نے اپنے ایک بچے کو بھیج کر سراج کو اپنے گھر بلوایا اور اس کو ڈانٹا بھی اور شرمسار بھی کیا۔ سراج نے حماد کو بتایا کہ اسے گھر آئے ہوئے تقریباً چار گھنٹے گزر گئے ہیں، یہ بات دن کی ہے اور اب رات ہوگئی ہے لیکن حسنہ نے اسے بتایا ہی نہیں کہ یہ واقعہ ہوا ہے۔

حماد نے اسے اور زیادہ شرم دلائی کہ حسنہ اسے اُلّو کا پٹھا بنا رہی ہے اور وہ اس پر اپنی عزت اور اپنا وقار بھی قربان کئے ہوئے ہے۔

حماد نے سراج کو یہ بھی کہا کہ رفاقت اس کا نہیں بلکہ حسنہ کا دوست ہے۔ یہ بھی کہا کہ سراج ساری برادری میں بدنام ہو چکا ہے۔

زن مرید تھا بزدل نہیں تھا

میں نے حماد سے پوچھا کہ اس کی اس ڈانٹ ڈپٹ پر سراج کا رویہ اور ردعمل کیا تھا...... حماد نے بتایا کہ سراج کا سر جھک گیا تھا اور کسی سوچ میں اس نے آہستہ آہستہ اپنا سر اوپر نیچے ہلایا تھا۔

''اس خاموشی سے آپ نے کیا مطلب لیا تھا؟''—— میں نے حماد سے پوچھا اور اسے یہ اشارہ دیا—— ''کیا یہ اس کی بزدلی کا اظہار تھا یا وہ سنجیدہ ہو گیا تھا؟''

''یہ بزدلی کی نشانی نہیں تھی''—— حماد نے کہا—— ''میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ سراج ایسا بزدل تو کبھی ہوا ہی نہیں تھا، وہ تو مضبوط دِل گردے والا آدمی ہے لیکن اس عیار

عورت نے اس کی اپنی اصل شخصیت ہی مسخ کر ڈالی تھی''۔

اگر حماد مجھ پر یہ ظاہر کر رہا تھا کہ سراج بزدل آدمی نہیں تھا بلکہ اس نے ایک بات ایسی بھی کہی جس سے یہ پتہ لگتا تھا کہ سراج میں ہٹ دھرمی تھی۔ یہ بھی تو ہٹ دھرمی ہی تھی کہ اپنی بیوی اور اس کے آشنا کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا اور اپنے اسی رویے کو صحیح سمجھتا تھا۔

حماد نے کام کی ایک اور بات سنا دی۔ دو روز پہلے یعنی قتل کی واردات کے دو روز پہلے سراج اس کے پاس آیا اور اس کو بتایا کہ اس نے اپنی بیوی حسنہ کو بڑے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ رفاقت جیسے مشکوک کردار کے آدمی کے ساتھ بے تکلفی نہ رکھے اس واسطے کہ اس میں سوائے بدنامی اور رسوائی کے کچھ بھی نہیں۔ سراج نے حسنہ کو کہا کہ جب وہ گھر میں نہ ہو تو رفاقت کو حسنہ گھر میں نہ گھسنے دیا کرے کہ سراج گھر میں نہیں اس واسطے گھر میں داخل نہ ہو اور اس وقت آئے جب سراج گھر میں موجود ہو۔

سراج نے حماد کو بتایا کہ اس بات پر حسنہ بھڑک اٹھی اور رفاقت کے حق میں سراج کو بُرا بھلا کہہ ڈالا۔ سراج بھی غصے میں آ گیا۔ اس نے حسنہ کو کہا کہ میں پیار کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں زن مرید بنا اور حسنہ کو اس کا کوئی احساس نہیں۔ بات بڑھ گئی تو سراج نے حسنہ کو کہا کہ میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا، جان سے ہی مار ڈالوں گا۔ اس کے بعد حسنہ نے سراج کو کہا کہ تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔

سراج نے اپنی بیوی کے ساتھ یہ جھڑپ پوری کی پوری حماد کو سنائی اور کہا کہ اب وہ حسنہ کو اپنے ٹھکانے پر رکھے گا اور اگر اس نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اس کی ہڈیاں توڑ دے گا......حماد اتنا شریف انسان تھا کہ اس نے باتوں کی روانی میں یہ سوچا ہی نہیں کہ وہ میرے دل میں سراج کے خلاف یہ شک پیدا کر رہا ہے کہ حسنہ کا قاتل سراج ہے۔ میں نے اس شک کے پیشِ نظر تین چار سوال کئے تو حماد نے بلا سوچے سمجھے بڑی برخورداری سے جواب دیئے اور میرے شک کو مزید پختہ کر دیا...... میرے سامنے اب دو مشتبہ آ گئے۔ ایک سراج اور دوسری رفاقت کی بیوی۔

حماد کے ساتھ سوال و جواب اور بیان وغیرہ میں اتنا وقت لگ گیا کہ رات کے گیارہ بجنے والے ہو گئے۔ میں نے حماد کو رخصت کر دیا اور خود گھر چلا گیا۔

اگلی صبح میرے تین پکے مخبر آ گئے۔ فوراً ہی بعد دو معززین بھی آ گئے جو ظاہری طور پر

تو معززین تھے لیکن در پردہ میرے مخبر تھے۔ میں نے ان دونوں میں سے ایک کو اپنے دفتر میں بٹھایا اور واردات کی بابت سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔

یہ شخص تو مان ہی نہیں رہا تھا کہ حسنہ کے کسی کے ساتھ ناجائز مراسم ہو سکتے ہیں۔ وہ حسنہ کو زندہ دل اور ہر دلعزیز عورت کہتا تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ اس قسم کی عورت عام طور پر بدنام ہو جایا کرتی ہے۔ جن لوگوں کی اپنی نیت صاف نہیں ہوتی وہ ایسی عورت کو بے حجاب اور بے حیا کہا کرتے ہیں اور یہ بھی کہ ایسی عورت یقیناً بدچلن ہوتی ہے۔

میں یہ تو نہیں چاہتا تھا کہ حسنہ کو بدچلن ہی ثابت کیا جائے لیکن یہ معزز شخص ان بیانات کے بالکل الٹ چل رہا تھا جو اس وقت تک کئی اشخاص نے دیئے تھے۔ میں نے اس سے بہت سوال و جواب کئے لیکن وہ کسی ایک بھی سوال کا تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ اس سے میں صرف یہ سمجھا کہ حسنہ نے رفاقت کی دوستی کو ایسی کامیابی سے پردے میں رکھا ہوا تھا کہ کئی لوگ اس کو بدچلن سمجھتے ہی نہیں تھے۔

اس شخص کو باہر بھیج کر دوسرے معزز آدمی کو بلایا۔ اس نے جو بیان دیا اور میرے سوالوں کے جو جواب دیئے، ان سے انہی بیانات کی تصدیق ہوئی جو پہلے مجھ تک پہنچ چکے تھے۔ نمبردار نے اور حماد نے رفاقت اور حسنہ کی دوستی کی بابت جو تفصیلات سنائی تھیں وہ اس شخص نے بھی سنا دیں۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش میں تھا کہ سراج کیسا آدمی تھا۔ اپنی ضرورت کے مطابق سوال کئے تو حماد کی بات صحیح ثابت ہوئی کہ سراج بزدل اور کسی کے آگے جھکنے والا آدمی نہیں تھا لیکن نہ جانے حسنہ نے اس پر کیسا جادو کر دیا تھا کہ اس کے آگے سراج کٹھ پتلی بنا رہتا تھا۔

اس کے بعد میں نے اپنے پکے مخبروں سے رپورٹیں لیں۔ ان میں سے بھی کوئی نئی بات معلوم نہ ہو سکی، تینوں نے وہی رپورٹ دی جو پہلے ہی مجھ تک پہنچ چکی تھی۔ میں کچھ حیران ہوا کہ ان تینوں میں سے کسی نے بھی حسنہ کو بدچلن یا آوارہ یا گھٹیا عورت نہیں کہا، البتہ اسے خاصی چالاک عورت کہا اور یہ بھی کہ وہ اتنی ہنس مکھ اور ملنسار ہے کہ اپنے خلاف کوئی گلہ شکوہ پیدا ہونے ہی نہیں دیتی۔ رفاقت کے ساتھ اس کی دوستی کا ذکر سب نے کیا اور یہ بھی کہا کہ یہ دوستی پاکیزہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے باوجود وہ حسنہ کے کردار کو اچھا کہہ رہے تھے۔

یہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ وہ ایسا کیوں کہتے تھے۔

یہ تینوں چونکہ میرے پکے مخبر تھے اس واسطے میں نے ان کو کچھ اور باتیں بتائیں کہ وہ جا کر معلوم کریں۔ ان میں سے ایک نے ایک عورت کا نام لیا اور وثوق کے ساتھ کہا کہ میں صرف اس عورت کو بلا لوں تو وہی میرا کام کر دے گی۔ یہ ایک کامی یعنی لوگوں کے گھروں میں کام کرنے والی عورت تھی۔ اس کا خاوند بہشتی (ماشکی) تھا۔ لوگوں کے گھروں میں پانی ڈالتا تھا۔ میں اس عورت کا نام نذیراں لکھوں گا۔ اس مخبر کو ہی کہا کہ وہ اس عورت کو میرے پاس بھیج دے۔ باقی سب کو میں نے رخصت کر دیا۔

نذیراں آ گئی۔ وہ حسنہ کی ہم عمر تھی یعنی تیس پینتیس سال کے درمیان کی عورت تھی۔ شکل صورت اچھی اور رنگ بھی صاف ستھرا تھا۔ اس کے جسم کی ساخت تو بہت ہی اچھی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ اور آنکھیں دیکھیں۔ میں جان گیا کہ یہ ان عورتوں میں سے ہے جو آسمان سے تارے بھی توڑ لاتی ہیں اور واپس رکھ بھی آتی ہیں۔ ایسی عورتیں پولیس کے بہت کام آتی ہیں۔ میں نے اپنی تفتیشی کہانیوں میں ایسی عورتیں کئی بار پیش کی ہیں۔

پہلے تو میں نے نذیراں کو یہ ذہن نشین کرایا کہ وہ کسی ذرا جتنی بات پر بھی پردہ ڈالنے کی حماقت نہ کرے پھر اس کو بتایا کہ مجھ تک بہت ساری باتیں پہنچ چکی ہیں اور اب میں اندر کی باتیں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بیچاری چھوٹی ذات اور کم حیثیت کی عورت تھی، اس نے وعدہ کیا کہ وہ میری اس بات پر سولہ آنے عمل کرے گی۔ اس کے ساتھ تو سب سے زیادہ لمبی باتیں ہوئیں جو ساری کی ساری بیان کرنا ضروری نہیں۔ میں مختصر کر کے سنا دیتا ہوں۔

سوہنی مہینوال میں ناچاقی

نذیراں حسنہ کی ہم راز تھی۔ ظاہری طور پر اس کے گھر کی کامی بنی ہوئی تھی لیکن اس کی سہیلی کا روپ بھی در پردہ ساتھ ساتھ تھا۔ اس نے یہ بتا دیا کہ وہ حسنہ اور رفاقت کے درمیان پیغام رسانی کرتی تھی۔ پیغام رسانی کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی اس واسطے کہ ان کا میل ملاپ کھلے عام تھا اور رفاقت حسنہ کے گھر آتا ہی رہتا تھا پھر بھی کبھی کوئی پیغام دینا ہوتا تو وہ نذیراں دیتی تھی۔

حسنہ کے مکان کا بڑا دروازہ ایک گلی کی طرف تھا جو عام استعمال ہوتا تھا اور ایک

چھوٹا دروازہ جو دراصل ایک کمرے کا دروازہ تھا وہ پہلو کی طرف تھا، ادھر سے ایک
گلی گزرتی تھی۔ رفاقت کبھی کبھی اس چھوٹے دروازے کی طرف سے آتا جاتا تھا۔

نذیراں نے بتایا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا آپس کا تعلق میاں بیوی والا کوئی پاکیزگی نہیں تھی لیکن انہوں نے عشق و محبت چلا رکھا تھا اور حسنہ رفاقت کو مہینوال کرتی تھی اور رفاقت حسنہ کو سوہنی کہتا تھا۔ مثلاً رفاقت کوئی پیغام دیتا تو نذیراں کو یوں کہتا کہ سوہنی کو یہ بات کہہ دینا۔

''مجھ کو ایک بات بتاؤ نذیراں!''—— میں نے پوچھا—— ''کیا حسنہ کھانے والی عورت تھی، رفاقت سے پیسے اور کپڑے وغیرہ لیتی ہوگی؟''

''نہیں جی!''—— نذیراں نے جواب دیا—— ''حسنہ شوقین عورت ضرور تھی اس کو اچھے سے اچھا اور قیمتی سے قیمتی کپڑا پہننے کا بہت شوق تھا لیکن اپنے پلے سے خرچ کر کے اپنا شوق پورا کرتی تھی بلکہ رفاقت کو کبھی کبھار پیسے بھی دیا کرتی تھی۔ رفاقت کبھی جوئے میں زیادہ پیسے ہار جاتا تو حسنہ کو بتاتا اور ہاری ہوئی رقم حسنہ سے پوری کر لیتا تھا۔ رفاقت نے کئی بار مجھ کو کہہ کر حسنہ سے پیسے منگوائے تھے''۔

نذیراں اپنی بات آگے چلاتی رہی اور میں اس سے کوئی نہ کوئی بات پوچھتا چلا گیا۔ ایک موقع پر نذیراں نے مجھ کو یہ الفاظ کہے کہ حسنہ کا خاوند تو سراج تھا لیکن اصل خاوند رفاقت تھا۔ نذیراں نے کہا کہ میں بھی ایک بیوی ہوں، میں ٹھیک طرح بتا سکتی ہوں کہ بیوی کیا چاہتی ہے۔ بیوی کو صرف جسمانی تسکین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے کچھ جذبات بھی ہوتے ہیں۔ مرد جسم کے ساتھ دلچسپی رکھتا ہے لیکن بیوی، بچے کی طرح پیار محبت چاہتی ہے۔ نذیراں نے بتایا کہ سراج جسمانی لحاظ سے حسنہ کے واسطے ٹھیک ٹھاک مرد تھا لیکن طبیعت اور عادتوں کے لحاظ سے بالکل مُردہ تھا جبکہ حسنہ ہنسنے کھیلنے والی زندہ دل عورت تھی۔ یہ صحیح ہے کہ سراج حسنہ کو اتنا زیادہ چاہتا تھا کہ اس کو خوش کرنے کے واسطے بڑی سے بڑی قربانی دے دیتا تھا لیکن جو حسنہ چاہتی تھی وہ اس کو سراج کی بجائے رفاقت سے حاصل ہوتا تھا۔

نذیراں نے تفصیلات سنا کر بتایا کہ رفاقت اور حسنہ کے یہ تعلقات کس طرح کے تھے اور انہوں نے کس طرح اور کیسے کیسے طریقوں سے سراج کو اپنے جادو جیسے اثر میں لیا ہُوا تھا...... میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کہاں تک صحیح ہے کہ حسنہ کی سراج کے ساتھ لڑائی

ہوئی تھی۔

''صرف سراج کے ساتھ ہی لڑائی نہیں ہوئی تھی''—— نذیراں نے جواب دیا—— ''حسنہ کی لڑائی رفاقت کے ساتھ بھی ہوئی تھی اور پھر ان کے تعلقات میں کھچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ملاقاتیں سمجھو ختم ہی ہو گئی تھیں''۔

میرے پوچھنے پر نذیراں نے رفاقت کے ساتھ لڑائی کی یہ وجہ بتائی کہ رفاقت نے حسنہ کو کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ خاوند سے طلاق لے لے اور وہ خود اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا اور پھر ان کی شادی ہو جائے گی۔ حسنہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ سراج جیسا خاوند کسی خوش قسمت عورت کو ہی ملا کرتا ہے۔ حسنہ نے نذیراں کو اس لڑائی کی بابت یہ بھی بتایا تھا کہ حسنہ نے رفاقت کو صاف کہہ دیا تھا کہ تم جیسے خاوند کا کوئی بھروسہ نہیں، تمہارا دل بھر جائے گا تو کسی اور کے ساتھ یاری لگا لوگے۔

میرا اپنا خیال تھا کہ رفاقت نے حسنہ کی اس بات سے اپنی توہین سمجھی ہوگی۔ وہ حسنہ کو اپنی لونڈی اور ذاتی ملکیت سمجھتا ہوگا لیکن حسنہ کچھ اور ہی طرح کے کردار کی عورت تھی۔ وہ اپنے جذبات اور اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزار رہی تھی اور جو کھیل کھیلنا چاہتی تھی کھیل رہی تھی۔

نذیراں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ حسنہ نے رفاقت کو بتایا تھا کہ اس کی بیوی اس کی بےعزتی گھر آ کر کر گئی ہے۔ رفاقت نے اس بات پر اپنی بیوی کو مارا پیٹا تھا۔ اس کے بعد رفاقت نے اپنی یہ فرمائش پیش کی تھی کہ حسنہ سراج سے طلاق لے کر اس کے ساتھ شادی کر لے۔

پھر اس کے کچھ دن بعد رفاقت نے حسنہ سے پیسے مانگے جو کسی اور وجہ سے حسنہ نے نہ دیئے۔ رفاقت بگڑ گیا اور سراج کی غیر حاضری میں حسنہ کے گھر آ کر اس کو بہت شرمناک اور بہت بُری باتیں کہیں۔ حسنہ نے نذیراں کو بتایا کہ اس نے بھی رفاقت کی بہت بےعزتی کر دی۔ رفاقت حسنہ کو قتل کی دھمکی دے کر چلا گیا۔

نذیراں نے مجھ کو سنایا کہ ایک روز حسنہ نے ہنستے ہنستے اس کو کہا کہ ایک طرف رفاقت قتل کی دھمکیاں دیتا ہے اور دوسری طرف اپنا خاوند بھی قتل کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ نذیراں نے اس کو کہا کہ رفاقت کی دھمکیاں بالکل پھوکی ہیں لیکن سراج کی دھمکیوں کو وہ مذاق نہ سمجھے اور نہ ہی سراج کو بدھو اور سائیں لوک سمجھ لے، ایسے لوگ زہری ہوتے

ہیں، کبھی سراج کا دماغ پھر گیا تو پچھتاؤ گی۔

نذیراں نے بڑے ہی کام کی ایک بات سنا دی۔ وہ یوں تھی کہ رفاقت جیسا ہی ایک اور آدمی حسنہ کو اچھا لگنے لگا تھا اور وہ نذیراں کے ساتھ اس کی بابت باتیں کرنے لگی تھی۔ حسنہ نے اپنا ارادہ کھل کر تو نہ بتایا، نذیراں جان گئی کہ اب حسنہ دوستی تبدیل کرنا چاہتی ہے۔

نذیراں کو یقینی طور پر تو معلوم نہیں تھا لیکن اس نے اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا کہ شاید کبھی حسنہ نے اس آدمی کو چلتے چلتے کوئی اشارہ کیا ہوگا یا اس کو دیکھ کر مسکرائی ہوگی جس سے وہ آدمی حسنہ کی طرف مائل ہو گیا۔ ایک روز اس آدمی نے نذیراں سے پوچھا کہ تمہاری بیگم کس حال میں ہے۔ نذیراں نے کوئی جواب دیا ہی ہوگا جو سن کر اس آدمی نے کہا کہ اپنی بیگم کو کہنا کہ میں نے اس کی خیر خیریت پوچھی تھی۔

میرے پوچھنے پر نذیراں نے بتایا کہ اس آدمی کے ساتھ حسنہ کے ابھی تعلقات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ابھی دور دور سے ہی مسکراہٹوں کے تبادلے ہو رہے تھے۔ ایک روز حسنہ نے نذیراں کو بتایا کہ وہ ایک روز پہلے اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے قبرستان گئی تو واپسی پر کھیتوں میں اس آدمی کے ساتھ اس کا آمنا سامنا ہو گیا۔ حسنہ اس کے پاس رک گئی اور کہیں سے رفاقت نے ان کو دیکھ لیا۔ اگلے روز جب سراج اپنے کام کاج کو چلا گیا تو رفاقت حسنہ کے گھر آن دھمکا اور حسنہ کو کہا کہ پھر کبھی اس نے حسنہ اور اس آدمی کو اکٹھے دیکھ لیا تو وہ حسنہ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

میں نے نذیراں سے پوچھا کہ یہ کب کی بات ہے اس نے بتایا کہ یہ قتل سے دو تین دن پہلے کا واقعہ ہے۔ پھر میں نے نذیراں سے رفاقت کی بیوی کی بابت پوچھا کہ تم اس سے بھی کبھی ضرور ملی ہوگی اور اس معاملے میں اس نے کوئی بات ضرور کی ہوگی۔

''اس کے ہاں تو میرا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا'' —— نذیراں نے کہا —— ''اس نے جب حسنہ کے گھر آ کر اس کی بے عزتی کی تھی اس کے ایک دو دنوں بعد حسنہ نے مجھ کو اس کے گھر یہ معلوم کرنے کے واسطے بھیجا تھا کہ اس کی اور رفاقت کی آپس میں بول چال یعنی لڑائی جھگڑا ہوا ہے یا نہیں اور وہ کس طرح وقت گزار رہے ہیں۔ میں گئی اور باتوں باتوں میں یہ ذکر چھیڑ دیا۔ رفاقت کی بیوی نے مجھ کو بتایا کہ خاوند نے اس کو مارا پیٹا ہے۔ پھر اس عورت نے آنسو بہاتے ہوئے کہا کہ یہ عورت یعنی حسنہ ایسی موت مرے گی کہ دنیا اس کا

تماشا دیکھے گی اور اس کی بدنامی قبر تک جائے گی''۔

میں نے یہ شک دل میں رکھ کر کہ اس عورت نے ہی حسنہ کو مروایا ہوگا، نذیراں کو بہت کریدا اور بات سے بات نکال کر پوچھا لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہ آئی جو میرے شک کو پکا کرتی بلکہ شک رفع ہو گیا۔ نذیراں نے اپنی رائے یہ دی کہ اس عورت یعنی رفاقت کی بیوی میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اتنا زبردست وار کرتی یا کسی سے کرواتی۔

مجھ کو یہ خیال آیا کہ یہ ایک مظلوم عورت کی بد دعا تھی جو حسنہ کی موت کا باعث بنی اور اب سارے شہر کے لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ حسنہ کا قاتل کون ہے اور قتل کی وجہ کیا ہے۔ لوگ اپنی اپنی دانست کے مطابق یا اپنی اپنی ذہنیت کے مطابق کہانیاں گھڑ رہے تھے۔ وہ جو زندگی میں ہنس مکھ، ملنسار اور زندہ دل کہلاتی تھی مر کر ایسی بدنام ہوئی کہ گلی گلی اس کے چرچے ہونے لگے۔

نذیراں کے پاس بتانے کے واسطے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس عورت نے تو مجھ کو روشنی دکھا دی تھی اور اب میں اندھیروں میں بھی بڑے آرام سے دیکھ سکتا تھا۔ جب نذیراں کو رخصت کرنے لگا تو اس نے ہر غریب اور نادار گواہ کی طرح ہاتھ جوڑ کر مجھ کو کہا کہ میں کسی کو یہ پتہ نہ لگنے دوں کہ اس نے یہ باتیں بتائی ہیں۔ سراج کا تو اتنا ڈر نہیں، میں رفاقت سے ڈرتی ہوں۔ اس کو پتہ لگ گیا تو وہ مجھ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ تو ہر تفتیش کا ایک معمول تھا۔ میں نے اس معمول کے مطابق نذیراں کو جھوٹی تسلیاں دیں کہ وہ بے غم اور بے فکر ہو کر گھر جائے، میں اتنا کچا نہیں کہ کسی پر اس کا نام ظاہر ہونے دوں گا۔ وہ اٹھی اور مجھ کو دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ اس نے پردے تو اٹھا ہی دیئے تھے لیکن اس کا یہ بیان قتل سے دو یا تین روز پہلے تک ہی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ رفاقت نے جب حسنہ کو گھر آ کر دھمکی دی تھی تو اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ نذیراں نے بتایا کہ اس کے بعد وہ دو تین دن یعنی قتل تک اس کے گھر نہ جا سکی۔ وجہ یہ ہوئی کہ اس کا ایک بچہ یا غالباً اس کا خاوند زیادہ بیمار ہو گیا تھا اور وہ اس کے ساتھ مصروف رہی اور حسنہ کے گھر جانے کی مہلت حاصل نہ کر سکی تا آنکہ اس کو خبر ملی کہ حسنہ نے خودکشی کر لی ہے یا قتل ہو گئی ہے۔

''یہ خبر سن کر تمہارے دماغ میں کیا خیال آیا تھا'' —— میں نے نذیراں سے پوچھا تھا —— ''کیا تم نے اس کو خودکشی سمجھا تھا یا قتل؟''

''توبہ کرو جی!'' — نذیراں نے جواب دیا تھا — ''حسنہ خودکشی کرنے وا
عورت نہیں تھی، وہ تو کسی بھی آدمی کو خودکشی پر مجبور کرسکتی تھی۔ مجھ کو پہلا خیال یہی آیا تھا
حسنہ رفاقت یا اپنے خاوند کے ہاتھوں ماری گئی ہے''۔

میرے سامنے اب دو مشتبہے تھے...... رفاقت اور سراج...... حسنہ ایک اور آدمی طرف مائل ہوگئی تھی جس کو میں نے دماغ سے نکال دیا۔ ان کی تو ابھی ایک بھی ملاقا نہیں ہوئی تھی، نذیراں کے بیان کے مطابق صرف ایک بار کھیتوں میں ان کا آمنا سامنا تھا۔ میں نے دو کانسٹیبلوں کو بھیج کر سراج اور رفاقت کو تھانے بلوا لیا۔

دھمکی نے مردانگی کو جگا دیا

پہلے سراج کو اپنے پاس بٹھایا۔ یہ شخص بھی لباس اور وضع قطع سے معزز آدمی لگتا بلکہ تھا ہی معزز کلاس کا آدمی اور دس جماعتیں پڑھا ہوا تھا۔ اُس زمانے میں کم از مسلمانوں کے واسطے دس جماعتیں بہت زیادہ تعلیم سمجھی جاتی تھی جیسا کہ آج کل بی اے ایم اے کو سمجھا جاتا ہے...... میں نے دل میں طے کرلیا تھا کہ اس کو شک نہیں ہونے دو کہ مجھ کو اس پر قتل کا شبہ ہے۔

''سراج بھائی!'' — میں نے کہا — ''تمہاری اتنی اچھی بیوی کے مرنے کا مجھ دلی افسوس ہے۔ میں اس وقوعہ کو خودکشی لکھ لوں گا لیکن مجھ کو پوری بات معلوم ہونی چاہئے تم نے پہلے روز کہا تھا کہ خودکشی کی کوئی وجہ نہیں اور قتل کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی لیکن اس کو قتل کی واردات ہی سمجھ سکتا ہوں''۔

''میرا دماغ آپ کے دماغ تک نہیں پہنچ سکتا جناب عالی!'' — سراج نے کہا ''اگر آپ اس کو قتل سمجھتے ہیں تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ غلط سمجھ رہے ہیں''۔

''میں جن بھوت یا فرشتہ نہیں سراج بھائی!'' — میں نے کہا — ''اس وقت مجھ کو بے شمار ایسی باتیں معلوم ہوچکی ہیں جو کسی اور کو معلوم نہیں ہوسکتیں۔ میں یہ چاہتا کہ تم مجھ کو اندر کی اور راز کی باتیں بتادو اور پھر مجھ کو بتاؤ کہ میں اس کو خودکشی لکھوں یا کروں''۔

میں نے اس شخص کے ساتھ گہرے دوستوں والی ہمدردی کا رویہ اختیار کرلیا

میں اس کو دھوکہ دے رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ وہ میرے دھوکے کے جال میں آرہا تھا۔ اسی لب و لہجے اور انداز میں باتیں کرتے کرتے میں اپنے مطلب کی بات پر آگیا۔

''دیکھو سراج بھائی!'' — میں نے ایسے انداز سے کہا جیسے میں بے بس اور مجبور انسان ہوں — ''میں نے یہ جو کہا ہے کہ میں جن بھوت یا فرشتہ نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو یہاں بیٹھے بٹھائے اپنے آپ ہی کوئی بات معلوم نہیں ہوجاتی، یہ مجھ کو لوگ اور میرے مخبر آکر بتاتے ہیں۔ ایسے ہی تم بھی کچھ بتاؤ گے تو میں ان سب باتوں کی جمع تفریق اور ضرب تقسیم کرکے کسی نتیجے پر پہنچوں گا...... اگر تم اس کو قتل کا وقوعہ سمجھتے ہو تو مجھ کو پکا شبہ رفاقت پر ہے۔ مجھ کو سب پتہ ہے کہ رفاقت جیسے بدمعاش آدمی کا تمہاری اور تمہاری بیوی کی زندگی میں کیا عمل دخل تھا''۔

میں اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا کہ کیا تبدیلی آتی ہے۔ وہ میری اس بات پر چپ رہا اور صاف نظر آتا تھا کہ نظریں نیچے کرکے سوچ میں چلا گیا تھا۔

''تم نے اچھا کیا تھا کہ اس شخص سے تعلق توڑ لیا تھا'' — میں نے کہا — ''تمہاری بیوی نے بھی اس کی دوستی ختم کردی تھی...... مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اپنی بیوی اور رفاقت کی دوستی تم نے ختم کروائی تھی۔ اپنی بیوی کو پہلے اتنی آزادی دینی ہی نہیں تھی لیکن تم نے شاید شرافت میں آکر بیوی کو کھلی چھٹی دے دی تھی''۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں'' — سراج نے کہا — ''میں نے صرف شرافت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے اتنی آزادی دی ہوئی تھی کہ مجھ کو اس کے ساتھ بہت ہی پیار تھا۔ مجھ پر تو وہ اپنی جان نثار کرتی تھی''۔

''تم شاید بہت دیر سے سمجھے تھے کہ بیوی اور یہ بدمعاش شخص رفاقت مل کر تمہیں دھوکہ دے رہے ہیں'' — میں نے کہا — ''پھر تمہاری اور بیوی کی آپس میں تُو تُو مَیں مَیں بھی ہوئی''۔

''جی ہاں صاحب!'' — سراج نے کہا — ''ہماری آپس میں جھک جھک تو ہوئی تھی لیکن میں نے بیوی کو صاف کہہ دیا تھا کہ اپنا آپ بدلو نہیں تو میں طلاق کی بجائے تمہیں ایسی موت دوں گا کہ دنیا دیکھے گی''۔

وہ جان نہ سکا کہ میں اس کی زبان سے ایسی ہی باتیں اگلوا رہا ہوں، اس نے یہ بات بڑے فخریہ لہجے میں کہی اور میں نے اس کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس

جیسے غیرت مند آدمی ایسے ہی کیا کرتے ہیں۔ وہ اور زیادہ چھونک میں آ گیا۔ میں اس کو اسی پوزیشن میں لانا چاہتا تھا اور اللہ نے مجھ کو کامیابی عطا فرما دی۔ یہ ایک خاص طریقۂ گفتگو ہوتا ہے جس کی پولیس والوں کو مہارت حاصل ہوتی ہے۔ وہ تو پتھروں سے بھی باتیں کہلوالیا کرتے ہیں۔

''میں نے ایک اور بات بھی سنی ہے''——میں نے کہا——''بیوی نے تمہیں دھمکی دی تھی کہ تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی...... میرا خیال ہے کہ اس نے رفاقت کی شہ پر تمہیں یہ بات کہی ہوگی''۔

''ہاں صاحب!''——سراج نے کہا——''اس کی اسی دھمکی نے میری مردانگی کو جگا دیا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ لوگ مجھ کو زن مرید کہتے ہیں لیکن بیوی کی مجھ کو قتل کی دھمکی اور لاش غائب کر دینے کی دھمکی نے مجھ کو غیرت مند خاوند بنا دیا جو اپنی بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتا تھا پھر میرے بھائی نے میری غیرت کو جگایا اور ایک بڑے ہی پیارے دوست نے مجھ کو حقیقت حال بتائی تو میں نے رفاقت کو گھر آنے سے منع کر دیا۔ اس نے پہلے میرا شک رفع کرنے کے واسطے بڑی چکنی چپڑی باتیں کیں لیکن میں اب پہلے والا سراج نہیں رہا تھا جو اس کے دھوکے میں آ جاتا۔ میں نے اس کو بڑی صاف اور کھری باتیں کہہ دیں تب اس نے مجھ کو یہ دھمکی دی کہ سراج، ہوش میں آؤ ورنہ اپنی بیوی کو ڈھونڈتے پھرو گے''۔

سراج نے جب رفاقت کے یہ الفاظ سنائے تو میں نے اسی پوائنٹ کو پکڑ لیا اور سوال در سوال اور پھر جرح شروع کر دی۔ سراج کم عقل آدمی نہیں تھا، وہ مجھ کو ہر سوال کا جواب واضح کر کے دیتا رہا۔ سراج پر قتل کا شک تو قائم رہا لیکن زیادہ تر شک رفاقت کی طرف جاتا تھا۔

یہ تو بلاشبہ کہا جاتا تھا کہ رفاقت صاحب حیثیت اور بدمعاش آدمی ہے اور اس کو ڈھنگ آتا ہے کہ بدمعاشوں اور جرائم پیشہ لوگوں کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے پھر بھی میں سوچتا تھا کہ یہ بات قتل تک پہنچنے والی نہیں تھی اور اس زمانے میں، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں قتل کا اقدام کم ہی کسی کے ذہن میں آتا تھا۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ ایسی صورت پیدا ہوگئی ہوگی کہ رفاقت ایک لمحے کے واسطے پاگل ہوگیا اور اس نے حسنہ کو قتل کر دیا لیکن یہ خیال بھی آیا کہ اس نے سراج کو کیوں قتل نہ کیا یا کروایا؟ ...... میں نے کچھ خود دماغ لڑایا اور کچھ سراج سے باتیں پوچھیں تو میرا دماغ ایک ہی جگہ اٹکا رہا جہاں سراج پر ہی شک تھا

اور زیادہ شک رفاقت پر ہُوا۔ ایک اور ضروری بات دماغ میں آ گئی۔

''قتل کی صبح تم کہاں تھے سراج بھائی!''——میں نے پوچھا——''اگر تم گھر میں ہی تھے تو یہ واردات نہ ہوتی...... تم گھر واپس کتنے بجے آئے تھے؟''

سراج کو شاید احساس نہیں ہُوا تھا کہ میں کتنا اہم سوال پوچھ رہا ہوں اور یہ سوال اس کو پھانسی کے تختے پر پہنچا سکتا ہے...... آج جب میں بیٹھا یہ روئیداد تحریر کر رہا ہوں، مجھ کو وہ وقت اس طرح یاد آ گیا ہے جیسے میرے سامنے ایک فلم چل رہی ہو۔ اس کا جواب مجھ کو یاد ہے۔

''میں صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ گھر سے نکلا تھا——اس نے کہا——''پھر کچھ وقت اس طرح گزر گیا کہ اُسے مل، اُس کے پاس بیٹھ، کسی کے ساتھ ویسے ہی کوئی بات کی اور کسی کے ساتھ کاروباری بات ہوگئی اور پھر میں کچہری چلا گیا۔ وہاں زمین کے کاغذات کا ایک کام تھا۔ گرداور نے وہاں بہت وقت ضائع کر دیا۔ وہاں سے واپس بازار میں آیا، وقت دیکھا بارہ بج چکے تھے۔ میں کھانے کے لئے گھر آیا۔ اس وقت آندھی بہت تیز تھی۔ گھر میں داخل ہُوا تو آگے بیوی کو اس حالت میں فرش پر پڑا دیکھا جو حالت آپ نے بھی دیکھی تھی''۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کا وقت گیارہ ساڑھے گیارہ کے درمیان کا لکھا گیا تھا۔ سراج کو تو موت کے اس وقت کا علم ہی نہیں تھا نہ اس کو بتانے کی کوئی ضرورت تھی۔ میں نے اس وقت کو ذہن میں رکھ کر اس سے پوچھا کہ وہ گیارہ بجے اور پھر اس کے بعد کہاں تھا یا کہاں کہاں گیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ سوچ کر بتاتا ہے۔

اس نے یاد کیا اور دو نام بتائے۔ اس نے ایک بار پھر سوچا اور کہنے لگا کہ گیارہ بجے وہ کچہری سے نکلا تھا یا وہیں تھا۔ اس کے بعد جن دو آدمیوں کے پاس وہ گیا ان میں ایک ہندو آڑھتی تھا اور دوسرا مسلمان دکاندار تھا۔

میں نے یہ دونوں نام اپنے ذہن میں نوٹ کر لئے۔ میں یہ سراغ لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وقوعہ کے وقت سراج گھر میں تھا یا گھر سے باہر تھا۔ سراج کو اپنے دفتر میں بیٹھا رہنے دیا اور باہر نکلا۔ اے ایس آئی کو الگ کر کے کہا کہ وہ پہلے کچہری جائے، گرداور سے ملے اور پوچھے کہ سراج اس کے پاس کس وقت آیا اور کس وقت رخصت ہُوا تھا۔

قصبے کی چھوٹی سی کچہری تھی جہاں ایک ہی گرداور تھا اور دو تین پٹواری تھے اور تحصیل

کا باقی عملہ تھا۔ اے ایس آئی کو میں نے اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ کیا کام کر کے آئے گا۔ وہ اس کام کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس کام کی اہمیت کو بھی جانتا تھا۔ ویسے بھی مجھ کو اس اے ایس آئی کی طرف سے ہیرا پھیری کا ذرا سا بھی خطرہ نہیں تھا۔ وہ چلا گیا اور میں نے اپنے دفتر میں جا کر سراج کو باہر بیٹھنے کے واسطے کہا اور رفاقت کو بلایا اور اپنے سامنے بٹھا لیا۔

رفاقت واقع ہی خوبرو جوان تھا۔ سراج بھی ٹھیک ٹھاک جوان تھا لیکن رفاقت کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ حسنہ کا ذوق یقیناً اچھا تھا جس نے رفاقت کو پسند کیا تھا لیکن اب مجھ کو رفاقت اور سراج میں ایک فرق نظر آ رہا تھا۔ فرق یہ تھا کہ سراج میرے سامنے آ کر بالکل ہی نہیں گھبرایا نہ ڈرا اور اس نے جو بھی بات کی وہ اعتماد کے ساتھ کی۔ اس کے مقابلے میں رفاقت کے چہرے اور بیٹھنے کے انداز سے صاف گھبراہٹ نظر آتی تھی۔ اگر میں غور سے دیکھتا تو مجھ کو اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کانپتی نظر آتیں۔

''رفاقت یار!'' — میں نے کہا — ''تمہاری سوہنی کو کیا غم لگا ہوا تھا کہ اس نے خودکشی کر لی؟''

''میں کیا بتا سکتا ہوں جناب!'' — رفاقت نے جواب دیا — ''یہ مرنے والی کو معلوم ہو گا یا اس کا خاوند جانتا ہو گا۔ میرا تو ان کے ساتھ کوئی ایسا تعلق نہیں تھا۔ لوگوں کی طرح میں نے بھی سنا اور افسوس ہوا کہ یہ عورت معلوم نہیں کیا دکھ لئے اپنے ہی ہاتھوں مر گئی''۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں مری ہے؟'' — میں نے پوچھا۔

''جیسا لوگ کہتے ہیں ویسے ہی میں کہہ رہا ہوں'' — رفاقت نے ایسی آواز میں کہا جس میں ذرا لرزا سا تھا — ''یہ تو میں ان ہی نہیں سکتا کہ دن دیہاڑے اس کو کوئی قتل کر گیا ہے''۔

''تمہارا تو ان کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں تھا'' — میں نے انجان بنتے ہوئے کہا — ''پھر تم تو مجھ کو کوئی بات بتا ہی نہیں سکتے۔ معلوم نہیں کون کہتا تھا کہ سراج کے گھر تمہارا آنا جانا لگا رہتا تھا لیکن تم کہتے ہو کہ ان کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر تو میں نے خواہ مخواہ تمہیں یہاں بلا لیا۔ کچھ باتیں پوچھنی تھیں، چلو اسی بہانے تمہارے ساتھ سلام دعا ہو گئی''۔

''میں آپ کا خادم ہوں جناب!'' — اس نے گھریلو نوکروں کے لہجے میں کہا —

''میرے واسطے کوئی بھی خدمت ہو تو بندہ حاضر ہے''۔

''ہاں رفاقت!'' — میں نے کہا — ''ایک خدمت ہے جو کر دو تو ساری عمر تمہارا احسان نہیں بھولوں گا''۔

''حکم سرکار!'' — اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''خدمت یہ ہے کہ آج سچ بول دو'' — میں نے کہا — ''آؤ ذرا دوستوں کی طرح بات کریں اور پھر دیکھنا کہ میں دوستی کس طرح نبھاتا ہوں۔ اب جھوٹ کو الگ رکھ دو۔ میں نے تمہیں خواہ مخواہ ہی نہیں بلا لیا''۔

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکا۔ میں نے اس کے سارے جسم کی حرکت میں بے چینی نوٹ کی اور وہ کبھی دائیں اور بائیں دیکھنے لگتا۔ میں دراصل اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو ہی دیکھ رہا تھا — ''تم نے تو بات ہی جھوٹ سے شروع کی ہے'' — میں نے دوستانہ لہجے میں کہا — ''اور پھر جھوٹ پر ہی بات ختم کر دی ہے۔ میں تمہیں صاف لفظوں میں بتا دیتا ہوں کہ بات ختم نہیں ہو سکی، تمہارے اسی جھوٹ سے اب بات چلے گی...... سر اوپر اٹھاؤ اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو کہ سراج اور اس کی بیوی کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں تھا''۔

اس نے سر ذرا اوپر اٹھا کر میرے چہرے کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔ اب تو اس کے چہرے کا اچھا بھلا رنگ بالکل ہی پھیکا پڑ گیا۔

''کس کس کو جھٹلاؤ گے رفاقت!'' — میں نے کہا — ''کیا تم اس سورج کے آگے پردہ تان سکتے ہو جس نے ساری دنیا کو روشن رکھا ہوا ہے؟ اگر سارا شہر نہیں تو سراج کا پورا محلہ جانتا ہے کہ تم اس کے گھر اُس وقت جاتے تھے جس وقت سراج گھر نہیں ہوتا تھا...... صرف یہ بتا دو کہ تمہاری اس میاں بیوی سے دوستی کیوں ٹوٹی تھی؟''

اس نے میرے منہ کی طرف دیکھا، دو چار سیکنڈ چپ رہا پھر ڈری ڈری سی آواز میں بولا — ''مجھ کو خیال آیا تھا کہ اس سے میری بدنامی ہوتی ہے''۔

''کیا حسنہ بدنام عورت تھی؟'' — میں نے کہا — ''وہ صرف تمہاری وجہ سے بدنام ہوئی''۔

یہ تو بڑی لمبی باتیں ہیں جو میں نے اس کے ساتھ کیں اور اس کی وہ باتیں سنیں جو اس نے بڑے ہی اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں کیں۔ ظاہر ہے وہ جھٹ بول رہا تھا لیکن اس

کے پاؤں ہل گئے تھے۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر میں نے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔

''میری ایک گزارش سن لیں جناب عالی!''—اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا—''میں اس ڈر سے جھوٹ بولتا رہا ہوں کہ مجھ پر قتل کا شک نہ ہو۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے ساتھ میرا گہرا تعلق تھا''۔

اس نے ان باتوں میں جو مجھ کو دوسروں سے معلوم ہو چکی تھیں، بعض باتیں مان لیں لیکن ابھی تک وہ جھوٹ بول رہا تھا۔

''ابھی تو میں تمہاری بیوی کو یہاں بلاؤں گا''—میں نے کہا—''وہ باہر سڑک پر کھڑے ہو کر چلا چلا کر لوگوں کو سنائے گی کہ حسنہ کے پیچھے تم اس بیوی کے ساتھ کیا سلوک کرتے رہے ہو''۔

اب تو وہ ایسا چونکا اور بدکا جیسے اسے بچھو نے ڈس لیا ہو۔ اس کا چہرہ لاش کی طرح بے نور ہو گیا۔ جوانی کی چمک دمک بالکل غائب ہو گئی۔ میری یہ چوٹ اس کے واسطے قابل برداشت نہیں تھی۔ اب تو اس کے منہ سے بات بھی نہیں نکلتی تھی۔ میرے منہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

حسنہ کی ایک عیاری

''میری ایک آخری بات سن لو رفاقت!''—میں نے کہا—''تم جو حرکتیں پردوں کے پیچھے کرتے رہے ہو وہ سب مجھ تک پہنچ چکی ہیں۔ تمہاری بیوی نے سراج کے گھر جا کر اس کی بیوی کی بے عزتی کی۔ تم نے اپنی بیوی کو مارا پیٹا، تم اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتے تھے اور حسنہ سے بھی کہہ رہے تھے کہ وہ اپنے خاوند سے طلاق لے لے، اس نے انکار کر دیا اور تم دونوں میں ناراضگی ہو گئی...... میں اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ دیکھو رفاقت! مان جاؤ تم حسنہ کے قاتل ہو۔ میں تمہاری اتنی زیادہ مدد کر سکتا ہوں کہ اس وقوعہ کو خودکشی لکھ دوں گا لیکن تمہارا اقبال جرم ضروری ہے جو میں ضائع کر دوں گا۔ نہیں مانو گے تو تمہاری یہاں بہت ہی بُری حالت ہو جائے گی''۔

''حضورِ والا!''—رفاقت نے کہا—''مجھ پر یہ الزام بالکل غلط ہے کہ میں نے حسنہ کو قتل کیا ہے۔ میں جھوٹ اس واسطے بول رہا تھا کہ ایک خاص بات پر پردہ ڈالنا تھا۔

اب میں وہ بات بتا دیتا ہوں اور شاید آپ کو حسنہ کا قاتل مل جائے لیکن میں قتل کی عینی شہادت نہیں دے سکتا''۔

اس نے یہ تسلیم کیا کہ حسنہ کے ساتھ اس کے قابل اعتراض مراسم تھے پھر جس طرح حسنہ کے ساتھ اس کی چپقلش اور ناراضگی ہوئی وہ بھی اس نے خود سنائی اور کہا کہ پہلے اس نے حسنہ کی منت سماجت کی تھی کہ وہ اس کے ساتھ تعلق نہ توڑے پھر اس کو دھمکیاں دی تھیں۔

''حسنہ کے ساتھ میرے تعلقات جیسے بھی تھے وہ بتا دیا ہے''—رفاقت نے کہا—''لیکن آپ یہ شاید نہ سمجھ سکیں کہ میرے دل میں اس عورت کی کتنی زیادہ اور کیسی محبت تھی۔ میرا اس کے ساتھ تعلق صرف جسمانی نہیں بلکہ یہ روحانی تعلق تھا۔ اس کو میں نے بہت دھمکیاں بھی دیں لیکن وہ ضد میں آ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے بغیر جیسے میں زندہ ہی نہیں رہ سکوں گا۔ وقوعہ کے روز مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں اس کے گھر چلا گیا۔ میں اُس وقت اس کے گھر گیا جب سراج اپنے کام کاج کو جا چکا تھا......

''یہ وہ وقت تھا جب آندھی چلی تھی اور ہر طرف گرد و غبار اڑ رہا تھا۔ میں اس ارادے سے گیا تھا کہ حسنہ کے قدموں میں سر رکھنا پڑا تو رکھ دوں گا اور اسے راضی کروں گا۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ مجھ کو دیکھ کر غصہ جھاڑنے لگی لیکن میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور محبت کی بھیک مانگنے لگا۔ وہ ذرا سی نرم ہوئی تو میں نے دھمکیوں کی معافی مانگی اور بات ابھی آگے بڑھی نہیں تھی کہ سیڑھیوں میں سے کسی آدمی کی آواز آئی۔ وہ آدمی حسنہ کو پکارتا سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ حسنہ نے کہا کہ یہ ان کا پڑوسی ہے، معلوم نہیں کیا لینے آ رہا ہے......

''حسنہ نے مجھ کو اشارہ کیا تو میں ساتھ والے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ مجھ کو حسنہ کی آواز سنائی دی کہ آؤ چاچا جی، اس آندھی میں آپ کیسے آن اترے! آئیں بیٹھیں...... میں نے وہاں زیادہ رکنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے یہ دیکھ لیا کہ اس شخص سے حسنہ کو کوئی خطرہ نہیں۔ حسنہ نے اس کو چاچا کہا تھا۔ پہلو والی چھوٹی گلی والا دروازہ اسی کمرے کا تھا۔ میں اس دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد مجھ کو کچھ معلوم نہیں کیا ہُوا۔ پھر بارش بڑی تیز برسنے لگی اور میں نے دوبارہ حسنہ کے گھر جانا مناسب نہ سمجھا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت سراج گھر کھانے کے واسطے آیا کرتا ہے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد کسی نے بتایا کہ حسنہ اپنے گھر کے فرش پر مری ہوئی پڑی ہے۔ یہ بھی پتہ لگا کہ سراج گھر آیا تو

اس نے حسنہ کی لاش دیکھی اور محلے والوں کو بتایا''۔

میں نے رفاقت سے کرید کرید کر پوچھنا شروع کر دیا کہ وہ شخص کتنے بجے سیڑھیوں سے اترا اور کمرے میں گیا تھا اور پھر رفاقت کتنی دیر دوسرے کمرے میں رہا اور تقریباً کتنے بجے وہاں سے نکلا تھا۔ رفاقت نے اپنے دماغ پر زور دیا اور سوچ سوچ کر اس نے جو جواب دیا اس سے وہی وقت بنتا تھا جو پوسٹ مارٹم میں موت کا وقت لکھا تھا۔

میرے واسطے اب سوچنے اور معلوم کرنے والی بات یہ تھی کہ اس چاچے نے اگر حسنہ کو قتل کیا ہے تو اس کا باعث کیا تھا۔ کیا اس شخص نے حسنہ کی جبری آبروریزی کرنے کی کوشش کی تھی اور مزاحمت اور ناکامی کی صورت میں حسنہ کو قتل کر دیا۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں یہی شہادت دیتی تھیں کہ مزاحمت اور دھینگا مشتی ہوئی ہے پھر بھی یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ چاچا کیا اتنے بُرے کردار کا آدمی تھا کہ اس نے حسنہ پر دست درازی کی؟...... میرے پاس رفاقت ہی تھا جو کوئی نہ کوئی بات بتا سکتا تھا۔ وہ اس کو یقیناً جانتا ہو گا۔ میں نے رفاقت سے پوچھا کہ یہ کیسا آدمی ہے۔

''بڑا زبردست مذہبی آدمی ہے''۔۔۔ رفاقت نے بتایا۔۔۔ ''اس کی عمر ساٹھ سال سے شاید دو تین سال کم ہو گی۔ جہاں جاتا ہے اور جس سے بھی ملتا ہے اس کے ساتھ اسلام کے اصولوں کی باتیں ضرور کرتا ہے۔ اس کی بعض حرکتیں ایسی ہیں کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے دماغ میں کوئی نقص ہے۔ دو مہینے پہلے اس کی ایک نوجوان بیٹی نے خودکشی کر لی تھی۔ جس طرح حسنہ کے گلے سے دوپٹہ لپٹا ہوا تھا بالکل اسی طرح اس شخص کی بیٹی کی لاش کے گلے سے دوپٹہ لپٹا ہوا تھا اور لاش کی دونوں مٹھیاں دوپٹے کو دونوں طرف سے جکڑے ہوئے تھیں''۔

یہ بات سن کر میرے کان کھڑے ہوئے اور میرا دماغ اور زیادہ بیدار ہو گیا۔ مجھے اگر ذرا سا بھی شک ہوتا کہ اس شخص کی بیٹی نے شاید خودکشی نہیں کی اور بیٹی کی کسی بہت بُری حرکت پر اس شخص نے بیٹی کو اس کے دوپٹے سے پھانسی دے کر مار ڈالا ہے تو میں یہ شک کرتا کہ حسنہ کو بھی اسی شخص نے اسی طریقے سے مارا ہے لیکن کوئی وجہ ہونی چاہئے تھی۔

اس سے یہ مطلب نہ لیں کہ رفاقت سے میرا شبہ ہٹ گیا تھا۔ اس پر شبہ قائم تھا۔ اس نے جھوٹ بولا ہو گا لیکن بات اس نے ایسی سنائی تھی جو جھوٹ نہیں لگتی تھی۔ میں نے دماغ پر بہت زور دیا لیکن بات بنتی نظر نہیں آتی تھی۔

رفاقت نے ایک اور ہی بات سنا ڈالی۔ یہ بات اس کو حسنہ نے سنائی تھی۔ اس لڑکی کی خودکشی سے پہلے کا واقعہ ہے کہ حسنہ اپنی چھت پر گئی تو ادھر یہ لڑکی اپنی چھت پر کھڑی تھی۔ ان کی چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ کسی بات پر حسنہ کی اُس لڑکی کے ساتھ ترش کلامی ہو گئی اور لڑکی نے حسنہ کو کھری کھری سنا ڈالیں۔

حسنہ کی بابت رفاقت نے بتایا کہ بڑی ضدی اور ہٹ دھرم عورت تھی۔ اس نے اس لڑکی سے اپنی بے عزتی کا اس طرح انتقام لیا کہ ایک دو دنوں بعد کہیں لڑکی کا باپ حسنہ کے سامنے آ گیا۔ حسنہ نے لڑکی کے باپ کو کہا کہ اپنی بیٹی کا دھیان کرے وہ چھت پر جا کر فصیل کے ساتھ کھڑی ہو جاتی ہے اور پڑوسیوں کے ایک لڑکے کے ساتھ اشارے بازی کرتی ہے۔ وہ لڑکا اپنی چھت پر کھڑا ہوتا ہے۔ حسنہ نے یہ جھوٹ یہ سوچ کر بولا تھا کہ باپ لڑکی کو مارے پیٹے گا۔ حسنہ نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اگر ایسے ہُوا کہ لڑکی کے باپ نے حسنہ کو بلایا کہ وہ یہی بات لڑکی کے سامنے کرے تو حسنہ پہلے سے زیادہ جھوٹ بول کر ثابت کر دے گی کہ یہ لڑکی ایسی حرکتیں کرتی ہے۔

ایسا تو نہ ہُوا کہ لڑکی کے باپ نے حسنہ کو بلایا ہو لیکن اگلے دن یہ شور اٹھا کہ لڑکی نے اپنے دوپٹے سے اپنے آپ کو پھانسی دے لی ہے یہ خودکشی کا وقوعہ تھا...... مجھ کو یاد آیا کہ میں اس لڑکی کے گھر گیا تھا اور اس کی لاش دیکھی اور پوسٹ مارٹم کے واسطے ہسپتال بھجوائی تھی۔ لڑکی کے باپ، ماں اور گھر کے دوسرے افراد نے ایک ہی جیسا بیان دیا تھا کہ باپ نے لڑکی کو مارا پیٹا اور اس پر الزام لگایا تھا کہ چھت پر جا کر ایک لڑکے کو اشارے کرتی ہے اور اس طرح بے حیائی کی مرتکب ہوتی ہے۔

مجھ کو گھر والوں نے یہ بتایا تھا کہ لڑکی بہت ہی حساس طبیعت کی تھی اور اس کو جب غصہ آتا تھا تو پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگتی تھی۔ ایسے ہی بیانات تھے جن کے پیش نظر میں نے اس وقوعہ کو خودکشی لکھ دیا تھا۔ مجھ کو یہ بھی یاد آ گیا کہ لڑکی جیسی کیسی بھی تھی، لڑکی کا باپ عجیب سنکی اور پاگل سا تھا۔ یہ بھی مجھ کو بتایا گیا تھا کہ لڑکی کا باپ مذہب کی ایسی سخت پابندی کرتا ہے کہ لوگوں نے اس کا مذاق بنایا ہوا تھا۔

میں نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا کہ اس شخص کو میں شامل تفتیش کروں تو کس بنا پر کروں۔ ایک جواز بنتا تھا جو یہ تھا کہ پوسٹ مارٹم میں موت کا جو وقت لکھا تھا عین اُس وقت یہ شخص چھت کی طرف سے اترا اور حسنہ کے پاس گیا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اس سے

کیا کچھ پوچھوں گا۔ ایک کانسٹیبل کو اُسی وقت بھیجا کہ وہ اس شخص کو تھانے لے آئے۔ میں نے رفاقت سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ جاری رکھی۔

قاضی نے فیصلہ کر دیا

وہ آ گیا۔ اس کا اصل نام جو کچھ بھی تھا وہ میری ڈائری میں ہی محفوظ رہنے دیں میں اس کو قاضی لکھوں گا۔ یہ بتا دیتا ہوں کہ یہ شخص اپنے نام کے ساتھ قاضی لکھا کرتا تھا شکل صورت سے یہ قاضی معزز ہی لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا تاثر تھا جو صحیح معنو میں معزز افراد کے چہروں پر نہیں ہوتا۔ اس کی بابت جو باتیں بعد میں معلوم ہوئیں ان میں سے ایک دو باتیں میں یہیں بتا دیتا ہوں۔ کسی وقت سکول ٹیچر رہا تھا اور اپنے آپ کو دین سمجھنے لگا لیکن دین کی بابت اس کا علم نہایت معمولی تھا جو دیہات کے ملاؤں کا ہے۔ یہ بھی پتہ لگا کہ اس کا تعلق قاضی قبیلے یا کسی قاضی خاندان کے ساتھ نہیں بلکہ خود قاضی بناہُوا تھا اور یہ اس واسطے قاضی بنا ہوا تھا کہ دین اسلام کے مطابق فیصلے کرتا تھا۔ کسی نے اپنا کوئی مسئلہ یا کسی کے خلاف کوئی شکایت اس تک نہیں پہنچائی تھی کہ یہ فیصلہ کر یہ خود ہی قاضی بناہُوا تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ اس کا ہر فیصلہ اسلام کے عین مطابق ہوتا ہے۔

سراج کے بارے میں ایک بات یہ سن لیں۔ قاضی کے آنے کے کچھ ہی دیر بعد اے ایس آئی واپس آ گیا۔ وہ یہ رپورٹ لایا کہ وقوعہ کے وقت سراج اپنے گھر سے فلاں اور فلاں آدمی کے پاس بیٹھاہُوا تھا۔ اس کو انگریزی میں ALIBI کہتے ہیں مشتبہ وقوعہ کے وقت موقعۂ واردات سے بہت دور تھا یا موقعۂ واردات سے غیر حاضر اس رپورٹ نے سراج کو اس شک سے بَری کر دیا کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔ نے سراج کو جانے کی اجازت دے دی۔ رفاقت کو تھانے میں ہی بیٹھا رہنے دیا، اس ابھی مجھ کو ضرورت تھی۔ اس پر قتل کا شک بھی میرے دل میں موجود تھا۔

"یہ آپ کے محلے میں کیا ہو رہا ہے قاضی صاحب!" ——میں نے قاضی سے کہا "پہلے آپ کی بیٹی نے خودکشی کی تھی اور دو ہی مہینوں بعد آپ کی پڑوسن نے بالکل آپ کی بیٹی کی طرح دوپٹے سے اپنے آپ کو پھانسی دے لی۔ کیا آپ مجھ کو کچھ روشنی دکھا سکتے ہیں؟"

"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے" —— قاضی نے کہا —— "جس طرح کسی کی لکھی ہوئی ہوتی ہے وہ اسی طرح دنیا سے رخصت ہوتا ہے"۔

قاضی جب میرے سامنے بیٹھاہُوا تھا تو مجھ کو لوگوں کی وہ باتیں یاد آنے لگیں جو اس کی بیٹی کی خودکشی کے وقت لوگوں نے مجھ کو بتائی تھیں۔ یہ میں کچھ تو پہلے بیان کر چکا ہوں۔ یہاں مختصر بات یہ کہوں گا کہ اس شخص کا ذہنی توازن (لوگوں کی رائے کے مطابق) کبھی کبھی بگڑ جاتا تھا۔ اب وہ میرے سامنے بیٹھاہُوا تھا تو میں اس کے انداز سے محسوس کر رہا تھا کہ اس کو ذرا سا بھی احساس نہیں کہ کہاں بیٹھا ہے اور اس کو شاملِ تفتیش کیا گیا ہے۔ میں نے مذہب کے ایک مسئلے پر بات شروع کر دی۔ اس مسئلے کا تعلق جھوٹ کے ساتھ تھا۔ قاضی نے باقاعدہ وعظ شروع کر دیا جس میں دو آیاتِ قرآنی اور پھر دو تین احادیث کے حوالے دے دیئے۔ اس نے پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ میں نے اس کو تھانے کیوں بلایا ہے۔

"اب ایک بات بتائیں قاضی صاحب!" ——میں نے پوچھا —— "اُس روز جب آندھی چلی تو آپ حسنہ کے گھر کیوں گئے تھے؟"

"میں کسی حسنہ کے گھر نہیں گیا تھا" —— قاضی نے جواب دیا —— "کسی غیر عورت کے گھر جانا گناہِ کبیرہ ہے"۔

"قاضی صاحب!" ——میں نے کہا —— "آپ نے قرآن کی جو آیتیں مجھے سنائی ہیں، میں انہی آیتوں کے حوالے سے آپ کو کہہ رہا ہوں کہ مجھے صحیح جواب دیں"۔

اس کے چہرے پر نمایاں تبدیلی نظر آئی لیکن یہ ایسی نہیں تھی جیسے میں بیان کیا کرتا ہوں کہ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا یا پھیکا پڑ گیا یا لاش کی طرح ہو گیا۔ یہ تبدیلی جو قاضی کے چہرے پر آئی تھی عجیب سی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا چہرہ بگڑ گیا ہو۔ آنکھیں بھی جیسے پھر گئی ہوں۔ اس کو دورے کی حالت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر میں کہوں کہ اس کا چہرہ ذرا ٹیڑھا ہو گیا تھا تو غلط نہیں ہو گا۔ مجھ کو خیال آیا کہ لوہا گرم ہو گیا ہے اور اب ضرب لگانی چاہئے۔ مجھ کو اس کے چہرے کی اس عجیب تبدیلی سے ڈر جانا چاہئے تھا لیکن میں نے حوصلہ قائم رکھا۔

"تھانے میں آ کر جھوٹ تو ہر کوئی بولتا ہے" ——میں نے کہا —— "لیکن میں حیران ہو رہا ہوں کہ میرے قاضی صاحب جھوٹ بول رہے ہیں"۔

"شرعی قانون کا تقاضا کچھ اور ہے" —— قاضی نے کچھ اور ہی لہجے میں کہا —— "دو

گواہ لازمی ہوتے ہیں۔ کیا آپ دو گواہ پیش کر سکتے ہیں جو یہ کہیں کہ میں حسنہ کے گ
تھا؟''

''جی جناب قاضی صاحب!''—— میں نے کہا ''ایک گواہ باہر بیٹھا ہے اور
گواہ اللہ تعالیٰ ہے...... آپ حسنہ کو آوازیں دیتے سیڑھیاں اترتے گئے تھے۔ کیا یہ جھ
ہے؟''

اگر وہ یوں کہہ دیتا کہ وہ حسنہ کے گھر اترا تھا اور فلاں کام یا بات کہہ کر واپس آ گ
میرے دل میں یہ شک پیدا ہو جاتا کہ قتل کی واردات اس کے جانے کے بعد ہوئی
قاتل رفاقت ہے لیکن یہ شخص سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ یہ میرا تجربہ ہے اور آپ کا تجر
مشاہدہ بھی یہی ہوگا کہ دوسروں کو وعظ سنانے والوں کا اپنا کردار ایسا ہی ہوتا ہے جیسا
قاضی کا تھا۔ مجھ کو جھوٹ کو گناہ قرار دینے والی آیتیں اور حدیثیں سنانے والا خود جھوٹ
رہا تھا...... میں نے اس پر ایک بم پھینکا۔

''جناب قاضی صاحب!''—— میں نے کہا—— ''آپ صریح جھوٹ بول رہے
کہ آپ حسنہ کے گھر نہیں گئے تھے۔ آپ اس گناہ کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں
جناب حسنہ کی جبراً آبروریزی کرنا چاہتے تھے۔ دھینگا مشتی میں اس کی چوڑیاں
گئیں......''

''بکواس بند کرو''—— قاضی نے یک لخت بیدار ہو کر اور گرج کر کہا—— ''مجھ
تمہاری تھانیداری کا ڈر ہے نہ تمہارے تھانے کا۔ مجھ پر جھوٹا الزام مت عائد کرو''۔

اگر زمانہ آج کل کا ہوتا تو تھانیدار اس قاضی کو گولی مار دیتا اور اگلے روز اخبا
میں خبر شائع ہوتی کہ ایک دہشت گرد پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ اگر یہ نہیں تو تھا
اپنی یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا لیکن میں نے اپنے آپ کو بالکل ٹھنڈا رکھا۔ م
اس پر جو الزام عائد کیا تھا وہ سوچ سمجھ کر کیا تھا۔

''پھر آپ وہاں کیا کرنے گئے تھے؟''—— میں نے پوچھا اور ساتھ یہ بھی ک
''مجھ کو سو فیصد یقین ہے کہ آپ وہاں گئے تھے اور اس پر آپ پردہ ڈال رہے ہیں
مجھ سے نہ ڈریں، تھانے سے بھی نہ ڈریں، صرف اللہ سے ڈریں جس نے جھوٹ
کبیرہ کہا ہے''۔

اب اس کے چہرے پر ایسی تبدیلی آئی جس میں قہر اور غضب کی جھلک صاف

رہی تھی۔ اس نے جو جواب دیا اس کی مجھ کو بالکل ہی توقع نہیں تھی۔

''میں ایک عیار اور بدکار عورت کو سزا دینے گیا تھا''—— اس نے کہا۔

''لیکن اس کی سزا موت تو نہیں ہونی چاہئے تھی''—— میں نے کہا—— ''جہاں تک میں جانتا ہوں اسلام صرف قتل پر سزائے موت دیتا ہے''۔

''میں نے اسے قتل کی ہی سزا دی ہے''—— قاضی نے کہا—— ''اس شیطان عورت نے میری بیٹی کو میرے ہاتھوں قتل کروایا تھا۔ میں نے اس سے اپنی بیٹی کے خون کا انتقام لیا ہے''۔

یہ صحیح تھا کہ اس شخص کو ذہنی توازن کے بگڑ جانے کا دورہ پڑتا تھا لیکن مجھ کو بالکل امید نہیں تھی کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ یہ میرے واسطے ایک نیا تجربہ تھا۔ میں نے اپنا رویہ بدل دیا۔ بڑے تحمل اور بُردباری اور ہمدردی سے اس کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ اب میں اس کا مرید ہو گیا ہوں۔ یہ نہ سمجھیں کہ میں نے اس کے ساتھ یہی باتیں کی اور سنی تھیں جو تحریر کی ہیں، بڑی لمبی باتیں ہوئی تھیں اور میں نے اپنی عقل کا پورا پورا اور ہوشمندی سے استعمال کر کے اس کو راز کی بات پر لایا تھا۔

اس نے اپنا بیان دے دیا جو مختصراً یوں تھا کہ دو مہینے پہلے حسنہ نے اس قاضی کو کہا تھا کہ اس کی بیٹی چھت پر جا کر پڑوسیوں کے لڑکے کو اشارے کرتی ہے۔ یہ میں آپ کو رفاقت کی زبانی سنا چکا ہوں۔ قاضی نے کہا کہ حسنہ نے اس کو اس کی بیٹی کے خلاف اتنا زیادہ بھڑکا دیا جیسے اس کی بیٹی نے پڑوسیوں کے لڑکے کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر لئے ہوں۔

قاضی نے گھر جا کر بیٹی سے بازپُرس کی۔ چونکہ بیٹی پاک صاف تھی اور اس پر الزام بالکل جھوٹا اور بے بنیاد تھا اس واسطے اس نے باپ کو ذرا بدتمیزی سے جواب دیا۔ قاضی نے لڑکی کو یہ نہ بتایا کہ اس کو یہ بات حسنہ نے بتائی ہے۔ قاضی اس الزام کو صحیح سمجھ بیٹھا تھا۔

قاضی نے بیٹی کو صرف ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی بلکہ پورے گھر کے سامنے بیٹی کو دو تین تھپڑ مارے اور اس کو بدکار بھی کہا۔

اُسی رات جب سارے گھر والے سو گئے تھے، قاضی کا غصہ یا پاگل پن عود کر آیا۔ اس نے بیٹی کو جگایا اور خاموشی سے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں جاتے ہی اس نے بیٹی کے سر سے دوپٹہ اتارا اور بیٹی تو ظاہر ہے کہ سمجھ ہی نہیں سکی ہوگی کہ باپ کیا کرنا چاہتا ہے، قاضی نے دوپٹہ اس کی گردن کے اردگرد لپیٹ کر دونوں طرف سے اتنے زور سے

کھینچا کہ لڑکی کا سانس رک گیا اور وہ مرگئی۔

قاضی نے قتل کی اس واردات کو خودکشی ظاہر کرنے کے واسطے مری ہوئی لڑکی کے دونوں ہاتھ اس طرح دوپٹے پر رکھ دیئے اور ہاتھوں کی مٹھیاں بنادیں جیسے لڑکی نے خود اپنی گردن کے گرد دوپٹہ لے کر دونوں طرف کھینچا ہو۔ قاضی بڑے آرام سے آ کر لیٹ گیا۔
اس نے مجھ کو بتایا کہ وہ کسی حد تک مطمئن تھا کہ اپنی بدکار بیٹی کو سزائے موت دے دی ہے۔ یہ ایک باپ کا نہیں بلکہ ایک قاضی کا فیصلہ تھا۔

صبح قاضی فجر کی نماز کے لئے اٹھا اور اس کمرے میں گیا جس میں اس کی بیٹی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ قاضی نے شور مچادیا اور گھر کے تمام افراد اکٹھے ہو گئے۔ قاضی نے خودکشی کی وجہ یہ بیان کی کہ اس نے بیٹی کو سب کے سامنے مارا پیٹا اور بُرا بھلا کہا تھا اور یہ الزام عائد کیا تھا۔ گھر کے دیگر افراد نے بھی یہی بیان دیا اور مجھ کو یہ بھی بتایا گیا کہ لڑکی بہت حساس تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت محسوس کرتی تھی۔ مختصر یہ کہ گھر کے افراد اور خاص طور پر قاضی نے مجھ کو قائل کرلیا کہ یہ خودکشی کی واردات ہے۔

یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ اس وقت قاضی نے مجھ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کو حسنہ نام کی ایک پڑوسن نے بتایا تھا کہ اس کی بیٹی یہ حرکتیں کرتی ہے۔ میں نے زیادہ کریدنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔

قاضی نے اپنے بیان میں آگے چل کر کہا کہ اس کی بیٹی کی خودکشی کے ایک مہینہ بعد محلے کے ایک آدمی نے اس کو بتایا کہ حسنہ کہتی ہے کہ اس نے قاضی کی بیٹی پر جھوٹا الزام عاید کیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک روز چھت پر اس کی اور لڑکی کی کسی بات پر لڑائی ہوگئی تھی۔ لڑکی نے حسنہ پر بدکاری کا الزام لگایا تھا۔ قاضی کو یہ بات سنانے والے آدمی کو اس کی بیوی نے سنائی تھی۔

ایک روز ساتھ والی گلی میں قاضی کا آمنا سامنا حسنہ کے ساتھ ہوگیا۔ قاضی نے اس سے پوچھا کہ یہ بات کہاں تک سچی ہے۔ حسنہ نے صاف کہہ دیا کہ اس نے تو شک میں بات کی تھی۔

''چاچا جی!'' ___ حسنہ نے قاضی کو کہا ___ ''میرے دل میں آپ کے گھرانے کی بہت عزت ہے۔ آپ کی بیٹی بڑی ہی نیک اور پاک تھی۔ میں برداشت نہ کرسکی کہ وہ چھت پر جا کر اِدھر اُدھر جھانکے۔ میں نے تو آپ کو صرف یہ بتایا تھا کہ بیٹی کو منع کردیں کہ فصیل

کے ساتھ کھڑی نہ ہوا کرے، اس سے بیٹی کا پردہ نہیں رہتا۔ آپ نے بیٹی کو گھر جا کر مارا پیٹا اور اس بیچاری نے خودکشی کرلی''۔

حسنہ نے بڑی ہی چالاکی اور عیاری سے بات کی تھی جیسے یہ کوئی معمولی سی بات ہو۔
قاضی کی حالت یہ ہوگئی کہ وہ تنہائی میں روتا اور اپنی بیٹی کو یاد کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ تین راتیں ایسے بھی ہوا کہ آدھی رات کے وقت قاضی کی آنکھ کھل گئی اور وہ بیٹی کی قبر پر چلا گیا، قبر پر ہاتھ پھیر پھیر کر روتا اور بیٹی سے معافی مانگتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی قاضی کی ذات میں یا دل میں حسنہ کے خلاف غصہ بھرتا گیا جو آخر انتقام کی صورت اختیار کرگیا۔

''آخر یوں ہُوا جناب!'' ___ قاضی نے بیان دیتے ہوئے کہا ___ ''آج سے پانچ روز پہلے رات کا واقعہ ہے میں سو ہی نہ سکا۔ آدھی رات کے بعد میں قبرستان چلا گیا اور بیٹی کی قبر کے ساتھ لپٹ کر بیٹی سے معافیاں مانگیں اور مجھ کو قبر سے آواز آئی یا اس کو آپ اشارہ کہہ لیں کہ بیٹی نے مجھ کو کہا کہ میں آپ کو معاف کردوں گی، شرط یہ ہے کہ حسنہ کو زندہ نہ رہنے دیں، اس نے مجھ کو آپ کے ہاتھوں مروایا ہے''۔

یہ نہ تو اس کی بیٹی کی آواز تھی نہ یہ قبر کا اشارہ تھا، یہ قاضی کا اپنا خیال تھا جو ایک خوفناک ارادہ بن گیا تھا۔ قتل والے دن جب آندھی چلی تو قاضی اپنے مکان کی چھت پر چلا گیا۔ شاید اوپر کچھ کپڑے پڑے ہوئے تھے جو وہ نیچے لانے گیا تھا۔ اپنی چھت سے اس کو حسنہ کے گھر کا صحن اور برآمدہ نظر آیا اور کمرے بھی اور اس کو حسنہ ایک کمرے میں جاتی نظر آئی۔ قاضی کو معلوم تھا کہ سراج صبح سویرے نکل جاتا ہے، حسنہ کے بچے سکول چلے جاتے ہیں اور گھر میں حسنہ اکیلی ہوتی ہے۔

قاضی پر پاگل پن طاری ہوگیا۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ حسنہ اکیلی نہیں بلکہ اس کا آشنا رفاقت اس کے ساتھ کمرے میں موجود ہے۔ قاضی اپنی چھت سے حسنہ کے گھر کی چھت پر آ گیا اور سیڑھیاں اتر آیا۔ کمرے میں گیا تو حسنہ اس کو دروازے میں ملی۔ قاضی سیڑھیاں اترتے حسنہ کو پکارتا آ رہا تھا۔ یہ تو آپ پڑھ چکے ہیں کہ رفاقت دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا اور پھر پچھلے دروازے سے نکل گیا تھا۔

''تم نے میری بے گناہ بیٹی کو میرے ہاتھوں مروایا ہے'' ___ قاضی نے حسنہ کو کہا ___ ''میری بیٹی نے خودکشی نہیں کی تھی، میں نے اس کو اپنے ہاتھوں قتل کیا تھا''۔

''چاچا جی!'' ___ حسنہ نے تڑپ کر کہا ___ ''یہ آپ نے کیا کیا؟''

قاضی نے ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کیا، جھپٹا مار کر حسنہ کے سر سے دوپٹہ کھینچا اور پیشتر اس کے کہ حسنہ قاضی کا ارادہ بھانپ سکتی اس کا دوپٹہ اس کی گردن کے اردگرد لپیٹ چکا تھا اور قاضی نے دوپٹے کو دونوں طرف سے اتنی زور سے کھینچا ہُوا تھا کہ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ حسنہ تندرست عورت تھی، اس نے زور زور سے ہاتھ پیچھے کو مارے۔ قاضی اس کے پیچھے کھڑا دوپٹہ کھینچے ہوئے تھا۔

حسنہ اس پھندے سے آزاد ہونے کو ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اس نے اتنی زور زور سے دونوں بازو پیچھے کو کئے کہ اس کی کلائیاں قاضی کے سر سے ٹکرائیں اور چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ ایک بار تو پھندا ذرا ڈھیلا ہو گیا۔ اُس وقت حسنہ نے دوپٹے اور اپنی گردن کے درمیان انگلیاں ڈالیں لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ قاضی نے اس کو جان سے مار کر ہی دم لیا۔ لاش کو بڑے آرام سے فرش پر لٹایا اور جس طرح قاضی نے اپنی بیٹی کی مٹھیاں بنا کر ان میں دوپٹہ پکڑا دیا تھا اسی طرح حسنہ کے ہاتھوں کی بھی مٹھیاں بنائیں اور دونوں طرف دوپٹہ مٹھیوں میں دے دیا پھر مٹھیاں وہیں اکڑ گئیں۔ قاضی سیڑھیوں سے اوپر گیا اور اپنے گھر اتر گیا۔ آندھی نے اس کو بہت فائدہ دیا۔

اُسی روز شام سے ذرا پہلے جب بارش تھم کر پھوار بن گئی تھی قاضی اپنی بیٹی کی قبر پر گیا اور کہا کہ لو بیٹی، میں نے تمہارے خون کا بدلہ لے لیا ہے، اب مجھ کو معاف کر دو۔

میں نے قاضی کو باقاعدہ گرفتار کر لیا اور مقدمہ تیار کرنے لگا۔ یہ تو پولیس کی کارروائیاں ہوتی ہیں جو میں نے دو دن صرف کر کے مکمل کیں اور چالان کورٹ میں پیش کر دیا۔ قاضی نے ایک مجسٹریٹ کو دفعہ 164 کے تحت بیان اقبال جرم قلمبند کروا دیا تھا۔

قاضی نے ایک کی بجائے دو قتل کئے تھے اور اس نے دونوں کا اقبالی بیان دے دیا۔

سیشن کورٹ سے اس کو سزائے موت دی گئی تھی لیکن اپیل میں ہائیکورٹ نے سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا۔

حسنہ نے ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی کو اس کے باپ کے ہاتھوں مروا دیا تھا۔ اس نے اپنے کئے کی سزا پالی اور اسی طرح قتل ہوئی جس طرح قاضی نے اپنی بیٹی کو قتل کیا تھا۔

✻ ✻ ✻

رات، ریل اور رقعے

آج قتل اور ڈکیتی کی واردات اور پھر اس کی تفتیش سنا کر جب یہ کہتا ہوں کہ میں نے ملزم پکڑ لئے تھے اور ان کو سزا دلائی تھی تو مجھ کو اس طرح محسوس ہوتا ہے جیسے میں جھوٹ بول رہا ہوں یا جیسے یہ ایک فضول کام تھا جو میں کرتا رہا ہوں۔ ہماری نوجوان نسل کو تو بالکل ہی معلوم نہیں کہ جو میں سناتا ہوں اور جو میں کرتا رہا ہوں یہی پولیس کی اصل ڈیوٹی تھی اور جو تھانیدار اپنی یہ ڈیوٹی پوری نہیں کرتا تھا اُس کو ترقی نہیں ملتی تھی اور اس طرح بھی ہوتا کہ نکمے تھانیدار کی تنزلی ہو جایا کرتی تھی۔ آج کے لوگ پرانی باتوں کو صرف اس واسطے حیران ہو کر سنتے اور پڑھتے ہیں کہ آج کل قتل اور ڈکیتی تو روزمرہ کا معمول ہے۔ ایک ہی بار پورا پورا خاندان کاٹ دیا جاتا ہے اور دن دیہاڑے گھر میں ڈاکو آتے اور لوٹ کر چلے جاتے ہیں۔ نہ کوئی قاتل پکڑا جاتا ہے نہ کوئی ڈاکو۔ تھانے رپورٹ کرنے کے واسطے جاتے ہیں تو وہاں کوئی سنتا ہی نہیں بلکہ الٹا پریشان اور بے عزت کر کے تھانے میں سے نکال دیا جاتا ہے۔

میں جو تفتیش کی کہانیاں سنایا کرتا ہوں اور میرے استاد جناب احمد یار خان صاحب اور دوسرے انسپکٹر صاحبان جو کہانیاں سناتے ہیں، یہ پوری کی پوری سچی ہوتی ہیں اور یہ سنانے سے ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پبلک کو معلوم ہو کہ پولیس کا اصل فرض کیا ہُوا کرتا تھا اور انگریزوں کی حکومت میں جرائم کیوں اتنے کم ہوتے تھے۔ آپ صاحبان اخباروں میں اس طرح کی خبریں پڑھتے ہوں گے کہ کسی کے گھر کے ایک دو فرد قتل ہو گئے اور ان کے وارثوں نے کسی پر شک کا اظہار کیا جس کو اخباروں میں شائع کیا گیا لیکن اس کے ساتھ پولیس کی طرف سے یہ بیان بھی شائع ہوتا ہے کہ مقتول بدمعاش آدمی تھے اور اس وجہ سے قتل ہو گئے ہیں۔ یا کسی کی لڑکی اغوا ہو جاتی ہے اور لڑکی کے وارث رپورٹ میں کہتے ہیں کہ اس کو فلاں شخص نے اغوا کیا ہے تو پولیس بیان چھپواتی ہے کہ لڑکی اپنی مرضی سے اپنے آشنا کے ساتھ چلی گئی ہے۔

ایسی وارداتیں بھی ہوتی ہیں کہ دشمن آئے اور گھر کے کسی آدمی کا گلا گھونٹ کر قتل کیا اور اس کی لاش کے گلے میں پھندا ڈال کر پنکھے کے ساتھ یا درخت کے ساتھ لٹکا گئے تو پولیس نے فوراً فیصلہ لکھ دیا کہ اس شخص نے خودکشی کی ہے۔ مطلب یہ ہے پولیس اپنے فرائض سے دستبردار ہو گئی ہے۔

انگریزوں کے وقتوں کے لوگوں سے پوچھیں۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ قانون کی چکی کس طرح چلتی تھی اور اس چکی کو چلانے والے کتنی محنت اور مشقت سے اور پورے انصاف کے ساتھ دن رات اس کام میں لگے رہتے تھے۔ میں ایک واردات سناتا ہوں جس کو میں بڑی آسانی سے اور کسی خطرے کے بغیر خودکشی کی واردات لکھ سکتا تھا۔ میں آپ سب پر یہ رعب نہیں ڈالنا چاہتا کہ میں نے بہت بڑا کارنامہ کیا تھا اور مجھ کو اس کا انعام ملنا چاہئے...... نہیں جناب!...... انعام دینے والا صرف اللہ ہے، میں یہ بتا رہا ہوں کہ اُس زمانے میں ہر تھانے دار ایسے ہی اپنے فرائض دیانتداری سے پورے کیا کرتا تھا۔

یہ انبالہ چھاؤنی کی واردات ہے۔ مجھ کو صرف ایک مہینے کے واسطے اس تھانے میں تعینات کیا گیا تھا۔ اس تھانے کے اصل ایس ایچ او سب انسپکٹر خان عبدالرحیم خان بوجہ آپریشن گردہ ایک مہینے کی چھٹی پر تھے۔ ہسپتال میں ان کا آپریشن ہو گیا تھا۔ اس تھانے میں جو جونیئر سب انسپکٹر تھا وہ بھی کسی وجہ سے غیر موجود تھا اور پیچھے صرف ایک اے ایس آئی رہ گیا تھا۔ مجھ کو حکم ملا کہ اپنا تھانہ اپنے جونیئر سب انسپکٹر کے حوالے کر کے انبالہ کینٹ چلا جاؤں۔ جنگِ عظیم کی وجہ سے یہ تھانہ بڑا اہم تھا۔ دیگر افواج کے علاوہ وہاں توپ خانے کا سینٹر تھا اور ایئر فورس کے گراؤنڈ سٹاف کا بھی ٹریننگ سینٹر تھا اور پھر یہ بہت بڑا فلائنگ ٹریننگ سینٹر بھی تھا۔ دشمن کی جاسوسی بڑھ گئی تھی اور شہری لوگوں میں وارداتیں زیادہ ہو گئی تھیں۔ ان حالات میں اتنا بڑا اور اتنا اہم تھانہ ایک اے ایس آئی کے قابو میں آنے والی بات نہیں تھی۔

اس تھانے میں میرا ابھی تیسرا ہی دن تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے اور میں بوجہ مصروفیت ابھی تھانے ہی میں تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی میں نے فون اٹھایا تو کینٹ ریلوے سٹیشن کا سٹیشن ماسٹر بول رہا تھا۔ مجھ کو آج یہ یاد ہے کہ وہ کرسچین تھا لیکن ڈائری میں اُس کا نام نہیں لکھا ہوا اس واسطے نام بھول گیا ہوں۔

''انسپکٹر صاحب!''—— سٹیشن ماسٹر نے کہا—— ''تھوڑی دیر پہلے پسنجر ٹرین آئی

تھی۔ اس کے انجن ڈرائیور نے مجھ کو اطلاع دی ہے کہ آؤٹر سگنل کے قریب ایک آدمی گاڑی کے آگے آ گیا تھا اور شاید گاڑی کی ٹکر سے لائن پر گرا اور کٹ گیا ہے یا لائن کے باہر گرا ہے۔ میں نے اُسی وقت اپنا ایک ملازم اُس طرف دوڑا دیا کہ دیکھ آئے۔ اگر وہ آدمی زندہ یا مُردہ ہے تو فوراً آ کر اطلاع دے۔ ابھی میرا آدمی واپس آیا ہے اور اس نے اطلاع دی ہے کہ ایک جوان آدمی جو کپڑوں سے اس شہر کا معلوم ہوتا ہے ریلوے لائن کے باہر مَرا پڑا ہے اور کٹا ہوا نہیں۔ مَیں نے دو ملازم وہاں بھیج دیئے ہیں کہ لاش کے قریب کوئی نہ آئے اور ایسا نہ ہو کہ گیدڑ وغیرہ لاش کو خراب کرنا شروع کر دیں۔ میں نے انسانی فرض سمجھ کر آپ کو اطلاع دے دی ہے''۔

''آپ نے ڈرائیور کا پورا بیان لیا ہے؟''—— میں نے پوچھا۔

''نہیں انسپکٹر صاحب!''—— سٹیشن ماسٹر نے جواب دیا—— ''دلّی کی طرف سے میل ٹرین سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی اور پسنجر ٹرین کو فوراً کلیئرنس دینا تھا۔ مطلب یہ کہ ڈرائیور کو میں روک نہیں سکتا تھا اور میں خود مصروف ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے مختصر سی بات کی تھی اور چلا گیا''۔

ایک بات تو یہ نوٹ کریں کہ اُس وقت انسانی ہمدردی موجود تھی ورنہ سٹیشن ماسٹر کو کیا پڑی تھی کہ وہ تھانے اطلاع دیتا یا ڈرائیور سٹیشن ماسٹر کو بتاتا ہی نہ کہ وہ ایک آدمی کو مار آیا ہے۔ لوگ گاڑیوں کے نیچے اُس وقت بھی آتے رہتے تھے اور آج بھی آتے رہتے ہیں۔ اب یہ میرا کام تھا کہ اس حادثے کو گول کر جاؤں اور اگلے روز کہیں اور سے اطلاع آئے تو کوئی کارروائی کروں لیکن وہ کسی انسان کا بچہ تھا جو گاڑی کے آگے آ کر مارا گیا تھا۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا کہ ایک جوان آدمی کی لاش ویرانے میں پڑی ہوئی ہے اور اس کو گیدڑ وغیرہ کھا رہے ہیں۔

میں اپنے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا لیکن میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور جو جگہ سٹیشن ماسٹر نے بتائی تھی اُس طرف روانہ ہو گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ آؤٹر سگنل سٹیشن سے کتنی دور ہوتا ہے۔ رات گھپ اندھیری تھی اس واسطے ہم نے ٹارچیں ساتھ لے لی تھیں۔ پولیس کے پاس بڑی ٹارچیں ہُوا کرتی تھیں جن میں چار سیل ڈالے جاتے تھے۔

ہم لاش تک پہنچ گئے جو آؤٹر سگنل سے قریب نہیں بلکہ اس سے کچھ دور ریلوے سٹیشن

کی طرف ریلوے لائن سے تقریباً چار گز دور پڑی ہوئی تھی۔ صحیح معنوں میں لاش خون سے نہائی ہوئی تھی۔ لاش پیٹ کے بل پڑی ہوئی تھی۔ سارا خون پیٹھ سے نکلا تھا لیکن نظر سے یہ معلوم کرنا ممکن نہیں تھا کہ زخم کہاں کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔ لاش کو سیدھا کیا یعنی پیٹھ کے بل کیا اور ٹارچوں کی روشنی میں چہرہ دیکھا۔ وہ تو بالکل ہی جوان آدمی تھا اور پینٹ اور چہرے کی طرف کوئی زخم نہیں تھا۔ وہ شہر کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ یہ قتل کی واردات تو تھی نہیں۔ اس واسطے میں نے کھوجی کو بلوانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ میرا فرض یہ تھا کہ معلوم کروں کہ یہ کس گھر کا فرد تھا اور لاش اس کے وارثوں کو مل جائے۔

میں نے لاش کی جامہ تلاشی لی۔ سردیوں کا موسم تھا اس واسطے اس بدقسمت شخص نے سویٹر اور اس کے اوپر کوٹ پہنا ہوا تھا۔ میں نے اس کی ساری جیبوں کی تلاشی لی۔ کوٹ کی باہر والی جیب سے ایک سفید کاغذ نکلا جو تہہ کیا ہوا تھا۔ وہ کاغذ کھول کر پڑھا تو تصدیق ہوگئی کہ اس شخص نے خودکشی کی ہے۔

اتنی مدت گزر جانے کے بعد میں بالکل صحیح الفاظ تحریر نہیں کر سکتا لیکن یہ پورے یقین کے ساتھ بتا سکتا ہوں کہ اُس نے لکھا تھا کہ میں خودکشی کر رہا ہوں۔ خودکشی کی وجہ یہ لکھی تھی کہ میری شادی ایک سال پہلے ہوئی تھی۔ میں اپنی بیوی کو نیک اور اچھے چلن کی لڑکی سمجھتا تھا لیکن وہ بے وفا نکلی اور پتہ لگا کہ اس کی دوستی ایک اور آدمی کے ساتھ ہے اور اس سے ملتی جلتی رہتی ہے۔ بہت سمجھانے بجھانے کے باوجود وہ باز نہیں آتی اور لڑائی جھگڑا کرتی ہے۔ اس واسطے میں نے اپنی زندگی ختم کر لینا ہی بہتر سمجھا۔ یہ لڑکی مجھ کو اچھی لگتی تھی اور میرے دل میں اس کی محبت تھی لیکن اس لڑکی نے میرے جذبات کا خون کر دیا ہے۔ میری موت کا ذمہ دار کسی اور کو نہ ٹھہرایا جائے۔ میں اپنے گھر کا ایڈریس لکھ رہا ہوں۔ میری لاش میرے گھر پہنچا دی جائے تو میری روح آپ کو دعائیں دے گی۔

نیچے نام انوار لکھا تھا اور اس کے نیچے گھر کا پورا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا تھا کہ یہ خودکشی کی واردات تھی۔ میرا فرض اب یہ رہ گیا تھا کہ لاش ہسپتال برائے پوسٹ مارٹم بھجوا دوں اور متوفی کے وارث لاش وصول کر کے دستخط کر دیں۔ یہاں پر میری ڈیوٹی ختم ہو جاتی تھی۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو یہ ایڈریس سمجھایا۔ کانسٹیبل نے کہا کہ فکر والی کوئی بات نہیں۔ وہ اس محلے سے واقف ہے۔ میں نے کانسٹیبل کو کہا کہ وہ پہلے یقین کر لے کہ یہ گھر

انوار کا ہی ہے پھر اس کے باپ کو اپنے ساتھ لے آئے لیکن یہ نہ بتانا کہ معاملہ کیا ہے۔ میں اس احتیاط کو ضروری سمجھتا تھا...... کانسٹیبل روانہ ہو گیا۔ جاتے جاتے میں نے اس کو روکا اور کہا کہ کوئی تانگہ مل جائے تو اس پر آنا تا کہ وقت کی بچت ہو جائے۔

خودکشی یا قتل

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد متوفی انوار کا باپ اور بڑا بھائی آ گئے۔ آپ بڑی اچھی طرح سوچ سکتے ہوں گے کہ اپنے بیٹے کی لاش دیکھ کر باپ کی کیا حالت ہوئی ہوگی اور بھائی نے جب اپنے چھوٹے بھائی کی لاش دیکھی تو اس کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ وہاں تک تو وہ دونوں بڑی پریشانی میں پہنچے ہوں گے کہ کانسٹیبل انہیں لے کہاں جا رہا ہے۔ اچانک انہیں انوار کی لاش نظر آئی تو معلوم نہیں دونوں بے ہوش کیوں نہ ہو گئے۔

میں نے دونوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اب صبر اور تحمل کریں اور یہ رقعہ دیکھیں جو لاش کی جیب سے نکلا ہے۔ باپ نے وہ کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں نے کاغذ پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ یہ شخص اور اس کا بڑا بیٹا معزز اور تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ باپ نے اور پھر انوار کے بڑے بھائی نے رقعہ پڑھا۔

''نہیں جناب!''—— باپ نے رقعہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا—— ''یہ تحریر میرے بیٹے کی نہیں''۔

''ہاں صاحب!''—— انوار کے بڑے بھائی نے کہا—— ''یہ میرے بھائی کا ہینڈ رائیٹنگ ہے ہی نہیں۔ ذرا سا بھی ملتا جلتا ہوتا تو ہم کہتے کہ شاید اس نے جلدی میں اور جذباتی حالت میں لکھا ہے اس لئے ذرا فرق آ گیا ہے لیکن اس ہینڈ رائیٹنگ اور میرے بھائی کے ہینڈ رائیٹنگ میں بہت ہی زیادہ فرق ہے جو چھپایا جا سکتا ہی نہیں''۔

ان کی اس بات سے میں تو چکرا گیا۔ میں اس کو خودکشی کی واردات قرار دے چکا تھا لیکن اس باپ بیٹے نے یہ عجیب بات سنا دی کہ خط یا یہ رقعہ ان کے بیٹے کا ہے ہی نہیں۔ پہلے تو میں نے ان کی بات نہ مانی اور پھر ان کے ساتھ سوال و جواب کئے۔ وہ سمجھے کہ میں ان کو ٹال رہا ہوں اور اپنا کام یہیں پر ختم سمجھتا ہوں کہ یہ خودکشی کیس ہے۔ یہ میں اس واسطے کہہ رہا ہوں کہ انوار کے باپ نے کہا کہ میں تفتیش نہیں کروں گا تو وہ پولیس کپتان کو ملے گا اور

درخواست بھی دے گا۔ وہ پورے یقین کے ساتھ کہتا تھا کہ اس کے بیٹے نے خودکشی نہیں کی بلکہ اس کو قتل کیا گیا ہے۔ انوار متوفی کا بڑا بھائی بھی اسی طرح کی باتیں کرتا تھا۔

میں نے ان کو یقین دلایا کہ میں اپنے فرض سے بھاگ نہیں رہا۔ وہ مجھ کو یقین دلائیں کہ یہ تحریر انوار کی نہیں۔ دونوں نے پھر وہی باتیں دہرائیں جو پہلے کہہ چکے تھے۔ بڑے بھائی نے کہا کہ وہ مجھ کو انوار کی تحریریں دکھائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ انوار اپنا نام اس طرح لکھا ہی نہیں کرتا تھا۔

''آپ یہ تحریر انوار کے قریبی دوستوں کو دکھائیں'' ـــــ بڑے بھائی نے کہا ـــــ ''انہیں یہ نہ بتائیں کہ اسے ہم انوار کی تحریر ہی سمجھ رہے ہیں۔ پھر آپ انوار کی اصل تحریر اور یہ تحریر کسی ہینڈ رائیٹنگ ایکسپرٹ کو دکھائیں۔ صحیح فیصلہ یہ ایکسپرٹ دے گا''۔

ان دونوں کے ساتھ میرا جو بحث مباحثہ ہُوا وہ میں نے پوری تفصیل کے ساتھ نہیں لکھا۔ کہانی سنانے کے واسطے جو باتیں ضروری سمجھیں وہ لکھ دی ہیں۔ بات یوں ہوئی کہ میں نے ان کی بات کو ٹھیک مان لیا لیکن ابھی ان پر اس کا اظہار نہ کیا۔ میں نے سوچا کہ یہ متوفی انوار ریل گاڑی کے نیچے نہیں آیا ورنہ اس کا جسم کٹا ہُوا ہوتا۔ خودکشی کرنے والے لائن پر لیٹ جاتے ہیں اور گاڑی اوپر سے گزر جاتی ہے۔ خودکشی کرنے والا فوراً مر جاتا ہے۔ میرے سامنے اس وقت تک ایسی تین وارداتیں آ چکی تھیں اور تینوں خودکشی کی تھیں۔ ایک نے تو اپنی گردن ریلوے لائن پر رکھی تھی اور اس کا سر اس کے جسم سے جدا ہو گیا تھا۔ دوسرے دونوں پیٹ کے بل لائن پر لیٹے تھے اور ان کے جسم دو حصوں میں کٹ گئے تھے۔ میں نے اس مسئلے پر غور کیا تو بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ یہ شخص لائن پر لیٹا کیوں نہیں اور اس کو ٹکر کیوں لگی۔

اگر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ یہ خودکشی نہیں اور یہ قتل ہے تو بھی یہ بات میرے دماغ میں بیٹھی نہیں تھی۔ قتل کا یہ طریقہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ قتل اس طرح بھی ہوتے ہیں جو میں نے تفتیش کیے تھے کہ کسی کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور لاش ریلوے لائن پر رکھ آئے۔ گاڑی آئی اور لاش کو کاٹتی ہوئی نکل گئی۔ اس صورت میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شخص پہلے ہی مرا ہُوا تھا اور مرنے کے بعد خون نہیں نکلا کرتا۔

پھر ایک واردات ایسی بھی میرے پاس آئی کہ زندہ آدمی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر رات کے وقت ریلوے لائن کے اوپر رکھ آئے۔ ریل گاڑی پوری رفتار سے آئی اور زندہ

باندھے ہوئے آدمی کو کاٹتی ہوئی نکل گئی لیکن انوار کو گاڑی کی ٹکر لگی تھی یہ ٹکر پیٹھ پر لگی تھی۔

میں نے انوار کے باپ اور بھائی سے یہ معلوم کرنا تھا کہ ان کا بیٹا کیا واقعی ہی اپنی بیوی سے تنگ تھا اور اس کی بیوی اس سے بے وفائی کرتی تھی؟ ...... یہ تو لمبی تفتیش والا معاملہ تھا جو میں وہاں ٹھنڈی رات میں اور اس ویران جگہ حل نہیں کر سکتا تھا اور ابھی تو لاش پوسٹمارٹم کے واسطے ہسپتال بھجوانی تھی۔ اس کے واسطے چارپائی کی ضرورت تھی جو میں چاہتا تھا کہ جلدی آ جائے۔ ریلوے لائن کے تھوڑی ہی دور چند ایک گھر تھے۔ اگر میں انوار کے باپ اور بھائی کو کہتا کہ چارپائی لے آئیں تو انہوں نے دو گھنٹے لگا دینے تھے۔ میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل کو کہا کہ وہ کسی بھی گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر کوئی پرانی سی بان کی چارپائی لے آئیں۔ وہ دونوں چلے گئے۔

چارپائی آنے تک میں نے انوار کے باپ اور بھائی سے پوچھنا شروع کر دیا۔ میں اس چکر میں پڑ گیا تھا جو پہلے بیان کیا ہے کہ خودکشی کرنے والے لائن پر لیٹ جاتے ہیں۔ اگر یہ قتل تھا تو یہ طریقہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ تیسری بات یہ ہو سکتی تھی کہ متوفی لائن کے قریب سے گزر رہا تھا اور گاڑی آئی تو یہ ایک طرف ہونے لگا لیکن پتھر سے پاؤں پھسلا تو لائن سے دور ہٹنے کی بجائے لائن کے قریب گرنے لگا۔ اتنے میں انجن پہنچ گیا اور اس کو ٹکر مار کر دور گرا دیا لیکن اس کی جیب سے جو رقعہ نکلا تھا وہ میری ان سوچوں کی تردید کرتا تھا۔

میں نے انوار کے باپ اور بھائی سے پوچھا کہ رقعے میں جو کچھ لکھا ہوا ہے یہ کہاں تک صحیح ہے۔ کیا انوار کی بیوی واقعی کسی اور کے ساتھ ملتی ملاتی تھی اور انوار کی بات نہیں مانتی تھی؟

میرے اس سوال کا جواب باپ نے دیا اور بڑا بھائی بھی درمیان میں کہیں کہیں بولتا رہا اور باپ کے جواب میں اضافے بھی اس نے کیے اور میں نے یہ دیکھ لیا کہ دونوں کی رائے تقریباً ایک جیسی تھی۔

ان کی رائے یہ تھی کہ وہ دونوں انوار کی بیوی کو بدچلن نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انوار ذرا احساس طبیعت کا آدمی تھا اور گہرائی میں جائے بغیر غصے میں آ جاتا تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ میاں بیوی میں شادی کے چوتھے پانچویں مہینے ہی چپقلش شروع ہو گئی تھی۔ انوار کی بیوی بڑے اچھے اور شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔ انوار کا باپ، بھائی، بھائی کی بیوی اور انوار کی ماں اس لڑکی سے مطمئن تھے اور وہ گھر میں کوئی بدتمیزی کی یا بے

حیائی کی بات نہیں کرتی تھی۔ میاں بیوی کی ناچاقی اتنی بڑھ گئی کہ کبھی کبھی انوار بیوی کو غصے میں آ کر اس کے گھر بھیج دیا کرتا تھا اور کبھی وہ آٹھ دس دن اپنے ماں باپ کے پاس رہتی اور کبھی سولہ سترہ دن وہیں گزارتی اور والدین انوار کو سمجھا بجھا کر بھیجتے اور وہ اس کو جا کر لے آتا تھا۔ انوار کی بیوی انوار کے والدین کے آگے کئی بار رو پڑی اور کہتی تھی کہ انوار بلاوجہ اور بلاثبوت اس پر تہمتیں لگاتا رہتا تھا۔

''کچھ لوگوں نے انوار کی بیوی کو بدنام کر دیا ہے''— انوار کے بڑے بھائی نے کہا — ''یہ بات ضرور ہے کہ انوار کی بیوی پردہ نہیں کرتی۔ باہر نکلتی ہے تو چادر لے کر نکلتی ہے جس میں اس کا آدھا چہرہ ڈھکا ہوا ہوتا ہے''۔

انبالہ کی بابت میں ایک عجیب چیز بتاتا ہوں۔ انبالہ شہر اور سارے ضلعے کے دیہاتی علاقے میں بھی مسلمان عورتیں بڑا ہی سخت پردہ کیا کرتی تھیں۔ ہندوستان میں کہیں چلے جائیں دیہات کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں اور مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی ہیں لیکن انبالہ کے دیہات میں کوئی عورت برقعے کے بغیر باہر نہیں نکلا کرتی تھی۔ شہر کے بعض تعلیم یافتہ گھرانوں میں کچھ ایسے تھے جن کی عورتیں برقع کی بجائے چادر اوڑھ کر نکلتی تھیں۔ متوفی انوار کا گھرانہ پردہ دار تھا لیکن اس کے سسرال میں برقعے کی بجائے چادر لی جاتی تھی۔

مجھ کو یہ شک ہوا کہ انوار کی بیوی شاید گھومنے پھرنے والی لڑکی تھی اور ایسی لڑکیاں اکثر گھر والوں کو بتا کر نکلتی ہیں کہ سہیلی کے گھر جا رہی ہوں مگر کہیں اور پہنچ جاتی ہیں۔ اس خیال کو سامنے رکھ کر میں نے باپ اور بڑے بھائی سے پوچھا کہ وہ اپنی سہیلیوں کے ہاں جاتی ہوگی۔ مجھے جواب ملا کہ یہ لڑکی بہت کم کسی کے گھر جاتی ہے۔ لڑکی کے والدین اسی شہر کے رہنے والے تھے اور انوار کے گھر سے تھوڑی ہی دور ایک محلے میں ان کا گھر تھا۔

یہ تو میں وقت گزارنے کے واسطے موٹی موٹی باتیں پوچھ رہا تھا۔ اصل تفتیش تو تھانے میں کرنی تھی اور گہرائی میں جانا تھا۔ تھانے کے مخبر بھی تھے جن سے خفیہ رپورٹیں بھی لینی تھیں۔ لڑکی ہو یا لڑکا ان کے گھر والے ان کے چال چلن پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت کی باتیں دوسروں سے معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے ان دونوں سے پوچھا کہ ان کی یا انوار کی کسی سے دشمنی ہوگی...... انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ وہ کسی کے ساتھ دشمنی پیدا کرنے یا رکھنے والے لوگ نہیں۔ یہ تو میں ان لوگوں کی چال ڈھال سے اندازہ لگا چکا تھا کہ عزت اور وقار والے لوگ ہیں۔

اتنے میں چارپائی آ گئی۔ چارپائی کے ساتھ پانچ چھ آدمی بھی آ گئے۔ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی آدمی گاڑی کے نیچے آ کر مارا گیا ہے اور اس کی لاش ہسپتال جا رہی ہے۔ یہ سن کر کچھ تماشائی آ گئے۔

میں نے انہی لوگوں سے لاش اٹھوا کر چارپائی پر ڈالی اور ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ ہسپتال لے جائے اور ڈاکٹر کو جا کر بتائے کہ صبح تک پوسٹمارٹم رپورٹ مل جانی چاہئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی اس واسطے کہ اُن وقتوں میں ڈاکٹر سارے کام چھوڑ کر پوسٹمارٹم کیا کرتے اور سوچ سمجھ کر رپورٹ لکھا کرتے تھے۔

انوار کے باپ اور بھائی کو بھی لاش کے ساتھ یہ کہہ کر بھیج دیا کہ پوسٹمارٹم کے بعد وہ لاش وصول کر کے گھر لے جائیں اور پھر ان کو بتایا کہ میں صبح ان کے گھر آؤں گا۔ میں ان سب کو تھانے بلا سکتا تھا لیکن یہ سوچا کہ بیچاروں کے ساتھ بہت بڑا حادثہ ہوا ہے اس واسطے ان کو تھانے بلانا مناسب نہیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں نے گھر کے ہر فرد سے بے شمار باتیں پوچھنی تھیں۔ ٹھیک نہیں لگا کہ پورے خاندان کو تھانے بلا لیتا۔ اس طرح ان کو بھیج کر میں ریلوے سٹیشن پر چلا گیا۔ سٹیشن ماسٹر سے ملنا ضروری تھا۔

جب ریلوے سٹیشن پہنچا تو گھڑی دیکھی۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اُس وقت سٹیشن ماسٹر اپنے دفتر میں تھوڑے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا دفتر بند ہو چکا تھا اور یہی مجھ کو توقع تھی۔ وہاں سے ایک قلی کو پکڑا جو سٹیشن ماسٹر کا گھر جانتا تھا۔ اُس کا گھر دور نہیں تھا۔ ریلوے سٹیشن سے تھوڑی ہی دور ریلوے کے دیئے ہوئے بنگلے میں رہتا تھا۔ اس وقت کسی کو جگانا مناسب نہیں ہوتا لیکن میں بھی تو اپنی ڈیوٹی پر جاگ رہا تھا اور ایک جوان آدمی مر گیا یا کسی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ میں نے سٹیشن ماسٹر کے بنگلے پر جا کر دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارا اور کچھ دیر بعد سٹیشن ماسٹر خود ہی آنکھیں ملتا اور جمائیاں لیتا باہر آیا۔

''مجھے افسوس ہے سٹیشن ماسٹر صاحب!''— میں نے کہا — ''لیکن معاملہ بڑا سنگین ہے جس کو میں صبح تک ٹال نہیں سکتا۔ میری ڈیوٹی ایسی ہے کہ آپ کو بے آرام کیا ہے......''

اس نے میری بات پوری نہ ہونے دی اور مجھ کو اندر لے گیا۔ ایک کمرے میں بٹھایا اور پوچھا کہ میں کیوں آیا ہوں۔ میں نے اس سے پھر وہی سوال کیا جو ٹیلی فون پر بھی کر چکا تھا کہ ڈرائیور نے اور کیا بتایا تھا۔ سٹیشن ماسٹر نے وہی بات بتائی جو وہ ٹیلی فون پر بتا چکا تھا۔

''میں نے آپ کو فون پر بھی کہا تھا''— سٹیشن ماسٹر نے کہا — ''ڈرائیور نے اس

طرح بات کی تھی جیسے یہ کوئی خاص یا سنگین معاملہ نہیں تھا۔ اس نے صرف اطلاع دی تھی کہ ایک آدمی اس کے انجن کی ٹکر سے گر پڑا تھا اور شاید وہ زندہ نہ ہو''۔

''پھر ایک مہربانی کریں''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''مجھ کو تفتیش کے واسطے ڈرائیور کی ضرورت ہے۔ وہ کہاں رہتا ہے؟ کیا آپ اسے کل تک تھانے میرے پاس بھجوا سکتے ہیں؟''

سٹیشن ماسٹر نے تقریباً پچاس میل دُور کے ایک سٹیشن کا نام لیا اور کہا کہ وہ وہاں رہتا ہے اور اس کو بلایا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کو جتنی جلدی ہو سکے بلوا دیں اور وہ سرکاری طور پر میرے پاس آئے۔ سٹیشن ماسٹر نے کہا کہ وہ بذریعہ ٹیلی فون اطلاع کر دے گا اور کل پچھلے پہر تک آ جائے گا۔

یہ مسئلہ حل کر کے میں واپس تھانے آ گیا اور اپنے گھر چلا گیا۔

اگلی صبح ابھی تاریک تھی جب مجھ کو پوسٹمارٹم کی رپورٹ ملی۔ ریڑھ کی ہڈی انجن کی ٹکر سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور پیچھے کی طرف سے پسلیاں بھی بُری طرح ٹوٹی تھیں۔ موت کا وقت بھی لکھا تھا۔ وہ تو مجھ کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ریل گاڑی اس مقام سے گزری تھی۔ اس رپورٹ سے مجھ کو کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

میں ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر انوار کے ایڈریس پر پہنچ گیا۔ وہ مسلمانوں کا محلّہ تھا۔ انوار کے گھر والی گلی مردوں سے بھری ہوئی تھی۔ رونا چیخنا باہر دور تک سنائی دے رہا تھا۔ یہاں میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ آج کل لوگ جذبات سے اس قدر عاری اور خالی ہو گئے ہیں کہ محلے میں ایک گھر میں میت پڑی ہوئی ہوتی ہے اور عورتیں بین کر رہی ہوتی ہیں اور ساتھ والے گھر والوں میں ٹی وی اور ٹیپ ریکارڈر پوری اونچی آواز میں گانے سنا رہے ہوتے ہیں۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اس وقت لوگوں میں باہم ہمدردی اور پیار تھا۔ آج وہ وقت مجھ کو یاد آتا ہے تو میں کہا کرتا ہوں کہ ہم لوگ بہت بڑی دولت سے محروم ہو گئے ہیں۔ انوار کے گھر کی اتنی لمبی گلی ماتم کدہ بنی ہوئی تھی۔ مجھ کو جو بھی آدمی نظر آیا اُس کے چہرے پر غم اور اداسی دیکھی۔

محلے داروں کو معلوم تھا کہ میں تفتیش کے واسطے آیا ہوں اور مجھ کو ماتم والے گھر بٹھانا مناسب نہیں۔ ایک معزز آدمی مجھ کو گلی کے ایک سرے پر اپنے مکان میں لے گیا اور بیٹھک کھول کر مجھ کو بٹھایا۔ اس علاقے کے نیم سرکاری افراد مثلاً ذیلدار وغیرہ میری

نقرے ناول کی کہانی کی تعریف میں لکھے تھے۔

میں نے دیکھا کہ یہ ساری تحریریں یعنی انوار کے سارے خط اور ناولوں پر لکھے ہوئے نام وغیرہ سے صاف پتہ لگتا تھا کہ ایک ہی ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے اس رقعے کی تحریر دیکھی جو انوار کی لاش کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔ اس کا باپ اور بھائی ٹھیک کہتے تھے کہ ان تحریروں میں بہت ہی زیادہ فرق تھا اور کوئی اَن پڑھ آدمی بھی دیکھ کر کہہ سکتا تھا کہ یہ رقعہ اس ہاتھ کا لکھا ہُوا نہیں جس ہاتھ نے یہ خط لکھے ہیں اور جس ہاتھ نے ناولوں پر نام لکھا ہے۔ یہ تو ہینڈ رائیٹنگ ایکسپرٹ نے فیصلہ لکھ کر دینا تھا۔ عدالت میں صرف ہینڈ رائیٹنگ ایکسپرٹ کی رپورٹ تسلیم کی جاتی ہے۔

گزشتہ رات موقعۂ واردات پر انوار کے باپ اور بھائی نے انوار کی بیوی کے چال چلن پر انوار کے شبہے کو رد کر دیا تھا بلکہ کچھ اس کی تعریف بھی کی تھی۔ اب میں تفصیلی تفتیش کے واسطے وہاں گیا تو بہتر یہ سمجھا کہ سب سے پہلے انوار کی بیوی سے بات کی جائے۔ مجھ کو اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ چہرے سے اور بولنے کے انداز سے اور اپنی چھٹی حِس سے یہ معلوم کر لیتا تھا کہ یہ آدمی یا عورت اندر سے کیا ہے اور باہر اور باتوں میں جو کچھ ہے وہ سب جعلی عکس ہے۔ میں نے انوار کے باپ کو کہا کہ انوار کی بیوی کو میرے پاس بھیج دے اور اس کو پوری تسلی اور دلاسہ دے کر بھیجے کہ اس کے خلاف کوئی بات نہیں آئے گی اور وہ ذرا سا بھی نہ ڈرے اور مجھ کو اپنا بھائی سمجھ کر میرے پاس بیٹھے۔

دس بارہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ انوار کا باپ اس کی بیوی کو اپنے ساتھ لے آیا اور میں نے باپ کو کہا کہ وہ اب باہر چلا جائے۔ انوار کی بیوی خوبصورت لڑکی تھی اور غم کی بڑی دردناک تصویر بنی ہوئی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد ہی بیوہ ہو جانا بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے لیکن یہاں صدمے میں مزید اضافہ یہ ہو گیا تھا کہ خاوند نے اس پر بدچلنی اور بے وفائی کی تہمت لگا کر خودکشی کر لی تھی۔ یہ اب میرا کام تھا کہ کم از کم اس دوسرے صدمے سے میں اس لڑکی کو بچالوں اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ ثابت کر دوں کہ یہ خودکشی نہیں قتل ہے۔

میں نے حسب عادت اس کی گھبراہٹ رفع کرنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا اور اس کے بعد اس سے پوچھا کہ گزشتہ رات اس کو انوار کے باپ اور بھائی نے کیا بتایا تھا کہ وہ کس طرح فوت ہُوا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ انہوں نے گھر میں سب کو بتایا تھا کہ انوار کی جیب سے ایک رقعہ نکلا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے

حاضری میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان کو کہا کہ سب باہر میرے بلانے کے انتظار میں رہیں اور انوار کے باپ کو میرے پاس بھیج دیں۔

انوار کا باپ پہلے ہی باہر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ فوراً اندر آیا اور میں نے اس کو لیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے یہ شخص ایک رات میں ضعیف العمر ہو گیا ہو۔ بیچارے کندھے آگے کو جھک آئے تھے۔

''کیا آپ نے محسوس کیا ہے کہ یہ خودکشی کی واردات نہیں؟''—اس نے مجھ پوچھا۔

''محسوس کیا ہے تو یہاں آ گیا ہوں''— میں نے جواب دیا—''میں ابھی فیصلہ نہیں دے سکتا کہ یہ خودکشی ہے یا قتل یا اتفاقی حادثہ۔ میں آپ کو صرف یہ یقین دلا ہوں کہ تفتیش میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ رات دو بجے کے بعد میں گھر پہنچا تھا اور ابھی سو نکلنے میں دیر تھی تو تھانے پہنچ کر آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ اب یہ ثبوت آپ کو پیش کرنا کہ آپ کے بیٹے کو قتل کیا گیا ہے''۔

''یہ دیکھ لیں''—انوار کے باپ نے تین یا شاید چار کاغذ میرے آگے رکھ کر کہا ''یہ ہے میرے بیٹے کا صحیح ہینڈ رائیٹنگ۔ آپ ہر اس فرد کو دکھا کر پوچھیں جو میرے بیٹے ساتھ بے تکلف تعلقات رکھتا تھا''۔

انوار کی آخری تحریر جو اس کی جیب سے برآمد ہوئی تھی، میری جیب میں تھی۔ نے وہ رقعہ نکالا اور کھول کر سامنے رکھ لیا اور وہ کاغذات دیکھے جو اس کے باپ نے دیئے تھے۔ یہ کچھ مہینے پہلے کی تحریریں تھیں۔ انوار ایک بار اپنے دوستوں کے ساتھ دنوں کے واسطے شملہ گیا تھا اور وہاں سے اس نے گھر خط لکھا تھا۔ پھر وہ سرکاری ڈیو اپنے ایک افسر کے ساتھ دِلّی گیا تھا اور وہاں سے اس نے گھر خط لکھا تھا۔ اُن دنوں اور آٹا راشن کارڈ پر ملا کرتے تھے اور راشن کارڈ پر گھر کے تمام افراد کے نام لکھے ہوتے تھے۔ انوار کی شادی ہو گئی تو ایک فرد کا اضافہ ہو گیا۔ انوار نے ایک درخواست تھی کہ اس کے گھر کے راشن کارڈ میں ایک فرد کا اضافہ کیا جائے۔ معلوم نہیں یہ اضافہ یا نہیں البتہ یہ درخواست اس کے کاغذوں میں پڑی ہوئی ملی تو اس کا باپ وہ بھی ان خطوں کے ساتھ اٹھا لایا۔ پھر باپ نے دو تین کتابیں میرے آگے رکھیں۔ یہ ناول ان پر انوار کے اپنے ہاتھ سے اپنا نام لکھا تھا۔ ایک ناول کے آخر میں اس نے

گاڑی کے آگے آ کر خودکشی کی ہے لیکن باپ نے یہ بھی بتایا کہ یہ تحریر انوار کی ہے ہی نہیں۔

''کیا آپ مجھ کو وہ رقعہ دکھا سکتے ہیں؟''—انوار کی بیوی نے پوچھا۔

میری ڈائری میں اس لڑکی کا نام نزہت لکھا ہُوا ہے۔ میں نے وہ رقعہ اس کے آگے رکھ دیا۔ اس نے پڑھا اور رقعہ مجھے واپس دے دیا۔

''نہیں صاحب!''—نزہت نے بڑی زور سے سر ہلا کر کہا—''یہ تحریر میرے خاوند کی ہے ہی نہیں اور دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اس کو میرے خلاف کوئی شکایت نہیں رہی تھی اور میں نے اس کے سارے شک رفع کر دیئے تھے۔ گھر میں اس بات کا کسی کو بھی پتہ نہیں۔ صرف اللہ جانتا ہے کہ تقریباً ایک مہینہ پہلے ہمارے درمیان ایسی کوئی شک شبہے والی بات نہیں رہی تھی۔ خودکشی کی یہ جو وجہ لکھی گئی ہے یہ بالکل جھوٹ اور بے بنیاد ہے اور یہ انوار نے لکھی ہی نہیں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اس کے ہینڈ رائیٹنگ کو پہلی بار دیکھ رہی ہوں؟''

نزہت کی اس بات سے یہ بات نکل آئی کہ اب انوار کے دل میں نزہت کے خلاف کوئی شک شبہ نہیں رہا تھا لیکن اس سے پہلے یہ شبہ موجود تھا اور اس واسطے ان کے درمیان ناچاقی تھی۔

''میں تم کو چھوٹی بہن سمجھ کر بات کر رہا ہوں نزہت!''—میں نے کہا—''صرف میں ہوں جو اس شک کو رفع کر کے ساری دنیا کو بتا سکتا ہوں۔ تم نے میری یہ مدد کرنی ہے کہ میں جو پوچھوں سچ بتانا اور تم جو بیان دو وہ پورے کا پورا سچ ہو۔ اللہ کے سوا یہاں کوئی نہیں سن رہا نہ میں کسی کو کچھ بتاؤں گا...... یہ بتاؤ کہ تم کبھی رُوٹھ کر اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاتی تھیں اور کبھی انوار غصے میں آ کر تم کو گھر بھیج دیتا تھا؟''

''میں تو اب بھی دو تین دنوں سے اپنے ماں باپ کے گھر گئی ہوئی تھی''—نزہت نے کہا—''رات کو ایک آدمی ہمارے گھر آیا اور اس حادثے کی اطلاع دی۔ میں اور میرے ابو امی اور بھائی دوڑتے ہوئے یہاں پہنچے لیکن میں روٹھ کر یا انوار سے جھگڑے پر گھر نہیں گئی تھی بلکہ انوار نے اپنی خوشی سے مجھے بھیجا تھا۔ اس سے پہلے ایسا ہوتا رہا ہے کہ کبھی میں انوار سے لڑائی جھگڑے کے بعد روٹھ کر چلی گئی اور کبھی اس نے غصے میں آ کر بھیج دیا اور کبھی دس دن اور کبھی پندرہ دن بعد اپنے ماں باپ کے کہنے پر آیا اور مجھ کو گھر لے آیا۔ میں پھر کہتی ہوں کہ اب ہمارے درمیان کوئی شک شبہ اور کوئی ناچاقی نہیں رہی تھی''۔

"پہلے ناچاقی کیوں ہوتی تھی؟"—— میں نے پوچھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا "ڈرے گھبرائے بغیر صحیح بات بتا دو اور پھر میں اس پر پردہ ڈالوں گا اور سچ کو نکھار کر سامنے لے آؤں گا"۔

عشقیہ رقعے

اب کچھ پردے اٹھنے لگے۔ نزہت کی بابت یہ ذہن میں رکھیں کہ پورے اعتماد کے ساتھ بات کرتی تھی اور اس کو بہت بڑی چوٹ پڑی تھی اور اس کی بدنامی بھی ہوئی تھی اس واسطے وہ زخمی بلّی بلکہ شیرنی کی طرح حملہ کرنے پر آئی ہوئی تھی۔ وہ کسی بڑے ہی اونچے والے خاندان کی لگتی تھی۔ اللہ نے اس کو جیسی شکل دی تھی ویسی ہی عقل عطا کی تھی۔ اس نے یہ الفاظ بھی کہے جو آج تک مجھ کو یاد ہیں کہ میں یہاں بند کمرے میں بیٹھ کر ہی بیان نہیں دوں گی بلکہ منڈیر پر کھڑی ہو کر ساری دنیا کو سناؤں گی کہ میں کیا ہوں اور میرا خاوند کیا ہے اور حقیقت کیا ہے۔ اس لڑکی نے میرے دل میں اپنی قدر اور قیمت پیدا کر لی۔

اس نے بڑا تفصیلی بیان دیا جو پورے کا پورا یہاں دینا ضروری نہیں۔ اصل جو مسئلہ تھا میں وہ پیش کر دیتا ہوں...... یہ لڑکی نزہت خوبصورت بھی تھی اور دس جماعتیں بھی پڑھی ہوئی تھی جو اُس دور میں ایک مسلمان لڑکی کے واسطے اعلیٰ تعلیم سمجھی جاتی تھی اور پھر خاندان ہر لحاظ سے ٹھیک ٹھاک تھا اور اس خاندان کی عزت بھی تھی اس واسطے اس لڑکی کے رشتے کے خواہشمند تین چار اچھے گھرانے والوں کے لوگ تھے۔ ہر لڑکی کے والدین کے سامنے یہ مسئلہ آ جاتا ہے کہ لڑکی ایک ہوتی ہے اور رشتہ مانگنے والے ایک سے زیادہ ہوتے ہیں لڑکی تو ایک ہی جگہ دینی ہوتی ہے۔ باقی ناراض ہو جاتے ہیں اور ان میں اگر کوئی اکھڑ بدمعاش ٹائپ لوگ ہوں تو وہ باقاعدہ ہمیشہ کے لئے عداوت دل میں رکھ لیتے ہیں کہ انہوں نے رشتے سے جواب دے کر ان کی بے عزتی کر ڈالی ہے۔

نزہت کے رشتے کے معاملے میں بھی ایسے ہی ہوا۔ دو لڑکوں کے والدین کو جواب دے دیا گیا اور نزہت کی شادی انوار کے ساتھ کر دی گئی۔ نزہت نے اپنے بیان میں کہا کہ اس کے والدین کہتے تھے کہ انوار کا خاندان بہت شریف اور عزت والا ہے اور اس میں خوشحالی بھی ہے۔

نزہت نے میرے پوچھے بغیر ہی بتا دیا کہ جن دو لڑکوں کو قبول نہیں کیا گیا تھا ان کے والدین کا ردعمل کیا تھا۔ ایک گھر تو بالکل چپ ہو گیا۔ انہوں نے نہ کوئی ناراضگی رکھی نہ کبھی گلہ کیا لیکن دوسرے گھر کے لڑکے نے نزہت کو تھوڑا سا پریشان کیا تھا۔ نزہت نے اس لڑکے کا نام محمود بتایا۔ محمود کا باپ افسری گریڈ میں فوجی ہیڈ کوارٹر میں ملازم تھا۔ اس خاندان کو لوگ امیر خاندان کہتے تھے۔ محمود ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کو گھر کی امیری نے اور والدین کے بے جا پیار نے بگاڑ دیا تھا۔ اس میں اوچھا پن زیادہ تھا اور اپنے آپ کو فلموں کا ہیرو سمجھتا تھا۔ یہ خاندان نزہت کی رشتہ داری کے خاندانوں میں سے تھا۔ نزہت محمود کو بہت اچھی طرح جانتی تھی اور اس واسطے کہ وہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ محمود کے ساتھ اس کی سلام دعا بھی ہو جایا کرتی تھی اور محمود اس کے ساتھ فری ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

نزہت نے بیان میں کہا کہ محمود کی خواہش تھی کہ میرا رشتہ اس کو مل جائے لیکن نزہت نے اپنی زبان سے اپنی ماں کو کہا تھا کہ خدا کے واسطے اس کو محمود کے ساتھ نہ بیاہ دینا۔ یہ تو بڑا ہی گھٹیا لڑکا ہے۔ جب رشتے سے انکار ہو گیا تو شاید محمود کو کسی طرح پتہ لگ گیا کہ نزہت نے اپنی زبان سے اس کو نامنظور کیا ہے۔ یہ اس طرح پتہ لگا کہ انکار کے بعد اس نے نزہت کو کہا کہ اس نے اس کو نامنظور کر کے بہت بُرا کیا ہے۔

میں نے نزہت سے پوچھا کہ محمود نے اس کو کبھی کوئی دھمکی دی تھی؟...... نزہت نے جواب دیا کہ پہلے پہل وہ بڑے رعب اور کچھ دھمکی کے لہجے میں ہی بات کرتا تھا لیکن ایک روز محمود نے اس کو گلی میں روک کر پھر ایسی بات کہی تو نزہت نے اس کو صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ ہاں میں نے خود تم کو دھتکارا ہے اور آئندہ مجھ کو راستے میں نہ روکنا نہ کبھی مجھ کو ملنے کی کوشش کرنا...... اس کے بعد محمود نے اس کو کچھ بھی نہ کہا اور نزہت کی شادی انوار کے ساتھ ہو گئی۔

اس کے بعد نزہت نے ایک بڑی ہی اہم بات بتائی۔ اکثر لڑکیاں اپنی بابت ایسی باتیں نہیں بتایا کرتیں۔ شادی کے معاملے میں نزہت کی اپنی پسند تھی۔ یہ صرف پسند اور مرضی والی بات ہی نہیں تھی بلکہ نزہت کی اس نوجوان کے ساتھ اچھی بھلی محبت تھی۔ اس کا نام عبدالستار تھا اور سب اس کو ستار کہتے تھے۔ ستار ان کے رشتے برادری کا لڑکا تھا اور ان کے ساتھ ان کا تعلق اتنا زیادہ تھا کہ نزہت اور ستار کو آپس میں ملنے جلنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ لڑکپن میں ہی ان کی محبت ہو گئی تھی۔ نوجوانی میں آ کر جب ان کے جذبات میں

شدت اور سنجیدگی پیدا ہوئی تو انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا لیکن ستار کا خاندان مالی حیثیت سے نزہت کے خاندان کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ یہ مطلب نہیں کہ ستار کا خاندان غریب تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی وہ حیثیت نہیں بنتی تھی جو نزہت کے خاندان کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ستار کے والدین نے نزہت کا رشتہ مانگا ہی نہیں۔ نزہت نے اپنی ماں کو بتا دیا تھا کہ وہ ستار کو چاہتی ہے لیکن ماں نے اس کو سمجھا بجھا کر اس کی خواہش رَدّ کر دی تھی۔ یہ نزہت کی خاندانی شرافت تھی کہ اس نے محبت کو دل میں دبا لیا اور والدین کی پسند قبول کر لی۔

ستار اور نزہت کو اس کا بہت صدمہ تھا۔ نزہت نے یہ صدمہ برداشت کر لیا لیکن ستار سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ شادی کے بعد ستار نزہت سے ملا تھا اور وہ روتا بھی تھا اور کہتا تھا کہ وہ شادی کرے گا ہی نہیں اور یہی دعا کرتا رہے گا کہ کسی نہ کسی طرح نزہت اس کو مل جائے۔ نزہت نے اس کو بہت سمجھایا اور کہا کہ اللہ کو جو منظور تھا وہ ہو گیا ہے اور وہ اللہ کی مرضی کو قبول کر لے۔ پھر نزہت نے ستار سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔

شادی کو چار مہینے گزر گئے تو ایک روز انوار چار بجے سے تھوڑا بعد اپنے معمول کے مطابق دفتر سے گھر پہنچا اور نزہت کو اپنے کمرے میں بلایا۔ نزہت گئی تو انوار نے ایک رقعہ نزہت کو دیا اور کہا کہ اسے پڑھو اور مجھ کو جواب دو۔ نزہت نے رقعہ پڑھا تو اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور چہرے کا رنگ بدل گیا۔ رقعہ پڑھ کر وہ انوار کے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔

یہ رقعہ نزہت کے نام تھا اور اس کے نیچے عبدالستار لکھا ہوا تھا۔ رقعے میں محبت کا بڑا شدید اظہار کیا ہوا تھا اور لکھا تھا کہ میں نے بہت کوشش کی ہے کہ تمہیں دل سے اتار دوں لیکن میں جتنی کوشش کرتا ہوں تم اتنا ہی زیادہ مضبوطی سے میرے دل کو گرفت میں لے لیتی ہو۔ اگر مجھ کو زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو پہلے سے زیادہ ملا کرو ورنہ میں معلوم نہیں کیا کر بیٹھوں۔

یہ رقعہ لفافے میں نہیں تھا بلکہ ویسے ہی کاغذ تہہ کر کے کسی نے اس چھوٹے سے لیٹر بکس میں ڈال دیا تھا جو انوار کے گھر کے باہر لگا ہوا تھا۔ یہ چھوٹا سا لیٹر بکس گھر کی ڈاک کے واسطے دروازے کے ساتھ لگایا گیا تھا جیسے کہ شہروں کے گھروں کے باہر لوگ لگا کر رکھتے ہیں۔ انوار دفتر سے آیا تو حسب عادت لیٹر بکس کھول کر دیکھا تو اس میں سے یہ رقعہ نکلا۔

آپ تصور میں لا سکتے ہیں کہ ایک خاوند کو اپنی بیوی کی بابت ایسا رقعہ دیکھ کر کتنا زیادہ غصہ آیا ہو گا اور اس کی جذباتی حالت کیا ہوئی ہو گی۔ نزہت نے بتایا کہ انوار بہت حساس آدمی تھا اور اس کو غصہ بڑی جلدی آتا تھا اور اس میں ایک خرابی یہ تھی کہ بات کی گہرائی تک

جاتا ہی نہیں تھا۔ تحمل اور بردباری تو اس میں تھی ہی نہیں۔ اس نے نزہت سے جواب طلبی کی اور یہ تہمت لگائی کہ وہ ستار سے ملتی رہتی ہے۔ نزہت نے اس کو تسلی دینے کے واسطے بہت کچھ کہا لیکن انوار پر جو کیفیت بن گئی تھی وہ اس کے قابو سے باہر تھی۔ وہ نزہت کی کوئی دلیل اور کوئی قسم قبول نہیں کر رہا تھا۔

نزہت کو اچانک خیال آ گیا کہ یہ ہینڈ رائیٹنگ ستار کا تو ہے ہی نہیں۔ ان کی آپس میں اتنی زیادہ محبت اور بے تکلفی تھی اور میل جول بھی تھا اس واسطے ایک دوسرے کی تحریر کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ نزہت نے انوار کو یہ بات بتائی تو وہ اور زیادہ غصے میں آ گیا۔ نزہت نے کہا کہ اس کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اس کو ستار کی تحریر دکھائے۔ انوار تو اپنے آپ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس نے جو نزہت پر تہمت لگائی ہے وہ بالکل صحیح ہے اور یہ رقعہ ستار کا ہی ہے۔ آخر بہت ہی جھک جھک اور تُرش کلامی کے بعد بات یہاں ختم ہوئی کہ انوار نے نزہت سے وعدہ لیا کہ وہ آئندہ ستار کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھے گی اور یہ رقعہ بازی نہیں چلے گی۔ نزہت نے اس کو کہا کہ وہ جب اپنے ماں باپ کے پاس جاتی ہے تو انوار کسی نہ کسی طرح دیکھ لیا کرے کہ وہ ستار سے ملتی ہے یا نہیں۔

ابھی بیس بائیس دن ہی گزرے تھے کہ ایسا ہی ایک اور رقعہ پہلے کی طرح لیٹر بکس سے ملا اور یہ بھی انوار نے دفتر سے آ کر لیٹر بکس کھولا اور رقعہ نکلا۔ اب تو انوار نے اُودھم بپا کر دیا اور کہا کہ یہ دو رقعے تو اتفاق سے انوار کو مل گئے ہیں اللہ جانے ایسے کتنے اور رقعے آتے ہوں گے اور نزہت بھی ان کا جواب دیتی ہو گی...... یہاں سے میاں بیوی میں خاصی زیادہ تو تو مَیں مَیں ہو گئی اور نزہت اُس دن بہت روئی۔ انوار کوئی بات سننے کے واسطے تیار نہیں تھا۔ معلوم نہیں کیوں انوار نے یہ احتیاط کی کہ یہ رقعے اپنے والدین کو یا گھر کے کسی اور فرد کو نہ دکھائے۔

اب تو میاں بیوی کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہونے لگی اور ان کی جو بے تکلفی تھی اس میں زہر پیدا ہو گیا۔ انوار ذرا ذرا سی بات پر نزہت پر غصہ جھاڑ دیتا اور اس کو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ گھر میں نزہت کا دوسرے افراد کے ساتھ رویہ بہت ہی ٹھیک رہتا تھا جو اس نے ان حالات میں بھی ٹھیک رکھا۔ گھر والوں کو یہ پتہ لگ گیا تھا کہ میاں بیوی کے درمیان کوئی گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے۔

دو اڑھائی مہینے گزر گئے، کوئی رقعہ نہ آیا لیکن انوار نزہت سے بدظن ہو گیا اور یہ شبہ

اس کے دل میں بیٹھ گیا کہ نزہت اس کے ساتھ وفا نہیں کر رہی۔ اب تو نزہت کو بھی غصہ آنے لگا تھا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ انوار کبھی کبھی نزہت کو غصے میں اس کے گھر بھیج دیتا اور پھر کچھ دنوں بعد لے بھی آتا تھا۔

تین مہینوں کے بعد ایک روز پھر رقعہ آ گیا۔ یہ بھی پہلے دو رقعوں کی طرح لیٹر بکس سے انوار نے نکالا تھا۔ میں نے اس موقعہ پر نزہت سے پوچھا تھا کہ یہ رقعے گھر کے کسی اور فرد کے ہاتھ کیوں نہیں آتے تھے؟ نزہت نے بڑا اچھا جواب دیا جو یہ تھا کہ ڈاکیا بارہ بجے سے ایک بجے کے درمیان گلی سے گزرتا ہے اور ایک بجے کے بعد گھر کا کوئی نہ کوئی فرد لیٹر بکس کھول کر دیکھتا ہے۔ اس کے بعد کوئی ڈاک نہیں آتی۔ اُس نے کہا کہ یہ رقعہ کوئی اس وقت ڈال جاتا تھا جب انوار کا دفتر سے آنے کا وقت ہو جاتا تھا۔ اس طرح رقعہ انوار کے ہاتھ لگتا تھا۔

اگر میں ستار اور نزہت کی محبت کی کہانی اور نزہت اور انوار کی ازدواجی زندگی کے حالات سنا رہا ہوتا تو پوری تفصیل سے بیان کرتا لیکن میں ایک تفتیشی کہانی سنا رہا ہوں۔ اس واسطے باقی تفصیلات کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ آپ یہ ذہن میں رکھ لیں کہ عبدالستار کے رقعے آتے رہے اور ان کے باعث انوار اور نزہت کی ازدواجی زندگی میں اتنی سخت ناچاقی پیدا ہو گئی کہ انوار نے نزہت کو طلاق کی دھمکی بھی ایک بار دے دی تھی۔ ان کے گھر والے بہت پریشان ہو رہے تھے کہ ان کو ہو کیا گیا ہے۔

تیسرے رقعے میں ستار نے کچھ ایسے لفظ لکھ دیئے تھے جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اب کسی نہ کسی طرح نزہت کو اس ازدواجی زندگی سے یعنی انوار سے آزاد کرا لے گا۔ تینوں رقعوں میں ایسے الفاظ ضرور ہوتے تھے جن سے صاف پتہ لگتا تھا کہ نزہت ستار کو ضرور ملتی ہے۔ مثلاً مجھ کو یہ الفاظ آج بھی یاد ہیں کہ تم اُس دن ملی تھیں تو بہت باتیں ہوئی تھیں اب اگلی ملاقات پر کوئی فیصلہ کریں گے۔

یہ بڑا ہی خطرناک رقعہ تھا یعنی تیسرا رقعہ۔ اس رقعے کے پیش نظر ستار میرا نمبر ایک مشتبہ بن گیا لیکن نزہت کہتی تھی کہ یہ ہینڈ رائیٹنگ ستار کا نہیں۔ میں اس کی یہ دلیل نہیں مان سکتا تھا اس واسطے کہ ستار یہ احتیاط کرتا ہو گا کہ اس کا اپنا ہینڈ رائیٹنگ نہ پہچانا جائے تاکہ بات کھل جانے پر وہ یہ کہہ سکے کہ یہ رقعے میں نے تو لکھے ہی نہیں۔ مجھ کو خیال آیا کہ ستار بڑا چالاک نوجوان ہے اور اس نے یہ رقعے اپنے کسی دوست سے لکھوائے ہیں۔

''انوار نے یہ رقعے پھاڑ دیئے ہوں گے؟''---- میں نے کہا۔

''نہیں''---- نزہت نے کہا---- ''میرے سامنے اس نے کوئی رقعہ نہیں پھاڑا تھا۔ مجھے امید ہے کہ یہ رقعے اس نے اپنے اٹیچی کیس یا اپنی الماری میں محفوظ رکھ لئے ہوں گے۔ ان رقعوں کو وہ کسی بھی وقت میرے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے کہیں دیکھے تو نہیں۔ اگر اس کا اٹیچی اور الماری کھلوا کر تلاشی لی جائے تو شاید رقعے مل جائیں''۔

''تم نے کہا تھا کہ انوار کے دل سے سارے شک شبہے نکل گئے تھے''---- میں نے کہا اور پوچھا---- ''یہ کس طرح ہُوا تھا؟''

''یہ رقعے آنا بند ہو گئے''---- نزہت نے جواب دیا---- ''میں نے دلی طور پر انوار کے ساتھ بڑا پیارا سلوک جاری رکھا اور اس کو عملی طور پر یقین دلاتی رہی کہ میں صرف اُس کی ہوں۔ اس طرح کرتے کرتے ایک رات ستار کے موضوع پر بات شروع ہو گئی تو میں نے دیکھا کہ انوار بات سننا چاہتا تھا۔ میں نے اس کو منوا لیا کہ میں کوئی بے وفائی نہیں کر رہی اور کبھی کی بھی ہے تو آئندہ نہیں ہو گی''۔

نزہت نے مجھ کو تفصیل سے بتایا کہ اس نے انوار کو کس طرح راضی کیا اور اس کے دل کو صاف کر دیا تھا۔

گلی گلی بدنام ہو گئی

''ایک بات بتاؤ نزہت!''---- میں نے کہا---- ''ان رقعوں نے تمہاری زندگی اجیرن بنا دی تھی۔ قدرتی بات ہے کہ تم ستار سے ملی ہو گی اور اس کو یہ سارا مسئلہ بتایا ہو گا''۔

نزہت سچ بولنے والی لڑکی تھی۔ اس نے فوراً اقرار کر لیا کہ وہ ستار سے ملتی تھی اور ستار قسمیں کھاتا تھا کہ اس نے ایسا کوئی رقعہ بھیجا اور نہ وہ ایسی ذلیل حرکت کرنے کی سوچ سکتا ہے۔ نزہت نے ایک عورت کا نام لیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ نام زینو تھا۔ ڈائری میں نام نہیں لکھا ہُوا۔ کچھ یاد آتا ہے کہ نام ایسا ہی تھا اور زینو ہی تھا۔ آپ نے میری اور جناب احمد یار خان صاحب کی تفتیشی کہانیوں میں ایسی عوتوں وکا ذکر پڑھا ہو گا۔ یہ عورتیں کھاتے پیتے گھروں کا جا کر کام کاج کرتی ہیں اور اس طرح روزی کماتی ہیں۔ یہ اتنی چالاک اور ہوشیار ہوتی ہیں کہ یہ گھر کی بھیدی بن جاتی ہیں اور عورتوں کی ملاقاتیں ان کے آشناؤں

سے کراتی ہیں اور محبت کرنے والے لڑکے لڑکیوں کے پیغام اِدھر اُدھر پہنچاتی ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ میں ایسی استادی پیدا کی ہوئی ہوتی ہے کہ ہر کسی کے دل پر قبضہ کر کے ہر کسی کی ہمراز بن جاتی ہیں۔ یہ عورتیں ہر بُرا فعل کرتی ہیں لیکن ایسی صفائی سے کہ ہر کوئی ان کو اچھا سمجھتا ہے۔

زینو اسی ٹائپ کی عورت تھی۔ نزہت کے ماں باپ کے گھر اس کا آنا جانا زیادہ تھا اور ان کے کچھ کام زینو ہی کرتی تھی۔ انوار کے گھر میں بھی زینو نے ٹھیک ٹھاک اعتبار پیدا کیا ہوا تھا۔ ایک بار نزہت نے زینو کو الگ بٹھا کر کہا کہ ستار کو کہنا کہ اس طرح رقعہ نہ بھیجے اس طرح میری بدنامی ہوتی ہے اور انوار کے ساتھ اس معاملے میں میری اَن بَن ہو گئی ہے۔ نزہت نے یہ بھی بتایا کہ زینو کو ان کی محبت کا علم تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ زینو نے ستار کو جا کر میرا یہ پیغام دیا تو وہ یہ جواب لائی کہ ستار حیران ہو رہا تھا کہ اس نے تو کوئی رقعہ نہیں لکھا نہ ہی اس کے لیٹر بکس میں ڈالا ہے۔

یہ پہلے رقعے کے بعد کی بات ہے۔ اس کے بعد نزہت خود ستار سے ملی تھی اور ستار نے اس کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس طرح اس کو بدنام نہیں کرے گا اور ایسی گھٹیا حرکت تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔

نزہت اور اس کے پورے خاندان کے واسطے بہت ہی بُری صورت حال یہ پیدا ہو گئی تھی کہ اس کی ہر طرف، گلی گلی بدنامی ہو گئی۔ معلوم نہیں کون یہ ساری کہانیاں اور وارداتیں جن کا تعلق ستار اور نزہت کی محبت کے ساتھ تھا، ہر طرف پھیلاتا پھر رہا تھا۔ نزہت نے بتایا کہ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ستار نزہت کے نام رقعے لکھتا ہے اور نزہت اس کو ملتی ہے اور ان دونوں نے مل کر انوار کو اُلّو بنایا ہُوا ہے۔ میں نے کچھ اور سوال و جواب کئے اور مزید باتیں معلوم ہوئیں اور کچھ اپنے شکوک رفع کئے پھر میں نے انوار کے باپ کو بلایا اور نزہت کی موجودگی میں کہا کہ میں انوار کے اٹیچی کیس اور اس کی الماری کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ باپ اسی وقت مجھ کو اپنے ساتھ لے گیا۔

انوار کا گھر تو کربلا بنا ہُوا تھا۔ انوار کی رشتے برادری کی عورتیں شاید آ گئی تھیں اور وہ سب بَین کر رہی تھیں۔ یہ آوازیں اور یہ منظر میری برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ وہ خاصی بڑی پرانی ٹائپ کی حویلی تھی۔ مجھ کو اندر لے گئے لیکن خدا کا شکر ہے کہ صحن میں نہ جانا پڑا جہاں انوار کی میت رکھی ہوئی تھی۔ ڈیوڑھی سے ہی سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ انوار اور

نزہت کا کمرہ بالائی منزل میں تھا۔

انوار کا اٹیچی اور اس کی الماری کو تالے لگے ہوئے تھے۔ نزہت نے میز کی درازیں دیکھیں تو ایک دراز میں سے چابیاں نکل آئیں۔ میں نے پہلے اٹیچی کھولا اور اس کی ساری چیزیں باہر نکالیں لیکن مطلوبہ رقعے نہ ملے۔ پھر الماری کھولی جس میں کچھ کتابیں اور کاغذات اور ایسی ہی ضرورت کی کچھ چیزیں پڑی ہوئی تھیں اس کی تلاشی لیتے لیتے ایک فائل ملی اور اس میں سے تینوں رقعے مل گئے۔

میں نے پہلے ہی رقعے کی تہیں کھول کر دیکھا تو ہینڈ رائیٹنگ مانوس لگا جیسے یہ تحریر میری جانی پہچانی ہو۔ میں نے فوراً جیب سے وہ رقعہ نکالا جو انوار کی لاش کی جیب سے برآمد ہُوا تھا۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہینڈ رائیٹنگ بالکل ایک جیسا تھا۔ پھر دوسرے دو رقعے دیکھے۔ یہ بھی اسی ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔

پھر میں نے ایک خاص بات دیکھی، وہ یہ کہ چاروں کاغذ ایک ہی جیسے تھے۔ ان کی لمبائی چوڑائی بالکل ایک جیسی تھی اور یہ تمام کاغذ اوپر سے کاٹے ہوئے تھے۔ صاف پتہ لگ رہا تھا کہ یہ رائیٹنگ پیڈ میں سے نکالے گئے ہیں اور پیڈ کے اوپر جو نام اور ایڈریس وغیرہ چھپا ہُوا ہوتا ہے وہ کاٹ کر الگ کر دیا گیا ہے۔ ایک کاغذ کے اوپر والے سرے پر چھپے ہوئے ایک لفظ کا نیچے والا بہت تھوڑا سا حصہ موجود تھا یعنی نام اور ایڈریس والا حصہ اس طرح کاٹا گیا کہ ایک لفظ کے تمام حروف نیچے سے ذرا ذرا موجود تھے۔ یہ انگریزی کا لفظ انبالہ تھا۔ اے کے نیچے والا ذرا جتنا حصہ پھر این اور پھر اسی طرح ہر حرف کا نیچے کا بہت ہی تھوڑا حصہ موجود تھا۔ کسی عام آدمی کی نظر شاید اس پر نہ پڑتی، میری نظر نے یہ دیکھ لیا اور پہچان لیا کہ پیڈ کا اوپری حصہ پھاڑنے والے نے پوری احتیاط نہیں کی۔ یہ تو آپ جان چکے ہیں کہ یہ چار تحریریں کیا تھیں۔ ایک رقعہ جو انوار کی جیب سے برآمد ہُوا تھا اور باقی تین رقعے جو انوار نے اپنے گھر کے لیٹر بکس سے نکالے تھے۔

اب تو اس میں کوئی شک نہ رہا کہ انوار کی جیب سے جو رقعہ برآمد ہوا تھا وہ اس کا لکھا ہُوا نہیں تھا۔ میں یہ رقعے اپنے قبضے میں لے کر وہاں سے نکل آیا اور انوار کے باپ اور اس کے بڑے بھائی کو ساتھ لے کر اسی بیٹھک میں جا بیٹھا جہاں مجھ کو صبح بٹھایا گیا تھا۔ ان دونوں سے میں نے کچھ اور باتیں پوچھیں۔ دونوں نے تصدیق کر دی۔ انہوں نے اس کی بھی تصدیق کر دی کہ مہینے ڈیڑھ مہینے سے انوار اور نزہت کی آئے روز کی جھک جھک اور

ناچاقی ختم ہوگئی تھی اور دونوں بڑے پیار سے ہنستے کھیلتے رہنے لگے تھے۔

نزہت کے ساتھ اتنی زیادہ باتیں ہوئی تھیں کہ میں جب وہاں سے واپس تھانے چلا تو دن کے دو بج چکے تھے۔

میں تھانے پہنچا تو انجن ڈرائیور آیا بیٹھا تھا۔ وہ پانچ دس منٹ پہلے پہنچا تھا۔ یہ اس وقت کے انتظامات تھے اور فرض شناسی بھی کہ اتنی جلدی سٹیشن ماسٹر نے ڈرائیور کو بلوالیا اور تھانے بھیج دیا تھا۔ وہ بھی کرسچین تھا اور خوش طبع آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے واسطے چائے وغیرہ منگوائی۔

''انسپکٹر صاحب!''— ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے کہا— ''میں نے اس شخص کو دانستہ ٹکر نہیں ماری تھی، مجھ کو حوالات میں بند نہ کر دینا۔ یہ ریل گاڑی تھی، کار یا بس نہیں تھی کہ آدمی آگے آ جائے تو گاڑی کو ایک طرف کر لیا جاتا ہے''۔

''اور میں یہ بھی جانتا ہوں''— میں نے ہنستے ہوئے کہا— ''کہ ریل گاڑی کو یکلخت بریک بھی نہیں لگائی جا سکتی...... میں نے آپ کو یہاں آنے کی تکلیف اس واسطے دی ہے کہ مجھ کو صرف یہ بتا دیں کہ اس آدمی کو ٹکر کس طرح لگی اور وہ کہاں تھا اور یہ سب کیسے ہوا''۔

''میں آپ کے کام میں دخل اندازی نہیں کر رہا''— ڈرائیور نے کہا— ''صرف دلچسپی کی خاطر پوچھ رہا ہوں کہ گاڑی کے نیچے لوگ آتے ہی رہتے ہیں، آپ اتنی تفتیش کیوں کر رہے ہیں؟''

''میری تو جان پر بن گئی ہے''— میں نے جواب دیا— ''گاڑی کے نیچے آ کر کٹ جانے والا شخص خودکشی کرتا ہے یا غلطی سے گاڑی کے آگے آ جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں پولیس اتنا ہی کرتی ہے کہ لاش کا پوسٹ مارٹم کروا کے لاش وارثوں کے حوالے کر دیتی ہے لیکن یہ کیس نہ ہی خودکشی کا ہے اور نہ ہی اتفاقیہ یا حادثاتی موت ہے بلکہ یہ قتل کی واردات معلوم ہوتی ہے''۔

میں نے اس کو بتایا کہ اس کے انجن کی ٹکر سے مرنے والے کی جیب سے ایک رقعہ برآمد ہُوا تھا جو مشکوک تحریر ہے۔ ڈرائیور کو ساری بات سنا چکا تو میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا تاثر کچھ بدل سا گیا اور اُس کی آنکھیں کچھ زیادہ کھل گئیں۔ اُس نے اس طرح آہستہ آہستہ سر اوپر نیچے ہلایا جیسے اس کو کوئی خاص خیال آ گیا ہو۔

''آپ کا یہ شک غلط نہیں ہو سکتا''— ڈرائیور نے کہا— ''میں آپ کو یہ سارا منظر اور وقوعہ بڑے صاف لفظوں میں سنا دیتا ہوں اور رائے آپ خود قائم کر لیں...... رات گہری اندھیری تھی۔ انجن کی سامنے والی روشنی بالکل ٹھیک اور صاف تھی اور اس میں دُور تک نظر کام کرتی تھی۔ میں اس وقت آگے دیکھ رہا تھا اور دوسری طرف میرا فائرمین آگے کو دیکھ رہا تھا۔ ہم لوگ عام طور پر آگے کم ہی دیکھا کرتے ہیں لیکن آگے سٹیشن آ رہا تھا اور انجن آؤٹر سگنل کے قریب پہنچ رہا تھا اور اس واسطے میں سامنے دیکھ رہا تھا کہ آؤٹر سگنل اور اس کے بعد آنے والا اسگنل ڈاؤن ہیں یا کہ نہیں۔ مجھ کو سگنل کی سبز بتی جلتی نظر آئی اور جب انجن آؤٹر سگنل سے آگے نکل گیا تو ذرا ہی آگے مجھ کو ریلوے لائن کے قریب بائیں طرف چار آدمی کھڑے نظر آئے۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ ان کو معلوم ہی نہ ہوتا کہ گاڑی آ رہی ہے۔ انجن کی روشنی اور گاڑی کا شور ایسا تھا کہ وہ بے خبر ہو ہی نہیں سکتے تھے......

''میں احتیاطاً فائرمین سے کہنے ہی لگا تھا کہ وسل بجا دے اس نے پہلے ہی وسل دے دی۔ وہ انجن کی دوسری سائیڈ پر تھا اور وسل بجانے والا تار اس کے قریب تھا۔ میں ان چاروں کو دیکھتا رہا۔ مجھ کو اس طرح لگا جیسے تین آدمیوں نے ایک آدمی کو ریلوے لائن کی طرف گھسیٹا اور دھکیلا ہو۔ انجن بالکل ان کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے انجن کی سٹیم کچھ دیر پہلے بند کر دی تھی، پھر بھی رفتار تیز تھی۔ اب فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے وہ چاروں انجن کی روشنی میں اور صاف نظر آ رہے تھے۔ ایک آدمی کو دو آدمیوں نے لائن کی طرف دھکیلا اور لائن سے دور دوڑتے ہوئے بیٹھ گئے اور چوتھا انجن کے قریب ہو گیا۔ اس کو اس کے ساتھ والے آدمیوں نے یقیناً پیچھے سے دھکہ دیا تھا کہ وہ لائن پر گر جائے یا کھڑے انجن کے آگے آ جائے......

''میں نے اتنا ہی دیکھا کہ انجن نے اس آدمی کو ٹکر ماری اور انجن آگے نکل گیا۔ اس طرح یہ ہُوا کہ انجن کی روشنی آگے نکل گئی اور پیچھے اندھیرا رہ گیا۔ باہر سے بڑی ٹھنڈی ہَوا میرے منہ پر پڑ رہی تھی جس کے باعث میری آنکھوں میں کچھ پانی سا آ رہا تھا۔ میں نہیں دیکھ سکا کہ وہ آدمی انجن کی ٹکر سے لائن کے اندر گرا یا باہر کو۔ پہلے مجھ کو شک تھا کہ اس آدمی کو لائن کی طرف دھکیلا گیا تھا۔ یہ میں نے اس طرح دیکھا تھا جس طرح دھند میں کوئی چیز دیکھی جاتی ہے لیکن اب آپ نے قتل کا شک ظاہر کیا تو میں نے اپنے ذہن پر زور دیا اور اس منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے لایا تو اب میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مرنے والے کو

اس کے ساتھ والے آدمیوں نے لائن کی طرف دھکہ دیا تھا اور اس طرح وہ انجن کے آگے آ گیا۔ اس کو پیچھے ہٹنے کی مہلت نہ ملی اور وہ لائن پر شاید نہیں گرا تھا یہ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے سٹیشن پر جا کر سٹیشن ماسٹر کو اطلاع دے دی تھی۔ یہ میرا فرض تھا لیکن اُس وقت میں نے اس وقوعے یا حادثے کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی تھی ...... میں نے جو دیکھا تھا وہ بیان کر دیا ہے۔ آپ نے جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لیں، میں اچھی طرح یاد کر کے آپ کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دوں گا''۔

اس ڈرائیور نے اور کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں چھوڑی تھی۔ پھر بھی میں نے پوری طرح یقین کرنے کے واسطے اس سے کچھ باتیں پوچھیں اور وہ جواب دیتا رہا۔ آخر اس کو میں نے بتایا کہ یہ کیس جب عدالت میں جائے گا تو اس کو یہ بیان وہاں دینا پڑے گا۔ اس کے بعد میں نے اس کو جانے کی اجازت دے دی۔

اُس نے تو کوئی شک رہنے ہی نہیں دیا تھا۔ یہ تو سو فیصد یقین ہو گیا کہ یہ خودکشی کی واردات نہیں تھی نہ انوار اتفاقیہ انجن کے آگے آیا تھا۔ اب یہی صورت تصدیق شدہ تھی کہ انوار کو اس طریقے سے قتل کیا گیا ہے کہ اس کو دھکہ دے کر انجن کے آگے پھینکا گیا تھا۔

اب یہ میرا مسئلہ تھا کہ معلوم کروں کہ یہ تین آدمی کون تھے۔ ڈرائیور سے میں نے پوچھا تھا کہ وہ ان آدمیوں کو یا کسی ایک کو بھی پہچان سکتا ہے؟ ...... اس نے کہا یہ اس کے واسطے ممکن نہیں تھا کہ چہرے پہچان سکتا۔

مشکوک عاشق

اب بہت ہی ضروری ہو گیا تھا کہ تفتیش تیز کر دی جائے۔ ڈرائیور کے جانے کے بعد دو مخبر آ گئے۔ یہ دونوں اچھے اخلاق کے آدمی نہیں تھے اور اتنے جرائم پیشہ بھی نہیں تھے کہ ان کو میں ہسٹری شیٹر کہتا۔ آپ نے اپنے شہروں قصبوں وغیرہ میں دیکھا ہو گا کہ کوئی آدمی کسی بھی قسم کا ظاہری طور پر کام کاج نہیں کرتا لیکن اس کے گھر کی دال روٹی ٹھیک ٹھاک چلتی رہتی ہے۔ ایسے لوگ جواریوں اور عادی مجرموں کے گہرے دوست ہوتے ہیں اور پولیس کا کام بھی کرتے ہیں اور جہاں کہیں موقع ملے چھوٹی موٹی واردات بھی کر لیا کرتے ہیں۔ کام کتنا ہی گھٹیا کیوں نہ ہو چار پیسے ملنے کی توقع ہو تو وہ انتہائی گھٹیا کام بھی کر

لیتے ہیں۔ یہ جب پولیس کے مخبر بن جاتے ہیں تو اپنے سگے ماں باپ کے خلاف مخبری کرنے سے بھی نہیں ٹلتے۔ مجموعی طور پر یہ لوگ پولیس کے کام آتے ہیں اور ان سے بہت ں مدد ملتی ہے۔

ایسے دو مخبر آ گئے تھے اور مجھ کو بتایا گیا کہ وہ کوئی خاص خبریں لائے ہیں۔ میں نے یک کو اپنے پاس بلایا اور اس کی رپورٹ لی۔ اس سے جو کچھ پوچھنا تھا پوچھا اور پھر وسرے کو بلایا اور اس کی رپورٹ لی۔

ان دونوں کی رپورٹیں ایک جیسی تھیں۔ مختصراً رپورٹ یہ تھی کہ نزہت کو انہوں نے بدالستار سے ملتے چند مرتبہ دیکھا تھا۔ ان دونوں نے اپنے ذرائع کے مطابق اور اپنی مخبر طرت کے زیر اثر ان دونوں پر نظر رکھی اور یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ نزہت ستار سے وری چھپے ملتی ہے اور اپنے خاوند کو چاہنے کی بجائے ستار کے ساتھ تعلق رکھا ہُوا ہے۔ ان ونوں کا مطلب یہ تھا کہ شادی سے پہلے تو نزہت اور ستار کی صاف ستھری محبت ہو گی لیکن اب ان کے تعلقات ناجائز ہو گئے تھے۔

یہ تو ان دونوں مخبروں کو معلوم نہیں تھا کہ ان کی اس خفیہ محبت کا انجام اتنا بھیانک ہو گا۔ یہ ان مخبروں کی دلچسپی کی بات تھی اس واسطے ان کو دیکھتے رہے۔ میں نے آپ کو بتایا کہ یہ کس ذہنیت کے آدمی تھے۔ مجھ کو یقین ہے کہ انہوں نے ایسا موقع تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہو گی کہ ان کو بلیک میل کر کے پیسہ کمایا جائے۔ مجھ کو ان سے ایسی دلچسپی نہیں تھی کہ ان کے ارادے کیا تھے۔ میری ضرورت صرف یہ تھی کہ معلوم ہو جائے کہ نزہت پنے خاوند کے ساتھ بے وفائی کرتی تھی اور ستار سے خفیہ ملاقاتیں جاری رکھی ہوئی تھیں۔

یہ میں اس خیال کے تحت معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ انوار کے قتل میں نزہت بھی شامل ہو۔ میں نے اگر نزہت کی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ وہ اعتماد سے سچ بول رہی تھی تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ اخلاقی طور پر یا چال چلن کے لحاظ سے بھی صاف ستھری تھی۔ تفتیش تو ذرا ذرا سے شک پر بھی کی جاتی ہے۔

ان دونوں مخبروں نے زینو کا نام بھی لیا اور کہا کہ ستار اور نزہت کی ملاقاتیں بعض اوقات زینو کرواتی ہے اور ان کے پیغام ایک دوسرے کو پہنچاتی ہے۔ میں نے پہلے بتایا کہ نزہت نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ اس نے زینو کی زبانی ستار کو پیغام بھجوایا تھا کہ وہ رقعے نہ لکھا کرے۔ اب ان مخبروں کی بات سن کر مجھ کو ذرا سا بھی شک نہ ہُوا۔ وہ تو نزہت اپنی

زبان سے ظاہر کر چکی تھی کہ زینو کو اس نے اعتماد میں لیا تھا۔

ان دونوں مخبروں نے بتایا کہ ستار ٹھیک نیت کا آدمی نہیں اور اس کے ارادے خطرناک ہیں اور وہ شریف لڑکا ہے ہی نہیں۔ دونوں مخبروں نے کہا کہ وہ کوئی شہا پیش نہیں کر سکتے لیکن یہ سچ ہے کہ ستار نے دو تین موقعوں پر کہا تھا کہ وہ نزہت کے شادی کر کے ہی رہے گا خواہ اس کو قتل کی واردات ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ مختصر یہ کے بارے میں ان دونوں کی رپورٹ خطرناک تھی اور وہ ثابت کر رہے تھے کہ ستار سے پکا بدمعاش ہے اور وہ کسی بھی حد تک پہنچنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

ان دونوں کے بعد میں نے شام کے بعد زینو کو تھانے بلایا۔ اس عورت کو دیکھ میں نے دل میں کہا کہ یہ عورت پولیس کے کام کی چیز ہے۔ عمر اس کی پینتیس چھتیس سال گی لیکن لگتی عمر سے کم کی تھی۔ اللہ نے کیا کشش والا جسم اس کو دیا تھا اور چہرے کے نقش اور آنکھیں ایسی جیسے مسکرا رہی ہوں۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ ایک مزدور پیشہ خا بیوی ہے اور لوگوں کے گھروں میں کام کر کے گزارا کرتی ہے۔ آپ نے یہ محاورہ کہ فلاں آدمی اس قدر چالاک اور سیاست باز ہے کہ آسمان پر جا کر تارا کی لگا بھی سکتا اور اتار بھی سکتا ہے۔ یہ محاورہ اس عورت پر فٹ آتا تھا جس کا نام زینو تھا۔

میں نے اس سے نزہت کی بابت پوچھا تو اس نے میری بات مکمل ہونے ہی اور اس کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں اس مسکراہٹ ہی سے سمجھ گیا کہ ا رپورٹ نزہت کی بابت ٹھیک نہیں۔ اس نے بالکل وہی رپورٹ دی جو دو مخبر دے تھے۔ بلکہ مجھ کو کچھ شک سا ہوا جیسے ان تینوں نے آپس میں بیان ملا لئے تھے اور کسی فائدے کے واسطے ایک جیسی رپورٹ دے رہے ہیں لیکن یہ شک آیا اور میرے دماغ نکل گیا۔ میں نے سوچا کہ ستار اور نزہت بے احتیاطی سے ملتے ملاتے ہوں گے ا مخبروں نے اور اس عورت نے ان کو دیکھ لیا۔ زینو نے یہ فالتو بات بتائی کہ نزہت پیغام وہی ستار تک لے جاتی تھی اور ستار کے پیغام نزہت کو پہنچاتی تھی۔

میں اس کے بیان کے دوران اس سے کچھ سوال بھی کرتا جاتا تھا۔ اس نے بتایا تینوں رقعے ستار نے لکھے تھے اور اس نے یعنی زینو نے لیٹر بکس میں ڈالے تھے۔ ستار یہ کہا تھا کہ رقعے چار بجے سے پہلے لیٹر بکس میں ڈالے جائیں تا کہ انوار دفتر سے نکال لے۔ ستار کا مقصد یہ تھا کہ ان رقعوں کے ذریعے انوار اور نزہت میں غلط فہمی

جائے اور انوار نزہت کو بدچلن سمجھ کر طلاق دے دے۔ اس کے بعد نزہت اور ستار نے طے کر رکھا تھا کہ شادی کر لیں گے۔ نہ ہوئی تو کہیں بھاگ چلیں گے یا عدالت میں جا کر شادی کر لیں گے۔

زینو نے یہ بھی بتایا کہ ستار کے منہ سے ایک دو مرتبہ اس قسم کے الفاظ نکلے کہ میری یہ سکیم کامیاب نہ ہوئی تو انوار کو کسی نہ کسی طرح راستے سے ہٹا دوں گا۔

میں نے زینو سے پوچھا کہ ستار جب اسے رقعہ دیتا تھا تو کیا یہ رقعہ اس کے سامنے لکھتا تھا یا پہلے ہی لکھا ہوا ہوتا تھا؟...... زینو نے ذرا سوچا پھر اس نے بتایا کہ دو مرتبہ اس نے جیب سے رقعہ نکال کر اس کو دیا تھا اور تیسری مرتبہ اس نے کہا تھا کہ ذرا اندر گپ شپ لگاؤ اور میں رقعہ لکھ لیتا ہوں۔ یہ لے جانا۔

یہ میں نے اس خیال سے پوچھا کہ یقین ہو جائے کہ یہ رقعے ستار کے ہی لکھے ہوئے تھے۔ زینو کے جواب سے مجھ کو معلوم ہوا کہ ایک رقعہ ستار نے لکھ کر دیا تھا۔ اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ یہ تحریر ستار کی ہے۔ میں نے زینو کو گھر بھیج دیا اور اے ایس آئی کو بلا کر ستار کا ایڈریس دیا اور کہا کہ کل علی الصبح یہ شخص تھانے میں موجود ہو۔ اس کے بعد میں اپنے گھر چلا گیا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

میں صبح سورج نکلتے وقت تھانے گیا تو ستار تقریباً اُس وقت آ گیا۔ میں اس کو اپنے دفتر میں لے گیا اور بٹھایا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا خوبرو جوان تھا اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں سویلین کلرک تھا۔ چہرے سے ہی لگتا تھا کہ وہ سخت خوفزدہ ہے۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کی کوشش ہی نہ کی اور یہی بہتر سمجھا کہ اس کو مزید خوف میں مبتلا کر دوں۔ اس کو کہا کہ اس کی خیریت اسی میں ہے کہ فوراً سچ بول دے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور منہ اور آنکھیں کھولے ہوئے مجھ کو دیکھتا رہا۔

''میں نے تم کو خواہ مخواہ نہیں بلا لیا'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''تمہارے خلاف بڑی پکی شہادت ملی ہے اس واسطے تم کو بلایا ہے۔ تم مت بولو میں تم کو بتاتا ہوں کہ تمہارے اور نزہت کے تعلقات کیسے ہیں اور تم دونوں کے پروگرام کیا ہیں''۔

''نہیں جناب!'' ـــــ اس نے سخت ڈری ہوئی آواز میں کہا ـــــ ''نزہت کے ساتھ میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں نہ ہم نے کوئی ایسا ویسا پروگرام بنایا ہے''۔

''کیا تم اور نزہت عشق و محبت کا ڈرامہ نہیں چلا رہے تھے؟'' ـــــ میں نے پوچھا اور

اس کے جواب سے پہلے کہا۔۔۔ ''تمہاری تو اس کے ساتھ بڑی ہی پرانی محبت ہے''۔

''بالکل نہیں جناب!''۔۔۔ اُس نے کانپتی لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔۔۔ '' شادی سے پہلے کبھی کبھی اس کے ساتھ ملاقات ہوجاتی تھی۔ اس کی شادی ہوگئی تو بھی ختم ہوگیا''۔

اس نے تو اپنے خلاف شک اور زیادہ پختہ کردیا۔ وہ اتنی سی بات بھی نہیں مان کہ وہ نزہت کو اور نزہت اس کو چاہتی تھی۔ نزہت نے تو بڑی جرأت سے کہا تھا کہ آپس میں محبت تھی اور وہ ستار کے ساتھ ہی شادی کرنا چاہتی تھی لیکن ستار تو بالکل ہی رہا تھا۔ میں نے اس کو ڈرایا کہ وہ جھوٹ بولنے سے باز نہ آیا تو میں اس کے ساتھ والا سلوک کروں گا۔ پھر بھی وہ انکار ہی کرتا رہا لیکن اس کے چہرے کا رنگ بالکل ہی تھا اور جب بولتا تھا تو پہلے اس کو ہچکی سی آتی تھی اور پھر بولتا اور پھر ہچکیاں لیتا تھا۔ یہ اور گھبراہٹ کی بڑی واضح نشانی ہوتی ہے۔

مجھ کو خیال آیا کہ سب سے پہلے اس کا ہینڈ رائیٹنگ دیکھوں۔ اس کے ساتھ ہی آ گیا کہ اس کو میں نے فوراً کہہ دیا کہ کاغذ پر دو چار کوئی سے فقرے لکھ دو تو یہ اپنا ہینڈ بدل کر لکھے گا اور اس کے ساتھ ہی یہ اتنا ڈرا اور گھبرایا ہُوا ہے کہ اس کے ہاتھ کانپ ہیں۔ اس جسمانی حالت میں اگر اس نے اپنے صحیح ہینڈ رائٹنگ میں بھی کچھ لکھا تو وہ ٹھیک ہوگا۔ اس کو نارمل ذہنی حالت میں لانا ضروری تھا۔ میں نے اس کا طریقہ سوچ لیا۔

''تم تو بالکل ہی بزدل نکلے عبدالستار!''۔۔۔ میں نے دوستوں کی طرح ہوئے کہا۔۔۔ ''اتنی زیادہ خوفزدگی کی بھلا کیا ضرورت پڑگئی تھی؟ انوار نے خودکشی کی میں یہ فیصلہ لکھنا چاہتا ہوں کہ یہ خودکشی کی واردات ہے۔ مرنے والے نے وجہ یہ کہ اس کی بیوی بدچلن تھی اور یہ ایسی بے عزتی ہے جو وہ برداشت نہیں کرسکا اور گا آگے آ کر مر گیا۔ تم اتنا سا کام کرو کہ ذرا حوصلہ قائم کرکے دو فقرے لکھ دو کہ میرا اس کی بیوی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ کبھی ہوگا۔ نیچے اپنا نام اور پتہ لکھ دو اپنے کاغذات میں رکھ لوں گا اور بات ختم ہوجائے گی۔ اس سے ایک تو میری جان گی اور تم کو بھی چھٹی مل جائے گی۔ بس اتنی سی بات ہے۔ میں تو تم کو آزما رہا تھا کہ گُردے والے آدمی ہو۔ یار! مسلمان ہو کر اتنا ڈرتے ہو؟ میں بھی مسلمان ہوں چھوٹے بھائی ہو، میں تمہارے نقصان میں راضی نہیں ہوں۔ مت گھبراؤ اور یہ تحر

جاؤ اپنے آفس، کام کاج کرو''۔

میرے ان لفظوں نے اور پھر دوستانہ اور برادرانہ انداز نے یہ کرشمہ دکھایا کہ ستار کے چہرے پر اس کا اصل رنگ واپس آ گیا۔ میں نے اس کو پوری طرح نارمل حالت میں لانے کے واسطے چائے منگوائی اور ساتھ بسکٹ بھی منگوا لئے۔ میں نے یہ آرڈر ایک کانسٹیبل کو دیا تو میں نے دیکھا کہ ستار کچھ واپس اپنی حالت میں آ رہا تھا۔ میں نے اس کو یہ بھی کہا کہ مجھ کو ذرا سی بھی دلچسپی نہیں کہ اس کے نزہت کے ساتھ تعلقات کیسے تھے یا کیسے ہیں۔

اس کے ساتھ کچھ اور باتیں بھی کیں لیکن ان باتوں کا تعلق اس واردات کے ساتھ نہیں تھا۔ چائے آ گئی اور چائے پینے کے درمیان میں نے کاغذ اور پین اس کے آگے رکھا اور اس نے اپنا پین نکالا اور بولا کہ میں اس کو بتاؤں کہ کیا لکھنا ہے۔

میں نے کہا۔۔۔ ''ڈرو نہیں، آرام آرام سے لکھو...... بخدمت جناب سب انسپکٹر انچارج تھانہ انبالہ کینٹ......''

میں نے پہلے جو آپ کو سنایا ہے اس طرح کی ایک تحریر لکھوائی اور لکھوانے کے دوران میں نے کہا کہ ستار بھائی! تم یہ تحریر مجھ کو دے کر مجھ پر بہت بڑا احسان کر رہے ہو۔ تم جیسے پُروقار آدمی سے مجھ کو ایسی ہی امید رکھنی چاہئے تھی۔

اس طرح اس کی تحریر میرے سامنے آ گئی اور میں نے دیکھا کہ یہ تو بالکل ہی مختلف ہینڈ رائیٹنگ تھا اور یہ ذرا سا بھی رقعوں والے ہینڈ رائیٹنگ سے مماثلت نہیں رکھتا تھا۔ میں نے ایک اور جواز پیدا کرکے اس سے پوچھا کہ اس کی جیب میں اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی کوئی تحریر موجود ہے؟...... اس نے کوٹ کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے ایک بٹوا نکالا اور چند ایک چھوٹے چھوٹے کاغذ یعنی پرچیاں سی نکالیں۔ انہیں اُلٹ پلٹ کر ایک پرچی میرے آگے رکھ دی۔ اُس پر اس نے کچھ اپنا پیسوں کا حساب لکھا ہُوا تھا۔ ہر رقم کے ساتھ اشیاء بھی لکھی تھیں۔ یہ اس کا اصل ہینڈ رائیٹنگ تھا جو اس تحریر سے بالکل ملتا جلتا تھا جو میں نے اس سے لکھوائی تھی۔

رُقعے ڈالنے والا

یہ تو معلوم ہوگیا کہ رقعوں والی تحریر ستار کی نہیں لیکن اتنی سی بات پر میں یہ نہیں کہہ سکتا

تھا کہ یہ شخص بے گناہ ہے۔ اس کے خلاف تین مخبروں نے بیان دیئے تھے۔ میں نے
یہ دیکھنا تھا کہ ان کے بیان سچے ہیں یا ستار کا۔ میں نے ستار کا تو خوف بھی اور گھبراہٹ
ختم کر دی تھی اور وہ نارمل ذہنی حالت میں آ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح دوستی
میں اس سے بھید لینے کی کوشش کروں۔ میں نے نزہت کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ مجھے
نہیں آ رہی کہ یہ لڑکی اصل میں کیا ہے اور کیسی ہے۔ کچھ لوگ اس کے چلن کی تعریف کر
ہیں اور کچھ لوگ اس کو مشکوک چلن کی لڑکی سمجھتے ہیں۔ اس طرح میں بڑی استادی سے با
کرتا رہا اور ستار کو پھونک دینے کے واسطے کہا کہ اس لڑکی کی شادی تمہارے ساتھ ہی ہو
چاہئے تھی۔

میں ستار کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر رونق آتی جا رہی
اور آخر میں مَیں نے صاف کہہ دیا کہ میں جانتا ہوں کہ نزہت اسے چاہتی ہے اور وہ مع
نہیں کیوں انکار کر رہا ہے۔

''میں ڈر گیا تھا جناب!'' — ستار نے کہا — ''میں نے سنا تھا کہ یہ قتل کا کیس
ہے۔ اس راز سے کئی لوگ واقف ہیں کہ میری اور نزہت کی آپس میں محبت ہے۔
میرے ڈرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ ایک بار انوار نے بڑے ہی غصے کی حالت میں
سے کہا کہ میں نے نزہت کے نام ایک رقعہ لکھا ہے۔ اس نے میرا جواب سنے بغیر مجھے
دھمکیاں دیں۔ میں سخت حیران اور پریشان اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا کہ یہ کہہ کیا
ہے۔ میں نے اس کو کہا کہ پہلے وہ یہ تو یقین کر لے کہ میں نے نزہت کو کوئی رقعہ بھیجا ہے
غصہ جھاڑے اور دھمکیاں دے لیکن وہ تو میری بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ بہت دن گزر گئے
ایک بار پھر اس نے ایسی ہی بات کی۔ میں نے کہا کہ میں پہلے اس کو یقین دلانے کی کو
کر چکا ہوں لیکن آج وہ پھر میرے سر پر سوار ہوا ہے، آخر بات کیا ہے؟......

''اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اس کو پھر ویسا ہی ایک اور رقعہ ملا ہے۔ میری
وہی حالت ہو گئی اور اب تو انوار مارنے مرنے پر اُترا ہوا تھا۔ میں نے اس کو کہا کہ وہ
مجھ کو دکھا دے لیکن یہ اُس نے نہیں دکھایا۔ اُس کو تو میں نے ٹالا لیکن اُس روز یا شاید
سے اگلے روز زینو نام کی ایک عورت مجھ کو ملی اور نزہت کا پیغام دیا کہ میں اس کو رقعہ
بھیجا کروں۔ میں نے قرآن کی قسمیں کھا کر کہا کہ میں اتنا گھٹیا اور ذلیل آدمی نہیں کہ
کے ساتھ محبت کی ہے اس کو اس طرح بدنامی میں ڈالوں اور اس کی ازدواجی زندگی

کروں......

''پھر اس کے بعد نزہت کے ساتھ میری ملاقات اس کے گھر میں ہوئی اور میں نے اس کو روتے ہوئے دیکھا۔ اس کی زبانی بھی اور اپنے گھر کی عورتوں کی زبانی بھی مجھ کو پتہ لگا کہ ان رقعوں نے نزہت کی ازدواجی زندگی میں کانٹے بکھیر دیئے ہیں اور انوار اس کو بسانا نہیں چاہتا اور طلاق کی دھمکیاں دیتا ہے۔ یہ سن کر میرے دل کو بہت ہی تکلیف ہوئی''۔

اس کے بعد ستار نے مجھ کو بڑی لمبی تفصیل سے بتایا کہ وہ انوار کو دفتر میں جا کر ملا اور اس مسئلے پر بات کی اور کہا کہ مسجد میں چلو اور میں قرآن ہاتھ میں لے کر قسم کھاؤں گا اور پھر انوار کو بہت دیر سمجھاتا بجھاتا رہا کہ اپنی اور نزہت جیسی شائستہ اور سلجھی ہوئی لڑکی کی زندگی خراب کرنے کی بجائے میرے ساتھ مل کر جاسوسی کرے کہ یہ رقعے کون لیٹر بکس میں ڈال جاتا ہے۔

ستار نے یہ بھی بتایا کہ پھر ایک اور یعنی تیسرا رقعہ آ گیا۔ اس وقت انوار نے ستار کو یہ تیسرا رقعہ دکھایا اور ستار نے اس کو اپنی پہلے کی لکھی ہوئی تحریریں دکھا دیں اور کہا کہ یہی ایک ذریعہ ہے کہ وہ اس کو یقین دلا سکتا ہے کہ یہ ہینڈ رائیٹنگ اس کا ہے ہی نہیں۔ بہت سی باتیں کہہ سن کر ستار نے انوار کو ٹھنڈا کر لیا اور پھر دونوں اِدھر اُدھر سے ٹوہ لگانے میں لگ گئے کہ یہ بدمعاشی کون کر رہا ہے۔ انوار کی دوستی کا حلقہ کوئی زیادہ نہیں تھا لیکن ستار میل جول والا آدمی تھا، اس کی دوستی بھی زیادہ لوگوں کے ساتھ تھی اور پھر اس نے اپنی زبان سے یہ الفاظ مجھ کو کہے کہ جناب میں کوئی بدمعاش آدمی نہیں لیکن کوئی ایسا شریف بھی نہیں کہ دوسروں سے ڈر جاؤں یا دوسروں کے ہاتھوں بے وقوف بنوں۔

اب ستار نے ایک بڑا اچھا اشارہ دیا۔ میں نے اس دوران یعنی جب وہ بیان دے رہا تھا، زینو کی بابت پوچھا کہ وہ اس کے پاس جاتی رہی ہے۔ ستار نے بڑی ننگی گالی دے کر کہا کہ اسے میرے سامنے لائیں۔ اس نے کہا کہ وہ اس عورت کو بہت اچھی طرح جانتا ہے اور اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ایک طرح کی عصمت فروشی کرتی ہے۔ ستار نے یہ بات خاص طور پر کی کہ زینو ایک امیر کبیر آدمی کے گھر جاتی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اس نے زینو کو داشتہ بنایا ہوا ہے۔ ستار نے یہ بھی بتایا کہ اس آدمی کے بیٹے کے ساتھ بھی زینو کی میل ملاقات بڑی زیادہ ہے اور یہ بیٹا بڑا ہی اوچھا اور اپنے آپ کو شہزادہ سمجھنے والا نوجوان ہے۔ ستار نے اس امیر آدمی کا نام لیا اور اس کے بیٹے کا نام محمود بتایا۔ اس نے یہ بھی بتایا

کہ یہ شخص اپنے بیٹے محمود کے واسطے نزہت کا رشتہ مانگتا تھا لیکن نزہت کے والدین نے
کی بُری شہرت کو دیکھتے ہوئے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر یہ لڑکا محمود جہاں بیٹھتا
وہاں اعلان کرتا تھا کہ وہ اپنی یہ بے عزتی برداشت نہیں کرے گا اور نزہت کو خاندان
ساتھ آباد نہیں ہونے دے گا۔ اس کی یہ باتیں سن کر سب لوگ ہنستے تھے کہ یہ اپنے آپ
ہر کسی کا حاکم سمجھتا ہے اور کیسی اوچھی باتیں کرتا ہے۔ لوگ نزہت کے خاندان کو جانتے
کہ کتنا پُروقار خاندان ہے۔

ستار کی یہ بات سن کر مجھ کو یاد آ گیا کہ انوار کے باپ نے اشارتاً اور نزہت
تفصیل سے بتایا تھا کہ اس کا رشتہ مانگنے والوں میں ایک یہ شخص بھی تھا جس نے اپنے
محمود کے واسطے رشتہ مانگا تھا۔ نزہت نے اپنی زبان سے اس رشتے کو ٹھکرایا تھا اور پھر
بڑے ہی بُرے طریقے سے نزہت نے دھتکارا تھا۔ نزہت کہتی تھی کہ یہ بڑا ہی اوچھا اور
لڑکا ہے۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے اس واسطے دماغ کو امیری اور ماں باپ کا بے جا لاڈ
چڑھا ہُوا ہے۔ وہ ساری باتیں میرے ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ یہ کوئی پرانی باتیں نہیں تھیں
ایک روز پہلے ہی مجھ کو بتائی گئی تھیں۔

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو ستار بھائی؟''—— میں نے پوچھا۔

''میں یہیں موجود ہوں صاحب!''—— ستار نے کہا—— ''اگر آپ کو شک ہے
میں بھاگ جاؤں گا تو مجھ کو ہتھکڑی لگا لیں یا حوالات میں بند کر لیں اور میرے بیان
تصدیق کریں۔ جھوٹ ہُوا تو سزا دلوائیں''۔

ایک تو وہ ستار تھا جو میرے سامنے آیا تو خوف سے کانپ رہا تھا اور اب وہی ستار
جو پورے اعتماد اور جرأت کے ساتھ بول رہا تھا بلکہ وہ کچھ غصے میں بھی آ گیا تھا۔ اس
جوش میں آ کر یہ لفظ بھی کہہ دیئے کہ نزہت کی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے
میں بہت بڑی قربانی دے سکتا ہوں...... میں نے اس کی باتوں سے کئی باتیں نکالیں
جرح شروع کر دی۔ بہت دیر لگا کر میں نے اپنے کام کی باتیں اخذ کر لیں اور کچھ یہ
ہونے لگا کہ یہ باتیں بالکل صحیح ہیں لیکن یہ کوئی ایسی شہادت اور ثبوت نہیں تھا کہ میں مجرم
پکڑ لیتا، ابھی بہت سی شہادت اور ثبوت کی ضرورت تھی۔ مجھ کو حاصل یہ ہُوا تھا کہ
بڑے پکے مشتبہہ کی نشاندہی ہو گئی تھی۔

میں نے ستار کو کچھ ہدایت دے کر رخصت کر دیا اور اس کو کہا کہ وہ شہر سے

جائے اور جونہی میں بلاؤں فوراً پہنچے۔ کوشش کرے کہ دفتر میں رہے یا گھر میں۔

میں نے شروع میں بتایا ہے کہ اس تھانے میں آئے ہوئے ابھی مجھ کو تین چار دن
ہی ہوئے تھے۔ میں یہاں کے لوگوں سے ابھی ذرا سا بھی واقف نہیں ہُوا تھا۔ آپ نے
میری اور دوسرے انسپکٹر صاحبان کی تفتیشی کہانیوں میں ضرور پڑھا ہو گا کہ پولیس کے ایک
قسم کے مخبر تو جرائم پیشہ آدمی ہوتے ہیں اور مخبروں کی ایک قسم بڑی معزز ہوتی ہے۔ معزز بھی
اتنے کہ کوئی شک تک نہیں کر سکتا کہ یہ باوقار اور اتنی اونچی حیثیت کا آدمی پولیس کا مخبر ہے۔
میں نے اے ایس آئی کو کہا کہ وہ مجھ کو اس ٹائپ کے ایک دو آدمی ملوا دے۔ اُس نے اُسی
وقت ایک کانسٹیبل کو کسی کا نام بتا کر دوڑا دیا۔ یہاں میں بات مختصر کرنے کے واسطے بتا دیتا
ہوں کہ رات دس ساڑھے دس بجے تک میرے پاس تین معززین ایک دوسرے کے بعد
آئے اور میں نے ان سے بہت سی باتیں معلوم کیں۔ میں اگر ان تینوں کی باتیں الگ الگ
بیان کرنے لگا تو اصل بات بہت دور نکل جائے گی اور آپ کی دلچسپی مجروح ہو گی۔

ان تینوں نے بتایا کہ نزہت کا خاندان بڑا پُروقار ہے اور نزہت بڑے اچھے کردار کی
لڑکی ہے۔ انوار کے خاندان کی بابت نہایت اچھی باتیں کیں۔ محمود کے باپ کی بابت انہوں
نے یہ بتایا کہ وہ فوجی ہیڈ کوارٹر (GHQ) میں سویلین افسر لگا ہُوا ہے اور اُس محکمے کا انچارج
ہے جو محکمہ فوج کے واسطے مختلف سامان خریدتا ہے۔ اس کو لوکل پرچیز کہتے ہیں۔ جنگ عظیم میں
تو اس محکمے کے چپڑاسیوں نے بھی ہاتھ رنگے تھے۔ اس شخص کا نام اشتیاق احمد تھا۔

یہ تینوں معزز افراد گھر گھر کی خبر رکھنے والے تھے۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اشتیاق
اپنے بیٹے محمود کے واسطے نزہت کا رشتہ مانگتا تھا لیکن نزہت کے ماں باپ نے اشتیاق اور اس
کے بیٹے کی بُری شہرت کو دیکھتے ہوئے انکار کر دیا۔ پھر اس کا بیٹا محمود بڑھکیں مارتا پھرتا رہا کہ وہ
اپنے خاندان کی اور اپنی بے عزتی کا انتقام لے گا۔ ایک بات میں آپ کو یہیں بتا دیتا ہوں۔
اے ایس آئی کو معلوم ہُوا کہ اشتیاق احمد کی بابت باتیں ہو رہی ہیں تو اس نے مجھ کو الگ بٹھا کر
بتایا کہ اس شخص کے خلاف فوجی انٹیلی جنس والے انکوائری کرتے پھرتے تھے۔ یہ شخص شاید خفیہ
طور پر زیرِ نگرانی تھا۔ اُن دنوں ہندوستان میں جرمنی اور جاپان کے جاسوس بہت ہی سرگرم تھے
اور یہ سب لوگ ہندوستانی تھے۔ زیادہ تر جاسوس جاپان کے تھے۔ اے ایس آئی نے بتایا کہ
اشتیاق پر بھی یہی شبہ ہے کہ وہ جاپانیوں کا جاسوس ہے لیکن ابھی کوئی پکا ثبوت نہیں مل رہا تھا۔
بہرحال یہ شخص بہت ہی بُری شہرت کا آدمی تھا۔

ان تین معززین میں سے ایک نے تو مجھ کو بہت ہی کارآمد باتیں بتائیں۔ اس نے بتایا کہ ایک روز وہ انوار کے گھر والی گلی میں داخل ہُوا تو اس نے دیکھا کہ ایک آدمی انوار کے دروازے پر لگے ہوئے لیٹر بکس میں کچھ ڈال کر وہاں سے ہٹ رہا تھا۔ دوسری طرف سے مسجد کے مولوی صاحب آ رہے تھے۔ یہ شخص اس طرف سے جانے کی بجائے میری طرف آیا۔ اس کو شاید معلوم تھا کہ میں اُس کو نہیں جانتا۔ میں اس کو جانتا تھا۔ وہ اشتیاق کے گھر کا نوکر تھا۔

اس معزز شخص نے آگے یہ بات یوں سنائی کہ یہ آدمی اس کے پاس سے گزر گیا اور جب یہ معزز شخص آگے گیا تو مولوی صاحب کے ساتھ ہاتھ ملانے کے واسطے رک گیا۔ اس نے مولوی صاحب کو بتایا کہ اس شریف گھرانے کے ساتھ شاید کوئی بدمعاشی ہو رہی ہے، ابھی اشتیاق احمد کا ایک نوکر ان کے لیٹر بکس میں کوئی کاغذ ڈال گیا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ انہوں نے بھی دیکھا۔ کچھ دنوں بعد اس معزز آدمی کو پتہ لگا کہ انوار کے گھر میں کچھ ناچاقی ہوگئی ہے۔

اس کے ساتھ ہی نزہت کی بدنامی کی باتیں بہت زیادہ پھیل گئی تھیں اور یہ بات بھی سنی سنائی جانے لگی کہ عبدالستار نزہت کے نام رقعے بھیجتا ہے۔ میں ساری بات سمجھ گیا۔ ہو یہ رہا تھا کہ کوئی آدمی گھر کے لیٹر بکس میں رقعہ پھینک جاتا تھا اور پھر اس ساری آبادی میں یہ افواہ پھیلائی جاتی تھی کہ عبدالستار نزہت کے نام رقعے بھیجتا ہے۔ اس معزز شخص سے میں نے پوچھا کہ کتنے بجے ہوں گے جب اس نے رقعہ لیٹر بکس میں ڈالا تھا؟ مجھ کو جواب ملا کہ ساڑھے تین تو یقیناً بج چکے تھے۔ اب تو ساری بات ہی صاف ہوگئی۔ مجھ کو پہلے ہی یقین تھا کہ رقعہ اُس وقت پھینکا جاتا ہے جب انوار کے گھر آنے کا وقت ہوتا ہے۔

نوکر نے راز دے دیا

اگلے روز میرے تھانے میں تین افراد میری طلبی پر پہنچے ہوئے تھے۔ ایک تو زینو تھی، دسرا اشتیاق کے گھر کا نوکر تھا اور تیسرا وہ معزز آدمی تھا جس نے اس نوکر کو لیٹر بکس میں کچھ ڈالتے دیکھا تھا۔ اس کو میں نے اس نوکر کی شناخت کے واسطے بلایا تھا۔ اس نے نوکر کو دیکھ کر مجھ کو الگ ہو کر بتایا کہ یہی تھا۔ میں نے اس معزز صاحب کو بھیج دیا۔ اس کی اب

ضرورت نہیں تھی۔ میں نے سب سے پہلے نوکر کو دفتر میں اپنے سامنے بٹھایا اور اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''تم اس گھر کے نوکر ہو'' —— میں نے اس کو کہا —— ''تھوڑے سے لالچ کے پیچھے تمہارے مالک تم سے غلط کام کرواتے رہے ہیں۔ اب تم پھنس گئے ہو تو وہ تم کو پھانسی کے تختے تک پہنچائیں گے اور خود بے گناہ بن جائیں گے۔ بچنا ہے تو جو میں پوچھوں سچ بتا دو ...... کیا تینوں رقعے تم نے انوار کے گھر کے لیٹر بکس میں ڈالے تھے؟''

''کون سے رقعے جناب؟'' —— اس نے بڑی معصومیت سے اور حیرت سے پوچھا جیسے میں نے اس پر بالکل ہی بے بنیاد الزام لگایا ہو۔

''وہ رقعے جو تم کو دیئے جاتے تھے'' —— میں نے کہا —— ''اور کہا جاتا تھا کہ انوار کے لیٹر بکس میں ڈال کر غائب ہو جانا''۔

اس نے پھر حیرت زدگی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے انکار کر دیا۔ میں نے اسے کرسی سے اٹھایا اور کہا کہ فرش پر پیٹھ کے بل لیٹ جائے۔ وہ میرے منہ کی طرف دیکھتا ہوا فرش پر لیٹ گیا۔ میں نے اس کے دونوں بازو پیچھے کی طرف کر لئے اور ہتھیلیاں اوپر کی طرف رکھیں۔ میں نے کرسی اٹھائی اور اس کا ایک پایا اس کی ایک ہتھیلی پر اور دوسرا پایا دوسری ہتھیلی پر رکھا اور میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے دنوں پاؤں اس کے کندھوں پر رکھ دیئے۔ وہ تو پانی سے نکال کر باہر پھینکی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اُس نے چیخ و پکار کی تو میں نے چھڑی اُس کے منہ پر مار کر کہا، خبردار، منہ سے آواز نہ نکلے۔ اس کے منہ سے صرف سچ نکلے۔

اس کے ہاتھوں کی الٹی اطراف فرش پر تھیں اور ہتھیلیوں پر کرسی کے پائے تھے اور کرسی پر میرا پورا وزن تھا۔ اپنا ہاتھ دیکھ لیں۔ وہاں ہڈیوں پر گوشت نہیں بلکہ صرف کھال ہوتی ہے۔ اتنا وزن پڑنے سے ہاتھ کی ہڈیاں ٹوٹتی محسوس ہوتی ہیں اور اتنا درد ہوتا ہے جو برداشت نہیں ہو سکتا۔ عادی جرائم پیشہ لوگ جو تشدد کے بھی عادی ہوتے ہیں، اس اذیت کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتے۔

میں ایذا رسانی کو پسند نہیں کیا کرتا تھا۔ اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے سراغ لگانے اور اقبالِ جرم کروانے کی عقل دی ہوئی تھی لیکن اس شخص کو ایذا رسانی کی چکی میں اس وجہ سے ڈال دیا تھا کہ مجھ کو یقین ہو گیا تھا کہ اس شخص نے جو حرکت کی ہے اس سے انکاری ہو رہا ہے۔ اصل ملزم کو پکڑنے کا انحصار صرف اس شخص کے اقبالی بیان پر تھا۔ اس کی زبان سے

ہر قیمت پر مجھ کو سچ اگلوانا تھا...... وہ تڑپ رہا تھا اور میں تھوڑی دیر بعد کرسی سے ذرا سا اٹھ کر زور سے بیٹھتا تھا جس سے اس کو بہت ہی تکلیف ہوتی تھی۔ میں اس کو کچھ نہ کچھ کہتا بھی جا رہا تھا، مثلاً یہ کہ تمہارے مالک تم کو بچا نہیں سکیں گے نہ ان کو تمہاری پرواہ ہے۔ وہ تو کہہ دیں گے کہ ہم اس کو جانتے ہی نہیں اور اسی سے پوچھو کہ یہ کیا کرتا رہا ہے۔ اس طرح میں اس کو دھمکیاں بھی دیتا رہا اور ویسے بھی بولنے پر اکساتا رہا اور اس ایذا رسانی میں ذرا سی بھی نرمی نہ آنے دی۔

وہ عادی مجرم تو تھا نہیں کہ برداشت کر لیتا، ایک گھر کا غریب سا نوکر تھا اور مالکوں کو خوش کرنے کے واسطے ان کے جرم میں ان کا حکم مان رہا تھا اور وہ اس کو چند روپے فالتو دے دیتے ہوں گے۔ دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ بول پڑا۔ میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہُوا، اس کو اٹھایا اور کرسی پر بٹھا دیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بغلوں میں دے لئے اور اس کے منہ سے کربناک آوازیں نکل رہی تھیں۔

نوکر نے بتایا کہ اشتیاق احمد کے بیٹے محمود نے تین بار اس کو رقعہ دے کر کہا تھا کہ انوار کے گھر کے لیٹر بکس میں ڈال دینا۔ پہلی بار محمود کا ایک دوست اس کے ساتھ گیا تھا اور گلی کی نکڑ پر کھڑا رہا اور نوکر کو گھر دکھایا تھا۔ تینوں بار رقعے ساڑھے تین بجے کے لگ بھگ ڈالے گئے تھے۔ نوکر کو یہ معلوم نہیں کہ یہ رقعے لکھتا کون ہے۔

میں نے نوکر سے پوچھا کہ محمود کے ساتھ اس کام میں اور کتنے دوست شامل تھے۔ اس نے بتایا تین اور تھے اور ہر بار جب نوکر کو رقعہ دیا جاتا تو یہ تینوں محمود کے گھر موجود ہوتے تھے...... میں نوکر کا سارا بیان نہیں سنا رہا۔ ضروری اور اہم باتیں تحریر کر رہا ہوں۔ اس کے بیان کے بعد میں نے اس پر بہت جرح کی اور ذرا ذرا سی بات کرید کرید کر پوچھی تھی۔ ایک بات یہ بھی سامنے آئی کہ یہ دوست محمود کے گھر میں بیٹھک میں بیٹھا کرتے تھے جس کو آپ ڈرائنگ روم بھی کہہ سکتے ہیں۔ میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے نوکر نے بتایا کہ اس کو جب محمود اس کمرے میں بلاتا تھا تو اس کے سامنے لمبی تپائی پر رائٹنگ پیڈ اور پن رکھا ہُوا ہوتا تھا۔ نوکر سے میں نے ایک بات یہ بھی کہلوائی کہ تیسری بار جب اس کو کمرے میں بلایا گیا تو محمود نے اس کو کہا کہ آج پھر وہاں جاؤ اور پہلے کی طرح اسی لیٹر بکس میں رقعہ ڈال آنا لیکن پہلے یہ دیکھ لینا کہ گلی میں تم کو کوئی دیکھ نہ لے۔

پھر اس نے میرے ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس تیسری مرتبہ وہ

محمود کے بلانے پر کمرے میں گیا تو رقعہ ابھی انہوں نے تہہ نہیں کیا تھا بلکہ محمود کا ایک دوست رقعہ پڑھ رہا تھا اور اُسی نے رقعے کو تہہ کیا اور ہنستے ہوئے نوکر کو دیا تھا...... میں نے نوکر سے پوچھا کہ اس نے یہ رقعے راستے میں کبھی پڑھے تھے؟ اس نے کہا کہ وہ بالکل اَن پڑھ ہے۔ اُس کو تو پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ کیسے رقعے ہیں اور یہ غلط حرکت ہے۔ وہ تو یہ سمجھتا رہا کہ انوار کا دوست ہے اور اس کو کوئی پیغام بھیج رہے ہیں۔

"لیکن اس بار تم کو دو آدمیوں نے دیکھ لیا تھا"— میں نے کہا۔

"ہاں صاحب!"— نوکر نے کہا— "دو آدمیوں نے مجھے دیکھا تھا۔ ایک تو مولوی صاحب تھے اور دوسرے چوہدری حمید صاحب تھے لیکن میں یہ تو جانتا ہی نہیں تھا کہ مجھ سے کوئی قابلِ اعتراض کام کروایا جا رہا ہے"۔

میں نے اس کو قتل کی رات یاد کروا کے پوچھا کہ شام کے بہت بعد تینوں دوست محمود کے پاس آئے ہوں گے، کیا اس نے ان کو آتے اور محمود کو ساتھ لے جاتے دیکھا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ یہ لوگ تو روزانہ ہی اکٹھے ہوتے اور پھر گھر میں ہی بیٹھ جاتے یا کہیں باہر نکل جاتے تھے۔ اس واسطے وہ ٹھیک طرح نہیں بتا سکتا کہ اس شام یہ گھر میں اکٹھے ہوئے تھے یا نہیں۔ نوکر رات کو باورچی خانے کا کام ختم کر کے اپنے کمرے میں چلا جایا کرتا تھا۔

نوکر ان تینوں دوستوں کے گھر جانتا تھا۔ میں نے اس سے ان تینوں کے نام اور ایڈریس پوچھ لئے۔ محمود کا باپ، اشتیاق احمد تو اس علاقے کا مشہور آدمی تھا، میرے تھانے کے کئی آدمی اس کا گھر جانتے تھے۔ نوکر کو میں نے اے ایس آئی کے حوالے کر دیا اور اس کو یہ تین نام اور ایڈریس دے کر کہا کہ ان تینوں گھروں میں ایک ایک کانسٹیبل بھیج کر ان اشخاص کو تھانے بلوا لے۔ پھر اس کو یہ بھی کہا کہ اشتیاق احمد کے بیٹے محمود کو بھی تھانے بلوائے اور اس کے واسطے ہیڈ کانسٹیبل کو بھیجے۔

ولایتی قلم، دیسی قتل

زینو بھی تھانے میں آئی ہوئی تھی۔ میں نوکر کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ مصروف رہا۔ اس سے فارغ ہو کر بھی زینو کو نہ بلایا۔ میں اس کو پریشان کرنا چاہتا تھا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا کہ ایک ایسی واردات کے ملزموں کا سراغ مل گیا تھا جس کی بابت میں فکر مند تھا

کہ اس کا سراغ مشکل سے ہی ملے گا۔ میں نے اُس وقت تک جو تفتیش کی تھی، اس کو مقدمہ کے لکھنے بیٹھ گیا اور موٹے موٹے پوائنٹ لکھتا رہا تا کہ مقدمہ تیار کرتے وقت کوئی ضروری بات نہ رہ جائے۔ شہادت بھی اکٹھی کرنی تھی۔ میں اس پہلو پر بھی غور کر رہا تھا۔

دو گھنٹے گزر گئے تھے جب یہ چاروں تھانے پہنچے تھے۔ مجھ کو اطلاع دی گئی تو میں نکلا۔ چاروں کو بڑی غور سے دیکھا۔ محمود تو لگتا ہی امیر زادہ تھا۔ اس کے دو دوست تقریباً اسی کی حیثیت کے معلوم ہوتے تھے۔ میں ان کے لباس اور جوتیوں سے اندازہ کر رہا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا اس لئے انہوں نے سویٹر اور کوٹ پہن رکھے تھے۔ ایک نے اچکن پہنی ہوئی تھی جو خاصی پرانی اور میلی سی لگتی تھی اور سائز میں بھی کچھ بڑی تھی۔ چوتھا دوست نہایت معمولی کپڑوں میں تھا۔ اچکن والا اور یہ معمولی لباس والا یقیناً محمود کی حیثیت سے خاصے نیچے درجے کے تھے۔ ان کی عمریں بائیس اور چوبیس سال تک ہوں گی۔ میں نے معمولی کپڑوں والے نوجوان کو بازو سے پکڑا اور اپنے دفتر میں لے جا کر بٹھالیا۔ سب سے پہلے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک پرائیویٹ فرم میں کلرک ہے۔ اپنے باپ کی بابت بتایا کہ وہ ایک سرکاری محکمے میں اکاؤنٹینٹ ہے۔

''سچ بولو گے یا پہلے تمہیں سچ بولنے کے واسطے تیار کروں؟''—— میں نے کہا۔ ''جواب دینے سے پہلے یہ سوچ لو کہ جب تم سچ بولنے کے واسطے تیار ہو چکے ہو گے اس وقت تک تمہاری سر سے پاؤں تک کی ہڈیاں شدید طور پر درد کر رہی ہوں گی اور بڑی مشکل سے تمہارے منہ سے بات نکلے گی...... بولو، کیا کہتے ہو؟''

''آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''—— اس نے ذرا ہکلاتے ہوئے پوچھا اور کہا۔ ''میں سچ بولنے کی ہی کوشش کروں گا لیکن بات کیا ہے؟''

''تم جانتے ہو بات کیا ہے''—— میں نے کہا—— ''اگر میرے ساتھ کھیلنے کی کوشش کرو گے تو ان امیرزادوں کی دوستی تم کو بہت مہنگی پڑے گی۔ تمہارے گھر میں ماتم ہو گا...... میری مانو اور زبان پر سچ لے آؤ...... انوار کو تم چاروں اتنی دور ریلوے لائن تک کس طرح لے گئے تھے؟ اس کو کیا جھانسہ دیا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ چل پڑا تھا؟''

اس کی حالت بالکل ویسی ہو گئی جیسا یہ مشہور محاورہ ہے کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ مجھ کو تو ڈر لگا کہ یہ ابھی بے ہوش ہو جائے گا۔ اس میں تو انکار کی بھی ہمت نہیں تھی۔

''صرف میں ہوں جو تمہاری مدد کر سکتا ہوں''—— میں نے کہا—— ''انکار کر

کر دو۔ یہ سوچ کر انکار کرنا کہ میں تم کو اب واپس گھر نہیں جانے دوں گا۔ تم کو کانسٹیبلوں کے حوالے کر دوں گا۔ جب تمہارا دماغ درست ہو جائے گا تو وہ تم کو میرے پاس لے آئیں گے''۔

نوجوانی کا لااُبالی پن اور خطرے مول لے کر لطف اندوز ہونا اور اپنے آپ کو خود ہی ہیرو سمجھ لینا ایک الگ بات ہے لیکن تھانے میں ایک تھانیدار کا سامنا کرنا بڑی ہی مختلف اور خطرناک بات ہے۔ اس نوجوان کا پالا پہلی بار پولیس سے پڑا تھا اور مجھ کو صاف پتہ لگ رہا تھا کہ یہ ابھی ہوش وحواس کھو بیٹھے گا یا میرے پاؤں میں بیٹھا ہُوا ہو گا۔ ایسے مشتبہ یا ملزم سے اقبالی بیان لینا میرے واسطے ذرا سا بھی مشکل نہیں تھا۔ مجھ کو تشدد کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ زبان کا جادو ہی کام کر گیا اور اس نوجوان نے پوری واردات سنا ڈالی۔ یہ تینوں محمود کے دوست تھے اور محمود ان کو کھلاتا پلاتا رہتا تھا۔ محمود کے باپ کی ایک تو تنخواہ تھی اور باقی حرام کی آمدنی بہت تھی۔ محمود اکلوتا بیٹا تھا اس واسطے اس کی جیبیں پیسوں سے بھری رہتی تھیں۔

یہ تو پہلے سنا دیا ہے کہ محمود کو نزہت اور انوار کے ساتھ کیا دشمنی تھی۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ انوار کے لیٹر بکس میں رقعے کیوں ڈالے جاتے تھے۔ رقعے محمود لکھتا تھا، تینوں دوست پڑھتے تھے اور پھر نوکر کے ہاتھ رقعے لیٹر بکس میں ڈالنے کے واسطے بھیجتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی محمود کے یہ تینوں دوست نزہت کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہتے تھے اور کہتے تھے کہ ستار کے ساتھ نزہت کے ناجائز تعلقات ہیں اور ستار نزہت کو رقعے بھیجتا ہے۔ یہ پروپیگنڈا گھروں تک پہنچانے کا کام زینو کرتی تھی۔ زینو کو محمود بہت پیسے دیتا تھا۔

ان کو معلوم نہیں تھا کہ انوار نے طلاق تک نوبت پہنچا دی تھی لیکن ستار کے ساتھ انوار کی بات ہوئی تو ستار نے تیسرے رقعے کے بعد انوار کے شکوک رفع کر دیئے تھے جس کے نتیجے میں انواز اور نزہت کے درمیان ناچاقی ختم ہو گئی اور وہ پیار اور محبت سے رہنے لگے تھے۔

محمود اور اس کے دوستوں نے دیکھا کہ رقعوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تو محمود نے ایک روز انوار کو راستے سے ہٹانے کا یہ منصوبہ سوچا کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ چاروں دوست قتل کے ایسے طریقے سوچنے لگے کہ ان کا سراغ نہ ملے اور یہ زندہ اور سلامت رہیں۔ انہی دنوں انہوں نے ایک انگریزی پکچر دیکھی جس میں ایک عورت اپنے آشنا کی خاطر اپنے

خاوند مروانا چاہتی ہے۔اس کا آشنا اس کو کہتا ہے کہ خاوند کو سیر کے بہانے رات کے وقت ریلوے لائن تک لے آنا۔عورت اپنے خاوند کو پیار اور محبت کا جھانسہ دے کر ریلوے لائن تک لے جاتی ہے اور آشنا وہاں اس طرح آ پہنچتا ہے جیسے اتفاق سے اس جگہ سے گزر رہا ہو۔اتنے میں ریل گاڑی آتی ہے اور دونوں خاوند کو دھکہ دے کر لائن پر پھینک دیتے ہیں اور خاوند بُری طرح کٹ جاتا ہے۔

محمود نے اپنے دوستوں سے کہا کہ یہ طریقہ محفوظ ہے اور آسان بھی۔انہوں نے انوار کو ریلوے لائن تک لے جانے کا بڑا اچھا طریقہ سوچ لیا۔اُن دنوں نزہت اپنے ماں باپ کے گھر گئی ہوئی تھی اور وہ کسی ناراضگی کی وجہ سے نہیں بلکہ انوار کی اجازت سے گئی تھی۔یہ بات انہیں زینو نے بتائی تھی۔ان چاروں نے جو منصوبہ بنایا اس پر انہوں نے اس طرح عمل کیا کہ ایک شام ان چاروں میں سے ایک انوار کے گھر گیا اور اس کو باہر بلایا۔

انوار باہر نکلا تو اس نوجوان نے اس کو کہا کہ یار، تم ناراض نہ ہونا، تمہارے ہی بھلے بُرے کی بات ہے۔اس نے کہا کہ تم اپنی بیوی پر اعتبار کرتے ہو، اگر بیوی کی اصلیت دیکھنی ہے تو میرے ساتھ چلو، میں تم کو بتاؤں گا کہ تھوڑی دیر بعد وہ کہاں ہوگی۔وہ اس وقت اپنے ماں باپ کے گھر میں نہیں۔

میں یہ وقوعہ مختصر کر کے سنا رہا ہوں۔ظاہر ہے کہ انوار اتنی جلدی تو اس کے ساتھ جانے کے واسطے تیار نہیں ہُوا ہوگا اور اس نے اس شخص کی بات مانی ہی نہیں ہوگی لیکن اس شخص نے اس کو ایسا مشتعل کیا کہ وہ ساتھ چل پڑا۔اصل میں بات یہ ہے کہ جس طرح کسی کی موت لکھی ہوئی ہو اس کے اسباب اللہ بنا ہی دیتا ہے، انسان تو کچھ بھی نہیں۔موت نے انوار کو عقل کا اندھا کر دیا اور وہ بھڑکا ہُوا اس شخص کے ساتھ چل پڑا۔

ریلوے لائن تک یہی ایک لڑکا اس کے ساتھ رہا اور جونہی وہ وہاں پہنچے تو محمود دوسرے دو دوستوں کے ساتھ وہاں آ پہنچا۔ان کو معلوم تھا کہ اس وقت ایک گاڑی آتی ہے۔گاڑیوں کی تو وہاں کوئی کمی نہیں تھی۔گاڑیاں آتی جاتی ہی رہتی تھیں۔ایک پسنجر ٹرین آتی نظر آئی تو یہ چاروں انوار کے اردگرد ہو گئے۔تب انوار کو کچھ شک ہوا لیکن اب نکل بھاگنے کا یا ان چاروں سے نمٹنے کا کوئی وقت نہیں رہ گیا تھا۔انجن نے وسل دی اور فوراً ہی انجن قریب آ گیا۔انہوں نے انوار کو لائن کی طرف ذرا گھسیٹا اور پھر دھکہ دیا لیکن وہ لائن پر گرنے سے پہلے ہی انجن کے سامنے بائیں کونے سے ٹکرایا اور لائن سے دور جا پڑا۔یہ

جوان خودکشی والا خط انوار کی جیب میں ڈال کر وہاں سے واپس آ گئے۔

میں نے باقی تینوں سے بھی اقبالی بیان لے لیا لیکن مجھ کو کچھ مشکل پیش آئی تو ود کے ساتھ آئی۔وہ بار بار اپنے باپ کا نام لیتا تھا جیسے میں اس کے باپ سے ڈر جاؤں یا مرعوب ہوں گا۔اُس نے رشوت بھی پیش کی لیکن مجھ کو اب اس کے بیان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔آخر اس نے بیان دے دیا۔

میں نے ان دو مخبروں کو بھی بلوا لیا اور حوالات میں بند کر دیا۔انہوں نے مجھ کو جھوٹی پورٹ دی تھی اور محمود سے رقم وصول کی تھی۔ابھی تو زینو کو بھی حراست میں لینا تھا۔اس ے بھی میرے آگے جھوٹ بولے تھے اور نزہت کو بدکار ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ۔ان چاروں سے بیان لیتے لیتے رات ہو گئی تھی لیکن میں یہ رات بھی جاگنے کو تیار تھا ونکہ لوہا لال سرخ تھا اور اس کو فوراً اپنی پسند کی شکل میں ڈھالنا تھا۔چاروں ملزموں کو لات میں بند کر دیا گیا۔

زینو نے دیکھا کہ میں اب اندر اکیلا ہوں تو وہ بن بلائے اندر آ گئی۔وہ صبح سے آئی ی تھی اور میں دانستہ اسے نہیں بلا رہا تھا۔وہ آئی تو میرے آگے رو پڑی۔کہنے لگی کہ اس تین چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور خاوند بدھو سا آدمی ہے، بچے رو رہے ہوں گے اس میں اسے گھر جانے دوں۔

"زینو!" — میں نے کہا — "وہ جو قتل ہو گیا ہے، کسی ماں کا ہی بچہ تھا۔کیا تم نہیں تی تھیں کہ دو تین مہینوں بعد نزہت بھی بچے والی ہو جائے گی۔اس ہونے والی ماں کا درد کیوں نہ ہُوا؟ تم اس کو طلاق دلوانا چاہتی تھیں۔میں ابھی تم کو تھانے میں رکھوں گا اور وقت تمہاری بات سنوں گا جب تم سچ بولنے پر آ جاؤ گی۔یہ دیکھا تم نے؟ سب کو لات میں بند کر دیا ہے۔کیا اب بھی اسی طرح جھوٹ بولو گی جس طرح پہلے بول گئی ں؟"

وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"سچ سنو گے؟" — زینو نے بڑی جرأت مندی سے جاندار آواز میں کہا — "میں پہلے آپ کے پاس آ کر جھوٹ بولا تھا اور جن کی خاطر جھوٹ بولا تھا، ان سے منہ گے پیسے وصول کئے تھے۔یہ میرا پیشہ ہے۔کیا آپ ان معززین کو گرفتار کر لیں گے جو مجھ اپنی بے نکاحی بیوی سمجھتے ہیں؟ محمود کا باپ اشتیاق احمد بڑا امیر آدمی ہے۔اس کی بیوی

بھی ہے لیکن بالکل سیدھی اور بدھو۔ یہ شخص جب دِلّی سے یہاں چھٹی آتا ہے تو ج
داشتہ بنالیتا ہے۔ یہ میرا ذریعہ معاش ہے۔ جس معزز آدمی نے آپ کو اطلاع دی
رقعے محمود بھجیا کرتا ہے، اس کو میرے سامنے بٹھاؤ، اس نے بھی میرے ساتھ آشنائی
ہے اور جب اس کو میری ضرورت ہوتی ہے تو مجھ کو بلالیتا ہے۔ اشتیاق احمد سے اور
بیٹے محمود سے مجھ کو پیسے ملتے تھے اور میں اس کے عوض ہر گناہ کرتی تھی۔ میں نے پہ
جھوٹ بولا کہ میں نزہت اور ستار کے پیغام ایک دوسرے کو پہنچاتی تھی۔ یہ جھوٹ
باقی جو کچھ بھی کہا وہ بھی جھوٹ تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں گھر گھر جا کر نزہت او
بدنام کرتی تھی اور اس کی اُجرت وصول کرتی تھی''۔

وہ تو بولتی ہی چلی جارہی تھی اور اس کی باتیں میرا سینہ چیر رہی تھیں لیکن میں
تھا اور میں صرف اُس شخص کو چور کہہ سکتا تھا جو پکڑا جاتا۔

چونکہ ملزم خاصے زیادہ ہوگئے تھے اور محمود کے باپ کے پاس دولت بہت زیا
جس سے وہ بہت ہی قابل وکیل کرسکتا تھا۔ اس واسطے مجھ کو خطرہ نظر آنے لگا کہ میرا
سیشن میں جا کر ناکام نہ ہو جائے۔ ملزم اپنے بیانات سے منحرف بھی ہوسکتے تھے۔
اس کا یہ بندوبست کیا کہ جس نوجوان نے سب سے پہلے اقبالِ جرم کیا تھا اس
معاف گواہ بنالیا۔ زینو اور نوکر کو میں نے اس وعدے پر مقدمے سے نکال دیا کہ
ہوں گے اور میں جس طرح کہوں گا اسی طرح بیان دیں گے۔ میں نے ان کو
انہوں نے گواہی میں گڑبڑ کی تو وہیں گرفتار کرلوں گا۔

مقدمہ ایک سال چلا اور آخر محمود اور اس کے دو دوستوں کو عمر قید کی سزا
گئی۔ وعدہ معاف گواہ سزا سے بچ گیا اور دونوں مخبروں کو غلط رپورٹ دینے کی پا
اور ایک اور دفعہ کے تحت دو دو سال سزائے قید دی گئی۔ سب کی اپیلیں ہائیکو
نامنظور کرکے سزائیں بحال رکھی تھیں۔

* * *

سوکنیں، سالا اور سٹینو

قتل کی یہ جو واردات آپ کو سنانے لگا ہوں، اس کی تفتیش میں نے کی تھی۔ ایک بات پہلے ہی سن لیں۔ یہ تفتیشی کہانی کوئی ایسی خاص نہیں کہ اس کی یا میری قابلیت کی آپ تعریف کریں۔ آپ پوچھیں گے یہ کیا بات ہوئی تو میں آپ کو یہ جواب دوں گا کہ اس میں آپ کو ایک خاص بات ملے گی۔ ملزموں کی سراغرسانی میں مجھ کو ایک ایسا اشارہ ملا تھا جو ہر کسی کو نہیں ملا کرتا اور یہی اس کہانی کی دلچسپی کا باعث ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس قصبے کی یہ واردات ہے، وہ بعد میں پاکستان میں آ گیا تھا۔ اس واسطے میں اس قصبے کا یا کسی شہر کا یا کسی شخص یا عورت کا صحیح نام نہیں لکھوں گا۔ وجہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔

رات کے شاید اڑھائی بج گئے تھے جب مجھ کو ایک کانسٹیبل نے گھر آ کر جگایا اور اطلاع دی کہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر کا سٹینوگرافر ملک انوار کوٹھے کے اوپر سے گلی میں گر کر مر گیا ہے اور یہ ابھی پتہ نہیں کہ وہ خود گرا ہے یا گرایا گیا ہے۔ میں نے کانسٹیبل سے پوچھا کہ رپورٹ کرنے کون آیا ہے۔ کانسٹیبل نے بتایا دو بزرگ سے آدمی آئے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ملک انوار کو کوٹھے سے گرایا گیا ہے۔

وہ انگریزوں کی حکومت کا زمانہ تھا۔ حکم بہت ہی سخت تھا کہ کوئی تھانیدار معمولی سی واردات کی رپورٹ کو بھی ٹال نہیں سکتا تھا۔ رپورٹ فوراً سننی پڑتی تھی اور کارروائی بھی فوراً ہی کرنی پڑتی تھی۔ ایک تو اس وجہ سے میں فوراً تھانے جانے کے واسطے تیار ہو گیا اور دوسری وجہ فوراً تیار ہونے کی یہ تھی کہ ملک انوار کو میں بہت اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے ساتھ میری سلام دعا بھی تھی۔ وہ چونکہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں سٹینوگرافر تھا اس واسطے میں نے اُس کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات بنائے ہوئے تھے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم تھا کہ سات آٹھ مہینے پہلے اُس نے دوسری شادی کی تھی۔ اُس کی عمر چالیس سال سے ایک آدھا سال کم یا زیادہ تھی۔ اُس کی پہلی بیوی ابھی زندہ اور سلامت تھی لیکن اس بیوی سے ایک بھی بچہ

پیدا نہ ہُوا تو اُس نے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ اولاد کی امید پر شادی کر لی تھی۔ سوچتا ہُوا تھانے پہنچا کہ ملک انوار کو اگر کوٹھے سے گرایا گیا ہے تو یہ واردات پہلی بیوی نے کروائی ہوگی۔ پہلی بیوی نے اس واسطے کروائی ہوگی کہ اتنا عرصہ اکٹھے گز... کے بعد ملک انوار ایک نوجوان بیوی لے آیا تھا اور اگر یہ واردات نئی بیوی نے کروا... تو اس واسطے کروائی ہوگی کہ چالیس سال عمر کے اس آدمی نے اس کو نوعمری میں اپنا... لیا تھا۔ یہ لڑکی اُس سے آزاد ہونا چاہتی ہوگی۔

میں تھانے گیا تو میرے دفتر میں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ تعارف ہُوا تو پتہ... ایک آدمی پہلی بیوی کا بڑا بھائی ہے اور دوسرا دوسری بیوی کا باپ ہے۔ یہ سب اُس قصبے کے رہنے والے تھے۔ ان کے محلے الگ الگ تھے۔ ملک انوار الگ محلے میں مکان میں رہتا تھا۔ میں یہیں پر یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ ڈپٹی کمشنر کا آفس ضلعے کے شہر میں قصبے سے صرف اٹھارہ میل دُور تھا۔ ملک انوار علی الصبح ریل گاڑی پر اس شہر کو جاتا... شام سے پہلے بس پر واپس آ جاتا تھا۔

انہوں نے واردات اس طرح سنائی کہ تھوڑی دیر پہلے ان کو اطلاع ملی کہ ملک... کوٹھے سے گر پڑا ہے اور مر گیا ہے۔ یہ دونوں اور ان کے گھروں کے دوسرے... دوڑے دوڑے وہاں گئے تو وہاں ساتھ والی گلی میں لوگوں کا مجمع دیکھا۔ بات یہ ہوئی... یہ دونوں عورتیں نیچے کمروں میں سوئی ہوئی تھیں۔ ملک انوار نئی بیوی کے کمرے میں تھا۔ بیوی کی آنکھ کھلی تو اُس کو اس طرح آوازیں سنائی دیں جیسے چھت پر کوئی چل رہا ہے۔ کل تو لوگ مکان بنواتے ہیں تو چھتیں لینٹر کی بنتی ہیں۔ ان چھتوں پر کوئی تیز چلے... ناچے کودے تو نیچے والوں کو ذرا ذرا آواز آتی ہے۔ اُس زمانے میں چھتیں اس طرح تھیں کہ نیچے لکڑی ہوتی اور اس کے اوپر مٹی ڈالی جاتی اور اس کے اوپر لپائی ہوتی تھی۔ چھتیں آج بھی موجود ہیں۔ ان پر کوئی آہستہ آہستہ چلے تو بھی نیچے والوں کو پتہ چل... ہے۔ ملک انوار کے مکان کی ساری چھتیں لکڑی اور مٹی والی تھیں۔

رات کی خاموشی میں بڑی ہلکی سی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ نئی بیوی نے ملک... جگا کر بتایا کہ اوپر کوئی آدمی چل رہا ہے۔ ملک انوار نے کان کھڑے کئے تو اس... قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ اسی وقت اٹھا اور چھت پر چلا گیا۔ نئی بیوی نے پرانی... بھی جگا دیا۔

دونوں بیویاں ڈرتی رہیں اور کمرے میں ہی بیٹھی رہیں۔ انہوں نے چھت پر اس طرح کی دھمک اور دھپ دھپ سنی جیسے چھت پر دو آدمی لڑائی یا کشتی کر رہے ہوں۔ پھر چھت پر بالکل ہی خاموشی ہوگئی۔ ایک دو منٹ بعد دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک سنائی دی اور پھر خاموشی ہوگئی۔ دونوں بیویوں نے تھوڑی دیر انتظار کیا کہ ملک انوار نیچے آ جائے گا لیکن وہ نہ آیا۔ ان بیویوں نے یہ ہمت کی کہ اوپر چلی گئیں لیکن ملک انوار چھت پر نہیں تھا۔

چاندنی اتنی صاف تھی کہ ہر چیز ٹھیک ٹھاک نظر آتی تھی۔ دونوں بیویوں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن ان کو اپنا خاوند نظر نہ آیا۔ مکان کے ایک پہلو پر پکی گلی تھی۔ اُدھر فصیل بھی تھی۔ انہوں نے ویسے ہی فصیل کے اوپر سے نیچے دیکھا تو ان کو اپنا خاوند گلی میں پڑا ہُوا نظر آیا۔ دونوں نے شور شرابہ کیا تو محلے کے لوگ پہنچ گئے۔ انہوں نے پیچھے جا کر دیکھا تو یہ خبر سنائی کہ ملک انوار مر گیا ہے۔

دونوں بیویوں نے اپنے اپنے گھروں کو اطلاع بھجوائی تو وہ سب لوگ آ گئے۔ یہ دونوں اشخاص جو رپورٹ کرنے آئے تھے ملک انوار کی لاش دیکھ آئے تھے۔ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ملک انوار مر گیا ہے۔ پھر یہ دونوں میرے پاس آ گئے۔

نوجوان بیوی کے کمرے میں

میں نے بڑی جلدی جلدی جملہ کاغذی کارروائی مکمل کی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل بمعہ دو کانسٹیبل ساتھ لے کر چل پڑا۔ متعلقہ گھر دُور نہیں تھا، میں دس منٹ میں وہاں پہنچ گیا اور سب سے پہلے گلی میں جا کر لاش کو دیکھا۔ ہمارے پاس بڑے سائز کی دو ٹارچیں تھیں۔ لاش ٹیڑھی میڑھی سی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس کو سیدھا کیا تو سب سے پہلے میری نگاہ اُس کے چہرے پر گئی۔ ماتھے پر جہاں سے بال شروع ہوتے ہیں، وہاں سے جلد پھٹی ہوئی تھی۔ میں نے بال ہٹا کر دیکھا تو بالوں کے نیچے بھی جلد پھٹی ہوئی تھی اور مجھ کو یہ بھی شک ہُوا کہ کھوپڑی کریک ہوگئی ہوگی۔ یہ زخم تین انچ یا اس سے سوتر دو سوتر لمبا ہوگا۔ لاش کا نظری معائنہ کیا تو دائیں ہاتھ کے اُلٹی طرف خراش کی طرح کا ایک زخم تھا۔ یہ بھی اس طرح تھا کہ جلد کٹ گئی تھی۔ اُس نے پاجامہ اور قمیض پہنی ہوئی تھی۔ کپڑے ہٹا کر لاش کا

جسم دیکھا۔ کہیں اور زخم نہیں تھا۔

سب سے پہلی چیز تو میں نے یہ دیکھی کہ سر کے زخم سے اور ہاتھ کے زخم سے بھی خون کا ایک قطرہ بھی نہیں نکلا تھا اور دونوں زخموں میں ذرا ذرا سی نمی تھی۔ تھانیدار یا پولیس کا کوئی کانسٹیبل ہی کیوں نہ ہو اور وہ دماغ کا کمزور ہی ہو، وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اس شخص کو پہلے کسی طرح قتل کیا گیا ہے اور لاش اوپر سے نیچے پھینکی گئی ہے۔ انسان مر جاتا ہے تو اس کا خون نہیں نکلتا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ چھت خاصی اونچی تھی اور پھر منڈیر پر فصیل بھی کھڑی تھی۔ جو اچھے قد کے آدمی کی چھاتی سے ذرا اوپر تک جاتی تھی۔ وہاں سے زندہ آدمی کو پھینکا جاتا تو بھی وہ مر جاتا لیکن اس کے زخموں سے خون بہتا اور یہ خون زمین پر چل پڑتا۔ وہاں تو خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔

لاش کی برآمدگی کے بارے میں کاغذات تحریر کر کے ضروری گواہوں کے دستخط کروائے اور لاش ہیڈ کانسٹیبل کے سپرد کر کے کہا کہ پوسٹ مارٹم کے واسطے ہسپتال لے جائے۔ اس قصبے میں ایک سرکاری ہسپتال تھا جہاں لاشوں کا پوسٹ مارٹم بھی ہُوا کرتا تھا۔

اس کے بعد میں نے ایک کانسٹیبل کو دوڑایا کہ وہ کھوجی کو جگا کر لے آئے...... اُس زمانے میں کھوجی کا تفتیش میں شامل ہونا لازمی سمجھا جاتا تھا اور اس سے ملزموں کا سراغ لگانے میں بڑی کارآمد مدد ملا کرتی تھی۔ اب تو کھوجی کا نام و نشان ہی نہیں رہا اور پولیس کھوجیوں کی ضرورت بھی نہیں سمجھتی۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اب جرائم کے حالات بالکل ہی بدل گئے ہیں۔ اُس زمانے میں حالات کچھ اور تھے جن کی بنیاد یہ تھی کہ قانون کی حفاظت کرنی ہے اور قانون کا احترام کرنا ہے اور واردات کی صورت میں قانون کے تمام تقاضے پورے کرنے ہیں۔ اُس وقت مُک مُکا کا کوئی رواج نہیں تھا نہ کوئی تھانیدار ایسی جرأت کرتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی وارداتوں میں یا دو پارٹیوں کے لڑائی جھگڑے میں بعض تھانیدار کچھ نذرانہ وصول کر کے راضی نامے کرا دیا کرتے تھے لیکن قتل اور ڈکیتی اور اغوا وغیرہ جیسی سنگین وارداتوں کی تفتیش میں کسی تھانے دار کے واسطے ہیرا پھیری کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی اور انگریز افسروں کا ڈنڈا ہر وقت سر پر موجود رہتا تھا۔

اگر مرنے والا ڈپٹی کمشنر کے دفتر کا سٹینوگرافر نہ ہوتا اور اس کی جگہ کوئی غریب مزدور اور بھکاری ہوتا تو بھی میں اسی طرح دوڑتا پہنچتا اور پوری دیانتداری سے تفتیش کرتا۔ ملک انوار کے قتل کی تفتیش میں مجھ کو اور زیادہ چوکنا اور تیز اس وجہ سے ہونا تھا کہ

ڈپٹی کمشنر پولیس کے واسطے موت کا فرشتہ ہُوا کرتا تھا۔ ایک تو ڈپٹی کمشنر اور وہ بھی انگریز، اُس سے تو ہم پولیس والے خوف کھایا کرتے تھے۔

میں مکان کے اندر چلا گیا۔ میں نے جب لاش کو دیکھا تھا اور یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کو جان سے مار کر اوپر سے پھینکا گیا ہے تو میں نے لاش کی گردن کو بہت اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہ اس واسطے دیکھا تھا کہ اس کا گلا گھونٹا گیا ہوگا۔ گردن پر اور شہ رگ پر کوئی ایسا نشان نہیں تھا۔ گلا رسی سے، کپڑے سے یا ہاتھوں سے گھونٹا جائے اور آدمی مر جائے تو اس کی گردن پر جمے ہوئے خون کا نشان اور گھونٹنے کے نشانات صاف رہ جاتے ہیں...... میں اُس کمرے میں گیا جہاں ملک انوار اور اُس کی نئی بیوی سوئے ہوئے تھے۔ اُس وقت واپڈا نہیں ہُوا کرتا تھا۔ قصبے میں چھوٹا سا بجلی گھر لگ گیا تھا اور لوگوں نے گھروں میں بجلی لگوالی تھی۔ ملک انوار کے گھر میں بھی بجلی کا کنکشن تھا۔ اُس کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔

میں نے کمرے میں دو پلنگ ساتھ ملے ہوئے دیکھے۔ دونوں پلنگوں پر کمبل پڑے ہوئے تھے۔ موسم ایسا تھا کہ لوگ کمروں میں کھیس یا کمبل اوڑھ کر سوتے تھے۔ دونوں پلنگوں پر تکئے صحیح جگہ پر رکھے ہوئے تھے اور کرسیوں پر رکھنے والی ایک گدی دونوں پلنگوں کے درمیان پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس گدی کی طرف کوئی زیادہ توجہ نہ دی۔ مجھ کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ پلنگوں پر کیا پڑا ہُوا ہے۔ ملک انوار کی نئی بیوی نے پلنگوں سے یہ گدی اٹھا کر ساتھ پڑی ہوئی کرسی پر رکھ دی۔ میں نے یہ دیکھا کہ ملک انوار کے پلنگ کے ساتھ سلیپر پڑے ہوئے تھے۔ اُس زمانے میں لوگ گھروں میں سلیپر پہنا کرتے تھے۔ یہ چمڑے کے بڑے اچھے سلیپر تھے۔ یہ تو سلیپر دیکھ کر مجھ کو خیال آیا کہ ملک انوار کی لاش کے پاؤں ننگے تھے یعنی اس نے کوئی سلیپر یا کوئی جوتی نہیں پہنی ہوئی تھی۔ مجھ کو خیال آیا کہ ملک انوار جلدی میں اوپر چلا گیا اور ننگے پاؤں ہی دوڑا گیا۔

پھر میں نے دیکھا کہ اسی کمرے میں دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر لکڑی کا بڑا خوبصورت اور لمبوترا بکس رکھا تھا جس کو میں نے فوراً پہچان لیا کہ اس بکس میں بندوق رکھی جاتی ہے۔ میں نے بکس کھولا تو اس میں دونالی بندوق رکھی ہوتی تھی۔ بکس کے اوپر دیوار کے ساتھ بندوق کے کارتوسوں کی بیلٹ لٹک رہی تھی۔ میں ابھی کسی سے کچھ بھی نہیں پوچھ رہا تھا سوائے اس کے کہ نئی بیوی سے دریافت کیا کہ وہ اور ملک انوار کس کمرے میں سوئے ہوئے تھے اور نئی بیوی نے مجھ کو یہ کمرہ دکھایا اور کہا تھا کہ وہ ان پلنگوں پر سوئے ہوئے

تھے۔

پرانی بیوی سے پوچھا کہ وہ کون سے کمرے میں تھی۔ اُس نے بتایا کہ صحن کے اس کمرے کے بالمقابل اُس کا کمرہ ہے یعنی درمیان میں صحن تھا۔ یہ ایک کشادہ اور بڑ اچھی حویلی تھی جس کے تین طرف کمرے اور ان کے آگے برآمدے تھے۔ یہ بھی بتا کہ ملک انوار خوش حال آدمی تھا۔ اُس کا ذریعۂ آمدنی صرف ملازمت نہیں تھا بلکہ اس کچھ زمین تھی اور اُس کے باپ یا دادا کے دو مربعے زمین نہری علاقے میں بھی تھے۔ علاقے جہاں کی میں بات سنا رہا ہوں بارانی علاقہ تھا۔ ملک انوار مالی لحاظ سے بھی ا سوشل حیثیت سے بھی اَپر کلاس کا آدمی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کو چالیس سال کی عمر میں ا بیوی کے ہوتے ہوئے اکیس بائیس سال کی نوجوان لڑکی مل گئی تھی۔ اُس کی پہلی بیوی کی پینتیس چھتیس سال تھی۔

میں اس حویلی کا کتنے ہی اچھے اور واضح الفاظ میں نقشہ کیوں نہ بیان کروں، پھر کچھ حضرات اچھی طرح نہیں سمجھ سکیں گے۔ اتنا ذہن میں رکھ لیں کہ اس حویلی میں ا طرف سیڑھیاں تھیں جو اوپر چھت پر جاتی تھیں۔ نیچے سیڑھیوں کا دروازہ تھا جو رات کو کر دیا جاتا تھا۔ میں نے صحن میں آ کر چاروں طرف دیکھا تو مجھ کو ایک دیوار کے سا بانسوں والی سیڑھی رکھی ہوئی نظر آئی۔ وہ منڈیر سے تقریباً ایک گز نیچے تک رہتی تھی۔ م نے پرانی بیوی سے پوچھا کہ یہ سیڑھی کیا ہر روز یہیں رہتی ہے؟ اُس نے بتایا کہ یہ دو د سے یہاں رکھی ہوئی ہے، کوئی مانگ کر لے گیا تھا اور وہ واپس لایا تو یہیں رکھوا دی، و یہ ڈیوڑھی میں رکھی جاتی ہے۔

رشوت میں رشتہ

میں پکی سیڑھیوں سے چھت پر چلا گیا۔ ملک انوار کی دونوں بیویوں کو ساتھ ل کسی اور کو اوپر نہ آنے دیا کیونکہ چھت پر کھرے دیکھنے تھے۔ اوپر جا کر دیکھا کہ جس چ پر وہ آدمی چلتا سنائی دیا تھا اس کے ایک طرف ایک کمرہ تھا جو مقفل تھا۔ اس مکان کے جگہ خالی تھی۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اوپر جس آدمی کے قدموں کی ہلکی ہلکی آہٹ سنائی تھی، وہ کدھر سے اوپر آیا تھا۔ مکان کے پہلو پر وہ پکی گلی تھی جس میں ملک انوار کو گرا

تھا۔ دوسرے پہلو پر ایک اور مکان تھا جس کی چھتیں اس مکان کی چھتوں کے ساتھ ملی ہوئی تھیں اور درمیان میں اونچی فصیل تھی۔

میرے پوچھنے پر دونوں بیویوں نے بتایا کہ ساتھ والے مکان میں ایک سکول ماسٹر رہتا ہے۔ میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ اُس کی اولاد کیا ہے۔ مجھ کو بتایا گیا کہ ماسٹر ادھیڑ عمر ہے اور اس کی دو بیٹیاں ہیں اور دو بیٹے چھوٹے ہیں۔ میں نے دراصل یہ دریافت کرنا تھا کہ ماسٹر کا کوئی بیٹا جوان ہوگا اور وہ کسی بُری نیت سے ادھر آیا ہوگا لیکن اس مکان میں کوئی جوان بیٹا نہیں تھا۔ اس مکان سے پرے ایسی ہی ایک اور گلی تھی جیسی ملک انوار کے مکان کے پہلو پر تھی اور جس میں وہ گرا تھا۔ ماسٹر کے مکان کے پیچھے جگہ خالی تھی۔ میں نے اُدھر جا کر دیکھا کچھ ملبہ سا پڑا ہُوا تھا لیکن اتنا اونچا نہیں تھا کہ کوئی اُدھر سے چڑھ کر اِدھر آ گیا ہو۔ مختصر بات یہ کہ اس مکان پر کسی طرف سے بھی چڑھنے کی سہولت میسر نہیں تھی۔ ماسٹر کے مکان کے پچھواڑے پڑے ہوئے ملبے کے ساتھ کوئی چھوٹی سیڑھی رکھ کر اوپر آ سکتا تھا۔

میں اُس چھت پر اکیلا گیا جس چھت پر اُس آدمی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں کھرے دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ سمجھ نہ آئی۔ کھرے دھوپ میں زیادہ اچھی طرح دیکھے جا سکتے ہیں۔ چھت پر لپائی کی ہوئی تھی لیکن لپائی پرانی تھی۔ تازہ لپائی پر کھرے نظر نہیں آ سکتے کیونکہ یہ پکی ہوتی ہے۔ میں جو لپائی دیکھ رہا تھا وہ نرم سی ہو گئی تھی اور مجھ کو یہ تو نظر آ ہی رہا تھا کہ کچھ نشان ہیں۔ مجھ کو کھوجی کا انتظار کرنا تھا اور شاید کھوجی آ ہی گیا تھا۔

فجر کی اذان ہو چکی تھی اور میں نے صبح کی روشنی کا اور پھر دھوپ کا انتظار کرنا تھا۔ میں ویسے ہی چھت کے کنارے کنارے ٹہلتا رہا۔ درمیان میں جانے سے اس لئے پرہیز کر رہا تھا کہ میرے پاؤں کے نیچے کھرے مسخ ہو جائیں گے۔ دراصل میں کچھ سوچ رہا تھا۔ سوچ یہ تھی کہ اگر کوئی آدمی اوپر آیا تھا تو اُس کے آنے کا مقصد کیا تھا؟ کیا وہ نیچے جانا چاہتا تھا؟ کیا اُس کا ارادہ چوری کا تھا؟ پھر یہ سوال بھی اٹھا کہ وہ اگر سکول ماسٹر کے پچھواڑے سے چڑھ کر آیا تھا تو وہ سیڑھیوں کے قریب سے گزر کر اس چھت پر کیوں چلا گیا؟

پھر یہ سوچ آئی کہ چاندنی بڑی صاف تھی۔ اُس نے اوپر سے صحن میں ضرور دیکھا ہو گا۔ کیا اس کو ایک دیوار کے ساتھ لگی ہوئی سیڑھی نظر نہیں آئی تھی؟ اس کو اگر معلوم تھا کہ سیڑھیوں کا دروازہ دوسری طرف سے بند ہے تو وہ بانس کی سیڑھی سے نیچے آ سکتا تھا۔ وہ

کیوں نہیں آیا؟...... ایک اور بات ذہن میں رکھ لیں۔ اس زمانے میں جرائم پیشہ لوگ پ
کے طور پر جرم کیا کرتے تھے۔ اگر کوئی جیب تراش تھا تو وہ صرف جیب تراشی ہی کیا کر
تھا۔ چور صرف چوری کرتے تھے۔ نقب لگانے والے صرف نقب ہی لگایا کرتے تھ
ایسے ہی ڈاکو تھے اور راہزن تھے اور ہر ایک کا اپنا اپنا ایک طریقہ تھا۔ آج کل تو یہ حال ہ
کہ پہلے مُک مُکا کر لیا جاتا ہے اور اس کے بعد واردات کی جاتی ہے۔ دن دیہاڑے گ
میں گھس کر گھر لوٹ لیا جاتا ہے۔ کوئی ہلے بولے تو اس کو گولی مار دی جاتی ہے۔ آج ک
کوئی بھی آدمی جرائم پیشہ نہ ہونے کے باوجود جرم کر سکتا ہے۔ اگر آپ کسی اعلیٰ افسر
بیٹھے ہیں اور پھر علاقہ تھانیدار کے ساتھ آپ کا رابطہ ہے تو آپ جیسی بھی واردات ک
چاہیں کر سکتے ہیں۔ جرائم پیشہ کلاس تو ختم ہی ہو گئی ہے۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہو
اور جس واردات کا قصہ سنا رہا ہوں، یہ کسی جرائم پیشہ آدمی کی نہیں لگتی تھی۔ اگر چور
ڈکیتی کرنی تھی تو نقب لگائی جاتی یا ڈاکوؤں کی پوری پارٹی ہوتی اور وہ اپنے طریقے
واردات کرتے۔ اس طرح چھت پر ٹہلتے سنائی نہ دیتے۔

پھر میرے ذہن میں یہ حقیقت اٹکی ہوئی تھی کہ ملک انوار کو پہلے قتل کیا گیا پھر
پھینکا گیا۔ یہاں یہ سوچ آئی کہ اس کو قتل کر دیا گیا تھا اور سیڑھیوں کا دروازہ بھی کھل گیا
پھر ملزم نیچے کیوں نہیں آیا؟ کیا اس کو معلوم تھا یا نہیں کہ گھر میں اب صرف دو عورتیں رہ
ہیں۔ وہ آسانی سے واردات کر سکتا تھا۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ اُس نے ملک انوار کو او
سے نیچے کیوں پھینکا؟ اگر ان کی آپس میں دست بدست لڑائی ہوئی تھی تو ہو سکتا ہے کہ
دونوں میں سے کوئی منڈیر سے نیچے جا پڑتا لیکن منڈیر پر پانچ فٹ اونچی فصیل تھی۔
انوار اوپر سے اگر لڑتے لڑتے گرا ہی تھا تو اُس کے زخموں سے خون کیوں نہیں نکلا؟

ان سوچوں میں الجھے ہوئے مجھ کو وقت گزارنے کا ایک اور بہانہ مل گیا جو یہ تھا
ان دونوں بیویوں کے بیان لے لوں۔ ابھی ان کے بیانوں کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن
وقت گزارنا چاہتا تھا تا کہ سورج اوپر آ جائے۔ میں دونوں بیویوں کو نیچے لے آیا
بیوی کو اُس کے کمرے میں لے گیا۔ مجھ کو وہاں اطمینان اور خوشی والی ایک بات نظر آ
تھی۔ وہ یہ تھی کہ مقتول کی دو بیویاں تھیں اور دونوں نے ایک دوسری کے خلاف ہی
دینے تھے۔ میں نے دونوں کو ایک دوسری کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ البتہ یہ سوچ
آئی کہ اگر پرانی بیوی کو رنج تھا کہ اس کا خاوند ایک نوجوان دلہن لے آیا ہے تو وہ

خاوند کو قتل نہ کرتی یا نہ کرواتی بلکہ وہ نئی بیوی کے خلاف کوئی کارروائی کرتی۔ ایسے ہی نئی بیوی پرانی بیوی کو گھر سے نکلوانے کا کوئی اہتمام مجرمانہ کرتی، ایسا تو کبھی سوچتی بھی نہ کہ اپنے خاوند کو ہی مروا ڈالے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ یہ نئی لڑکی اس امید پر خاوند کو مروا ڈالتی کہ اس سے خلاصی مل جائے۔ بہر حال اس کا کچھ نہ کچھ اشارہ یا سراغ پرانی بیوی سے ملنے کا امکان تھا۔

میں نے نئی بیوی کا دل جیتنے کے واسطے اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا کہ ملک انوار نے تو اُس کی جوانی برباد کر دی ہے۔ میں نے ملک انوار کو اور اُس کی پرانی بیوی کو بُرا بھلا کہا لیکن اس نئی بیوی نے اپنی سوکن یعنی ملک انوار کی پرانی بیوی کی ایسی تعریفیں شروع کر دیں کہ اُس کے اپنی ماں کا درجہ دے دیا۔ اس کو وہ خالہ کہتی تھی۔

''آپ کو شاید یقین نہیں آئے گا'' — اُس نے کہا — ''میں تو ڈرتی تھی کہ میری سوکن زیادہ عمر کی تجربہ کار عورت ہے اور یہ میرا جینا حرام کر دے گی لیکن میں تو کہتی ہوں کہ سگی ماں سے جدا ہو کر آئی تھی تو یہاں سگی ماں جیسی ہی ماں مل گئی ہے۔ اسی لئے میں اس کو خالہ کہتی ہوں اور آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں اُس کا کتنا احترام کرتی ہوں اور میرے دل میں اُس کا کتنا پیار ہے۔ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ یہ شخص مجھ کو صرف اس واسطے بیاہ کر لایا ہے کہ میں اس کے بچے پیدا کروں جو پہلی بیوی اس کو نہیں دے سکی لیکن خالہ نے مجھ کو پہلے دن ہی بتا دیا کہ تم بچہ پیدا نہیں کر سکو گی کیونکہ یہ شخص اس وصف سے محروم ہے اور یہ اس کا پیدائشی نقص ہے لیکن تم فکر نہ کرنا، میں تم کو اپنے پروں کے نیچے رکھ کر محفوظ رکھوں گی''۔

میں اس لڑکی کی یہ بات سن کر پریشان ہو گیا۔ یہ سوچ بھی آئی کہ پہلی بیوی نے اس کو پیار کا دھوکا دے کر اپنے پاؤں کے نیچے رکھ لیا ہے لیکن یہ لڑکی اُس سے پوری طرح مطمئن اور خوش تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ شادی کس طرح ہوئی تھی تو اس نے بتایا کہ اس کا باپ لالچی آدمی ہے اور ملک انوار کے پاس روپیہ پیسہ تھا اس واسطے اُس نے اس لڑکی کے باپ کو لڑکی کی قیمت دے کر اس کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ لڑکی کو کتنا دکھ ہُوا ہو گا۔

میں نے اس لڑکی سے اور زیادہ کچھ نہ پوچھا۔ وہ خاصی خوبصورت لڑکی تھی اور اتنی ہی بدقسمت نکلی۔ مجھ کو یہ خیال بھی آیا کہ کسی ملزم کی بددعا سے ملک انوار کسی نامعلوم قاتل کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ میں نے اس کو باہر بھیج دیا اور کہا کہ اپنی سوکن خالہ کو میرے پاس بھیج

دے۔ ملک انوار کی پرانی بیوی برآمدے میں ہی موجود تھی، وہ فوراً میرے پاس آ گئی۔ میں نے اس کو بٹھا لیا اور غور سے دیکھا۔ میں اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہو گئی تھی لیکن عمر کی نسبت وہ جوان لگتی تھی۔ اُس نے کوئی بچہ پیدا نہیں کیا تھا نہ کسی بچے کو دودھ پلایا تھا اس واسطے اُس کی جوانی اور چہرے کی رونق قائم تھی۔ وہ بھی خوبصورت عورت تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ عورت فطرت اور ذہنیت کے لحاظ سے کیسی ہے۔ یہ معلوم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا لیکن کچھ تجربہ ہو تو اشارے مل ہی جاتے ہیں۔ میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا کہ ایک تو اُس کو اللہ نے اولاد سے محروم رکھا اور پھر اُس کا خاوند اُس کی سوکن لے آیا اور اب خاوند قتل ہی ہو گیا۔

اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے اُس کی نوجوان سوکن کے خلاف ایک دو باتیں کہہ ڈالیں اور مجھ کو امید تھی کہ وہ بھی نئی بیوی کے خلاف بات کرے گی لیکن اُس نے کچھ اور ہی بات کی۔

"لڑکی پر میں کوئی الزام نہیں لگاتی" —— اُس نے کہا —— "یہ معصوم لڑکی زبردستی میرے گھر میں نہیں آ کر بیٹھ گئی، اس کو زبردستی لایا گیا ہے۔ میرے دل میں اس مظلوم لڑکی کے واسطے ہمدردی ہی ہمدردی ہے۔ اس کے باپ نے اس کو میرے خاوند کے ہاتھ بیچا ہے اور نقد رقم وصول کی ہے۔ اس لڑکی کے باپ کی ایک مجبوری اور بھی تھی، وہ یہ کہ اس کا ایک کام جو مجھ کو معلوم نہیں کیا تھا، ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں پھنسا ہُوا تھا۔ وہ میرے خاوند کے پاس گیا اور منت کی کہ اُس کا یہ کام کروا دے۔ میرے خاوند کو معلوم تھا کہ اس شخص کی ایک نوجوان اور بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ میرے خاوند نے بات تو رشتہ مانگنے کی کی لیکن اُس نے دراصل اس شخص سے اس کی بیٹی کا رشتہ رشوت کے طور پر مانگا تھا۔ باپ نے بیٹی اس کے ساتھ بیاہ دی اور اُس کا پھنسا ہُوا کام اس کی مرضی کے مطابق ہو گیا اور اس کے کچھ رقم نقد بھی مل گئی۔ اس طرح اس بے چاری لڑکی کی جوانی برباد ہو گئی"۔

"تمہارا خاوند تو اسی کو زیادہ چاہتا ہوگا" —— میں نے کہا۔

"یہ تو مرد کی فطرت ہے" —— اُس نے کہا —— "ملک صاحب (مقتول) اس کے ساتھ زیادہ رہتے تھے لیکن مجھ کو انہوں نے ایسی شکایت نہیں ہونے دی کہ مجھ کو بالکل ہی الگ پھینک دیا ہو۔ میرے ساتھ ملک صاحب نے دلی محبت کی ہے اور یہ محبت قائم رہی۔ اسی محبت کا اثر تھا کہ انہوں نے پندرہ سال میرے ساتھ گزارے، اولاد نہ ہوئی تو بھی

انہوں نے دوسری شادی کی بات نہ کی۔ اولاد کے واسطے وہ پریشان رہنے لگے تھے۔ کہتے تھے کہ میں ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور میرا کوئی بیٹا نہ ہُوا تو اتنی جائیداد کا وارث کون بنے گا"۔

میں پہلی بیوی کے اس بیان کو زیادہ طول نہیں دوں گا، اس واسطے کہ اس کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ مختصراً یہ بتا دیتا ہوں کہ مقتول ملک انوار کو اس بیوی کے ساتھ دلی محبت تھی۔ اولاد کی امید نہ رہی تو بھی مقتول نے دوسری شادی کی بات نہ کی لیکن اُس کا رویہ عام مردوں جیسا رہا۔ وہ اس طرح کہ کہتا تھا کہ نقص بیوی میں ہے اُس میں نہیں۔ وہ اپنا ڈاکٹری معائنہ یا ٹسٹ نہیں کرواتا تھا۔ اُس کی بیوی نے بتایا کہ اُس کو پتہ لگ گیا تھا کہ خاوند نے دو تین ڈاکٹروں سے ٹسٹ کروایا تھا اور انہوں نے اس کو کہا تھا کہ اُس میں قدرت نے اولاد پیدا کرنے والے جرثومے رکھے ہی نہیں، پھر بھی وہ چوری چھپے دوائیاں کھاتا رہتا تھا۔ یہ بات پرانی بیوی کے بھائیوں کو معلوم ہو گئی تھی لیکن مقتول یہی کہتا تھا کہ بیوی میں نقص ہے۔ اولاد کے واسطے اُس نے بہت جتن کئے اور بہت دُور دُور کے مزاروں اور زیارتوں پر گیا اور عاملوں وغیرہ کے پاس بھی پیسہ برباد کیا لیکن اس نعمت سے اللہ نے اس کو محروم رکھا تھا، وہ نعمت اس کو کوئی بندہ نہیں دے سکتا تھا۔

دو تین سال پہلے کی بات ہے کہ مقتول ملک انوار نے اپنی بیوی کو یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اولاد کی خاطر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ بیوی سے اجازت مانگتا تھا حالانکہ اُس وقت بیوی کی اجازت کی ضرورت والا قانون نہیں بنا تھا۔ انگریزوں کا اپنا قانون تھا جس میں خاوند کے واسطے کوئی پابندی نہیں تھی۔ پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر خاوند دوسری شادی کر لیتے تھے لیکن یہاں پیار اور محبت کا معاملہ تھا۔ بیوی نے جب دیکھا کہ مقتول پیار اور محبت کے واسطے دے رہا ہے تو اس نے اُس کو اجازت دے دی۔

دراصل مقتول نے اس لڑکی کے رشتے کی بات پکی کی ہوئی تھی جس کا پتہ پہلی بیوی کو بعد میں لگا۔ جوں ہی پہلی بیوی نے دوسری شادی کی اجازت دے دی تو ملک انوار نے فوراً ہی شادی کر لی۔ تب پہلی بیوی کو پتہ لگا کہ ملک صاحب نے پہلے سے سارا انتظام پکا کیا ہُوا تھا۔ نئی بیوی گھر آ گئی تو پرانی بیوی نے اُس کو الگ بٹھا کر کہا کہ اپنے آپ کو اس گھر کی ملکہ نہ سمجھ لینا پھر تم کو یہاں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

"میں آپ کو سچی بات بتاتی ہوں" —— پرانی بیوی نے مجھ کو بیان دیتے ہوئے کہا

——''میں نے اس لڑکی کو گلے لگا لیا۔ میں عورت ہوں اور عورت کے دل کی بات کو کوئی عورت ہی ٹھیک طرح سمجھ سکتی ہے۔ اس بے چاری لڑکی نے معلوم نہیں اپنے مستقبل کے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے لیکن اس کو اپنی عمر سے دگنی عمر کے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا گیا اور آدمی بھی ایسا تھا جس کی پہلے بیوی موجود تھی اور گھر پر حکمرانی اسی بیوی کی تھی۔ یہ لڑکی بے چاری تو دن رات روتی تھی اور میں اس کو بہلاتی تھی۔ یہ بات تو میں نے اس کو پہلے دن ہی کہہ دی تھی کہ اس کا کوئی بچہ پیدا نہیں ہوگا اور یہ مایوسی بھی اس کو برداشت کرنی پڑے گی''۔

''یہ لڑکی تمہارے قریب ہی رہنے والی ہے''—— میں نے کہا—— ''تمہیں معلوم ہوگا کہ اس لڑکی کا کہیں رشتہ کیا ہوا ہوگا یا یہ لڑکی کسی کو چاہتی ہوگی اور ہوسکتا ہے کسی سے اس کی میل ملاقات بھی ہوتی ہو''۔

''بالکل نہیں''—— پہلی بیوی نے کہا—— ''یہ بڑی شریف لڑکی ہے۔ اس کا رشتہ کہیں بھی طے نہیں ہوا تھا اور دوسری بات یہ کہ اس کی اپنی کوئی پسند ہوگی، یہ میں جانتی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ بڑی پاک صاف اور اچھے چال چلن والی لڑکی ہے۔ اس پر ایسا کوئی شک نہ کریں''۔

میں اس عورت کی یہ باتیں سن کر پریشان تو ہوا لیکن حیران بہت ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ ایک سوکن اپنی سوکن کی تعریف اور حمایت کر رہی تھی۔ عام طور پر پہلی بیویاں دوسری بیویوں کو اپنی دشمن سمجھتی ہیں اور ایسی وارداتیں بھی میرے پاس آئیں کہ پہلی بیوی نے نئی بیوی کو زہر دے دیا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔

''میری ایک بات سن لو''—— میں نے کہا—— ''اوپر چھت پر جو کوئی بھی آیا تھا وہ چوری ڈاکے کی نیت سے نہیں آیا تھا۔ اُس نے تمہارے خاوند کو قتل کرنا تھا اور کر کے چلا گیا ...... یہ تم ہی بتا سکتی ہو کہ اُس کا دشمن کون تھا''۔

''ملک صاحب کا کوئی دشمن نہیں تھا''—— اُس نے جواب دیا—— ''آپ کسی سے پوچھ لیں، وہ ملک صاحب کے اخلاق کی تعریف کرے گا۔ لوگوں کے کام جو ان کے دفتر میں پھنسے رہتے تھے، ملک صاحب پوری دلچسپی سے خود کرا دیا کرتے تھے اور انہوں نے رشوت کا کبھی ایک پیسہ قبول نہیں کیا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لینے سے ملک صاحب کے خلاف کچھ باتیں ہوئی تھیں لیکن ملک صاحب کی صرف یہ ضرورت تھی کہ زیادہ نہیں اللہ ایک بیٹا دے دے۔ انہوں نے دوسری شادی عیاشی کی خاطر نہیں کی تھی''۔

سوکنوں کا پیار اور پیار کا راز

سورج اوپر آ گیا تھا اور کھوجی کو آئے ہوئے بہت دیر ہوگئی تھی۔ میں نے کھوجی کو ساتھ لیا اور چھت پر چلا گیا۔ سب سے پہلے وہ چھت دیکھی جس پر کوئی چل رہا تھا اور اس کی ہلکی ہلکی آہٹ نیچے سنائی دی تھی۔ نئی بیوی نے یہ بھی بتایا تھا کہ چھت پر لڑائی کی آوازیں بھی آئی تھیں۔ میں نے اور کھوجی نے چھت کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک دیکھا۔ دوسرے کونے تک جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہاں سے مقتول کو نیچے پھینکا گیا تھا۔

سب سے پہلی بات یہ نوٹ کر لیں کہ وہاں لڑائی کا اور گتھم گتھا ہونے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ ذرا تصور میں لائیں کہ دو آدمی گتھم گتھا ہو رہے ہیں اور وہ زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ان کے پاؤں کے نیچے کی زمین جگہ جگہ سے اکھڑنی چاہئے۔ چھت پر لپائی تھی جو پرانی ہوگئی تھی۔ ہاں کوئی ایسا نشان نظر نہ آیا جہاں سے مقتول نیچے پھینکا گیا تھا۔ وہاں پرنالہ تھا۔ وہاں تو لپائی اور ہی زیادہ کمزور تھی۔ وہاں کھرے تھے لیکن آپس میں گڈمڈ ہوگئے تھے۔

کھوجی نے یہ رائے دی کہ دو یا تین، ہوسکتا ہے چار آدمی ہوں جو اکٹھے چلتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف سے پرنالے تک گئے اور پھر وہاں سے واپس آ گئے۔ اُس نے مجھ کو ایک ایک نشان دکھایا۔ اتنی سی کھرا شناسی تو میں بھی جانتا تھا۔ یہ بالکل واضح ہوگیا کہ چھت پر کسی کی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ وہاں سے ہم دوسری چھتوں پر گئے۔ کہیں کوئی ایسا نشان نہ ملا کہ ملزم فلاں طرف سے آیا اور یہاں تک یعنی واردات والی چھت تک گیا...... میں آپ کو اچھی طرح نہیں سمجھا سکتا کہ کھرے کس قسم کے تھے اور کھوجی نے ہر ایک کھرا کس طرح بیان کیا تھا۔ یہ ایک ہنر اور کمال ہے جو دیکھا جائے اور وہیں موقعہ پر سنا جائے تو ہی سمجھ میں آتا ہے۔ کھوجی ماہر ہو تو اس کی باتیں بعض اوقات ڈرا بھی دیا کرتی ہیں۔ وہ ایسے الفاظ اور انداز میں بیان کرتا ہے جیسے جن بھوت اُس کو نظر آ رہے ہیں اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے چل پھر رہے ہیں اور وہ ان کے کھرے دیکھ رہا ہے۔ مختصر بات یہ کہ چھتوں کی لپائی نے قابل یقین گواہی دی کہ چھت پر کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔

یہ تو میں نے پہلے یقین کے ساتھ بتا دیا ہے کہ ملک انوار کو پہلے ہلاک کیا گیا اور اس کے بعد نیچے پھینکا گیا۔ اب یہ پتہ چلا کہ تین چار آدمی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر گئے اور

کونے کے اُس پرنالے تک گئے جہاں سے ملک انوار کو نیچے پھینکا گیا تھا۔ اس کا مطلب بھی ہوسکتا تھا کہ مقتول ملک انوار کو گھر میں قتل کیا گیا اور اس کی لاش اوپر لا کر فصیل کے اُ سے نیچی گلی میں سر کے بل پھینکی گئی اور سر کی کھال پھٹ گئی۔

اب دو باتیں اور سن لیں۔ ملک انوار کو بیوی نے بتایا کہ چھت پر کوئی آدمی چل رہا ہے۔ ملک انوار نے یہ آہٹ سنی اور اوپر چلا گیا۔ وہ اتنا بے وقوف تو نہیں تھا کہ یہ سمجھ کر اوپر چلا گیا کہ اُس کا کوئی دوست ملنے آیا ہے۔ اوپر کوئی چور اور ڈاکو ہی ہوسکتا تھا لیکن ملک انوار خالی ہاتھ اور ننگے پاؤں اوپر چلا گیا۔ اُس کے پلنگ کے قریب اُس کی دونالی بندوق رکھی ہوئی تھی۔ وہ فوراً بندوق نکالتا اور اس میں دو کارتوس ڈال کر اوپر لے جاتا۔ اگر بندوق کسی وجہ سے نہ لے جانا چاہتا تو ڈنڈہ یا چاقو یا چھری لے کر جاتا، خالی ہاتھ نہ جاتا۔ ننگے پاؤں جانے کی کوئی تک نہ تھی۔ قدرتی بات ہے کہ آدمی رات کو اٹھتا ہے تو سب سے پہلے اُس کے پاؤں چپل یا سلیپر اُس جوتی میں جاتے ہیں جو پلنگ یا چارپائی کے قریب پڑی ہوئی ہوتی ہے۔

مقتول ملک انوار کا ننگے پاؤں جانا، خالی ہاتھ جانا اور بندوق کی طرف دھیان ہی نہ دینا بڑا ہی پختہ شک پیدا کرتا تھا۔

انگریزوں کے زمانے میں لاش کا پوسٹ مارٹم فوراً کیا جاتا تھا۔ ایسے نہیں ہوتا تھا جیسے پاکستان کے بڑے شہروں کے سرکاری ہسپتالوں میں ہوتا ہے کہ لاشیں کئی کئی گھنٹے اور کبھی ایک ایک دن باہر پڑی رہتی ہیں اور پوسٹ مارٹم نہیں ہوتا اور پوسٹ مارٹم ہوتا بھی ہے تو کسی اناڑی اور نوآموز ڈاکٹر کے ہاتھوں کرایا جاتا ہے یا ڈسپنسر ٹائپ کے لوگ چیر پھاڑ کر کے کوئی رپورٹ لکھ دیتے ہیں اور ڈاکٹر اس پر دستخط کر دیتا ہے۔ ہمارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے لاش بھجوائی تو مجھ کو بعد میں پتہ لگا کہ ڈاکٹر کو جگا کر اطلاع دی گئی۔ ڈاکٹر اُسی وقت پہنچا اور پوسٹ مارٹم شروع کر دیا۔ میں اور کھوجی اوپر سے نیچے آئے تو مجھ کو اطلاع دی گئی کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی ہے۔ رپورٹ یہ تھی کہ ملک انوار کو پہلے سانس روک کر قتل کیا گیا اور اس کے کچھ دیر بعد لاش چھت سے نیچے پھینکی گئی۔ گلا نہیں گھونٹا گیا تھا۔ سانس کسی اور طریقے سے روکا گیا تھا۔ رپورٹ میں سر اور ہاتھ کے زخموں کا بھی ذکر تھا۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ اگر مقتول کو زندہ حالت میں اوپر سے نیچے سر کے بل گرایا جاتا تو اس کے سر پر جو زخم اور چوٹ آئے ہیں یہ بھی مہلک ثابت ہوسکتے تھے۔ کھوپڑی میں تھوڑا

سا کریک آگیا تھا۔ بہرحال موت سانس رکنے سے واقع ہوئی۔

میں نے موقعہ کی تفتیش کو یہیں پر رکھا اور اپنے عملے کو ساتھ لے کر تھانے چلا گیا اور وہاں سے ہسپتال جا پہنچا۔ میں نے ڈاکٹر سے کچھ ضروری باتیں پوچھنی تھیں۔ وہ ہندو ڈاکٹر تھا جس کا نام کنہیا لعل بھاٹیہ تھا۔ پچاس سال عمر کا وہ ڈاکٹر بڑا ہی قابل اور تجربہ کار تھا۔

''ڈاکٹر صاحب!'' — میں نے پوچھا — ''سانس روکنے کے اور کیا طریقے ہو سکتے ہیں؟''

''آپ تو پولیس انسپکٹر ہیں'' — ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا — ''آپ کو تو مجھ سے زیادہ پتہ ہونا چاہئے کہ کسی کا سانس کس کس طریقے سے روکا جا سکتا ہے۔ کیا آپ کے پاس ایسی واردات کبھی نہیں آئی؟ ...... میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ کسی انسان کی ناک اور منہ پر ہاتھ اس طرح رکھ دو کہ وہ سانس نہ لے سکے تو اُس کی موت واقع ہو جائے گی۔ لیٹے یا سوئے ہوئے آدمی کے منہ اور ناک پر تکیہ یا گدی رکھ کر اوپر سے دبا دو تو دو منٹ بعد وہ آدمی تڑپ تڑپ کر مر جائے گا''۔

ڈاکٹر نے بات یہیں تک کی تھی تو میرے دماغ میں روشنی سی آئی۔ مجھ کو یاد آگیا کہ دونوں پلنگوں کے درمیان ایک سفید گدی رکھی ہوئی تھی جس کی طرف میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔ یہ گدی مقتول کی نئی بیوی نے اٹھا کر کرسی پر رکھ دی تھی۔ اب مجھ کو یہ سوچ آئی کہ اُس کا خاوند قتل ہوگیا تھا اور گھر میں پولیس آئی ہوئی تھی لیکن اس لڑکی کو یہ ضروری معلوم ہُوا کہ پلنگوں سے یہ گدی اٹھا کر کرسی پر رکھ دے ...... میں ڈاکٹر سے اجازت لے کر اٹھا اور تقریباً دوڑتا ہوا تھانے پہنچا اور ایک ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر ملک انوار کے گھر جا پہنچا۔ اُس وقت لاش گھر میں آچکی تھی اور عورتیں اکٹھی ہو چکی تھیں۔ ملک انوار کی میت پر رونے والی یہ دو بیویاں ہی تھیں۔ اُس کا اپنا کوئی زندہ نہیں تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے اور وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔

باہر گلی میں آدمیوں کا ایک ہجوم جمع ہو رہا تھا۔ ان کے بیٹھنے کے لئے دریاں بچھا دی گئی تھیں۔ مجھ کو دیکھ کر سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے دو آدمیوں کو ساتھ لیا اور مقتول کی بڑی بیوی کے بڑے بھائی کو بھی ساتھ لے لیا۔ میں ان کو اندر لے گیا۔ مقتول کی نئی بیوی کو بلوایا اور ان سب کو اُس کمرے میں لے گیا جہاں مقتول اور نئی بیوی سوئے ہوئے تھے۔

''میری ایک بات کا جواب دو'' — میں نے نئی بیوی سے پوچھا اور کرسی پر رکھی

ہوئی گدی کی طرف اشارہ کیا ——— ''تم نے یہ گدی پلنگوں سے اٹھا کر کرسی پر رکھی تھی''۔

وہ کچھ دیر تو چپ رہی اور میں اُس کو دیکھتا رہا۔ آخر اپنا سوال دہرایا اور اُس کو کہا کہ پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں، ہم پولیس والے ذرا ذرا سی بات پر توجہ دیا کرتے ہیں۔

''ہاں جی'' ——— اُس نے کہا ——— ''میں نے یہ گدی ان پلنگوں سے اٹھا کر کرسی پر رکھی تھی''۔

میں اپنے ساتھ جو آدمی لایا تھا، ان کو بتایا کہ یہ گدی برآمد کرنی ہے اس واسطے اس کا قانون اور ضابطے نے جو صحیح طریقہ بتایا ہے، میں وہ طریقہ اختیار کروں گا۔ میں نے وہ گدی اٹھائی اور اپنے ساتھ لائے ہوئے ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر دی پھر میں نے نئی بیوی کا چھوٹا سا بیان لکھوایا اور پھر اس پر ان دو آدمیوں کے دستخط کروائے جو ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے یہ تصدیق کی کہ مقتول کی چھوٹی بیوی نے جو گدی پلنگوں سے اٹھا کر کرسی پر رکھی تھی وہ اس نے تھانے دار صاحب کے حوالے کر دی ہے اور یہ بیان ان کی موجودگی میں دیا ہے۔ میں نے اس بیان پر اس لڑکی کے دستخط بھی کرا لئے تھے۔

میں نے ان سب لوگوں کو فارغ کر دیا اور کمرے سے نکلتے وقت گدی ہیڈ کانسٹیبل سے لے کر دونوں طرفوں سے دیکھی۔ ایک طرف کچھ ایسا مواد لگا ہوا تھا جیسے کپڑے پر دودھ گر جائے تو نشان رہ جاتا ہے اور یہ نشان ذرا اکڑا ہوا ہوتا ہے۔ یہ نشان پوری طرح خشک نہیں ہوا تھا لیکن اتنا گیلا بھی نہیں تھا۔ مجھ کو خیال آیا کہ یہ گدی مقتول کے منہ پر رکھی گئی ہو گی اور اُس کی ناک سے یا اُس کے منہ سے یہ تھوڑا سا مواد نکلا ہو گا...... میں ان آدمیوں کے ساتھ برآمدے سے نکل رہا تھا تو پیچھے سے مجھ کو کسی نے پکڑا۔ پیچھے دیکھا تو مقتول ملک انوار کی چھوٹی بیوی تھی۔ اُس نے سر کے اشارے سے مجھ کو رکنے کے واسطے کہا۔ میں پیچھے ہٹ کر اُس کے قریب چلا گیا۔

''آپ یہ گدی نہ لے جائیں'' ——— اُس نے کہا ——— ''یہ دھلی ہوئی نہیں۔ میں آپ کو ایسی ہی ایک اور گدی دے دیتی ہوں''۔

مجھ کو لڑکی کی اس بات پر ہنسی بھی آئی اور رحم بھی آیا۔ مجھ کو اشارے ملنے شروع ہو گئے کہ ملک انوار چھت کے نیچے ہلاک کیا گیا تھا اور چھت کے اوپر لے جا کر گلی میں پھینکا گیا لیکن اس خیال کو یقین میں بدلنے کے واسطے مجھ کو مضبوط شہادت اور ثبوت کی ضرورت تھی۔ میں نے نئی بیوی کو کچھ نہ کہا۔ اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر

بڑی صاف تبدیلی آ گئی تھی۔ اتنا اچھا چہرے کا رنگ لاش کی طرح پیلا اور سفید ہو گیا تھا۔ میں اُس کو اسی حالت میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

میں نے گدی اٹھائی اور وہاں سے چلا پھر ہسپتال جا کر ڈاکٹر سے ملا۔ اس کو گدی دکھائی اور داغ بھی دکھایا۔ ڈاکٹر نے گدی ہاتھ میں لے کر وہ داغ سونگھا اور گدی میز پر رکھ کر ذرا سا مسکرایا۔

''میں آپ کو یہ بات بھی بتانا چاہتا تھا'' ——— ڈاکٹر نے کہا ——— ''آپ شاید جلدی میں تھے اس واسطے پوری بات سنے بغیر چلے گئے...... اگر مقتول کا سانس روکنے کے واسطے یہ گدی استعمال کی گئی تھی تو یہ داغ اُس کے ناک یا منہ سے نکلنے والے مواد کا ہے۔ ایسا مواد ہر مقتول کے منہ یا ناک سے نہیں نکلا کرتا۔ یہ کسی کسی کیس میں ہوتا ہے۔ گدی ذرا ڈھیلی پڑ جائے تو منہ یا ناک سے تھوڑا سا مواد نکل کر گدی کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ یہ داغ جو اس گدی پر ہے، انسانی منہ یا ناک سے نکلنے والے مواد کا ہے''۔

اس موضوع پر ڈاکٹر کے ساتھ کچھ اور بھی باتیں ہوئیں اور اُس نے مجھ کو بڑے کام کی باتیں بتائیں۔ اب تو کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ یہ واردات کس طرح ہوئی ہے لیکن میرا کام یہاں پر ختم نہیں ہو گیا تھا بلکہ یہاں سے شروع ہوا تھا۔ اب میرے دماغ اور تجربے پر منحصر تھا کہ میں اصل قاتل تک کس طرح پہنچتا ہوں۔ میں ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے تھانے چلا گیا۔

تھانے جا کر میں تنہائی میں بیٹھ گیا اور اس مسئلے پر غور کرنے لگا۔ میں ان دونوں بیویوں کے اتفاق اور آپس میں ہمدردی پر حیران ہو رہا تھا۔ مجھ کو سوچ یہ آ رہی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ دونوں بیویوں نے آپس میں اتفاق کر لیا ہو اور انہوں نے مل کر ملک انوار کو قتل کر دیا یا کروا دیا ہو۔ میں آپ کو دلچسپی کے واسطے یہ بات ذرا مختصر سی سناتا ہوں۔ آج تک کی عمر میں، میں نے صرف ایک خاوند دیکھا ہے جس نے ایک بیوی کی موجودگی میں ایک اور شادی کی تھی لیکن اولاد کی خاطر نہیں بلکہ وہ ذرا عیاش طبیعت کا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سوکن کا مطلب ہوتا ہے دشمن۔ ایک خاوند کی دو بیویاں اکٹھی رہ ہی نہیں سکتیں۔ ایک دوسری کا خون پینے کو تیار رہتی ہیں لیکن اس خاوند کی دونوں بیویوں نے آپس میں اتحاد کر کے خاوند کے خلاف محاذ بنا لیا۔ وہ لڑنے کی بجائے خاوند کا جینا حرام کئے رکھتی تھیں۔ خاوند نے دونوں کو الگ الگ مکانوں میں رکھا۔ نئی بیوی اُس کو اچھی لگتی تھی اس

واسطے اُس کے واسطے تحفے لاتا تھا۔ نئی بیوی تحفہ قبول نہیں کرتی تھی بلکہ خاوند سے یہ پوچھ
کہ اُس نے ایسا ہی تحفہ پہلی بیوی کو دیا ہے یا نہیں۔ اگر خاوند کہتا کہ اُس نے پہلی بیوی
تحفہ نہیں دیا تو نئی بیوی وہ تحفہ اُس کے منہ پر مارتی اور کہتی کہ پہلے اس کو دو اُس کے بعد
دینا۔ اس طرح یہ چکر دونوں بیویاں چلائے رکھتیں اور کبھی دونوں اکٹھی ہو کر خاوند کو ذ
وخوار کرنے بیٹھ جاتی تھیں۔ خاوند کا یہ حال ہو گیا کہ دوستوں کے آگے جا کر روتا تھا۔
اُس نے مجبور ہو کر نئی بیوی کو طلاق دے دی۔

یہ میں دوسرا کیس دیکھ رہا تھا جس میں دو سوکنوں نے آپس میں اتحاد کر لیا تھا لیکن
کہنا بڑا مشکل تھا کہ ان دونوں نے یہ اتحاد دیانتداری سے کیا تھا یا خاوند سے خلاصی حاصل
کرنے کے واسطے کیا تھا۔ اس کے واسطے مجھ کو شہادت اور ثبوت کی ضرورت تھی۔ میں ا
دونوں بیویوں کو یہ اشارہ نہیں دینا چاہتا تھا کہ مجھ کو ان پر شبہ ہے۔ گدی وہاں سے لا
سے ان کو شبہ ہو گیا ہو گا لیکن مجھ کو اس کا کوئی غم نہیں تھا۔ مجھ کو اپنے تجربے پر بھروسا تھا۔
ان سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ میرا ایک بڑا ہی پیارا دوست چوہدری اختر حسین آ گیا۔
اسی قصبے کا رہنے والا تھا اور زمیندار خاندان کا شہزادہ قسم کا بیٹا تھا۔ اُس کی عادتیں اتنی اچھی
تھیں کہ ایک بار ملاقات ہوئی اور اس کے ساتھ بڑی گہری دوستی ہو گئی۔ اُس کو پڑھنے
شوق تھا اور اُس نے اُس زمانے میں بی اے پاس کر لی تھی لیکن زمینوں کی دیکھ بھال
میں لگا رہتا تھا۔ وہ اُس روز میرے پاس صرف اس کیس کی بابت سن کر آیا تھا۔ مجھ
پوچھا کہ میں کسی سراغ پر پہنچا ہوں کہ نہیں۔ میں نے اُس کو راز کی ہر بات تو نہ بتائی البتہ
ایک دو باتیں بتا دیں اور کہا کہ میں انشاء اللہ جلد ہی ملزموں تک پہنچ جاؤں گا۔ وہ ہنس
اور اُس نے ایک بڑی دلچسپ بات بتائی۔

اُس کو یہ پتہ پہلے ہی لگ گیا تھا کہ ملک انوار کیوں چھت پر گیا تھا اور پھر اُس کو
لگا تھا کہ ملک انوار اوپر سے سر کے بل گلی میں گرا۔ اُس کو یہ پتہ نہیں تھا کہ میں وہاں کیا
آیا ہوں اور مجھ کو کیا شبہ ہے۔ میں نے چوہدری اختر حسین کو بالکل نہ بتایا کہ مجھ کو ملک
کی بیویوں پر شبہ ہے۔

میرا یہ دوست انگریزی فلموں کا شوقین تھا۔ اُس قصبے میں ابھی سینما ہال بنا ہی
تھا۔ فلموں کے شوقین ضلعے کے شہر میں فلمیں دیکھنے جایا کرتے تھے۔ چوہدری اختر بھی
کبھی کوئی اچھی انگریزی فلم لگے تو جا کر دیکھ آتا تھا۔ یہ وہی شہر تھا جہاں ملک انوار ڈپٹی

کے دفتر میں سٹینو گرافر تھا۔ اس شہر میں چھاؤنی بھی تھی۔ چھاؤنی میں گوروں کی فوج بھی رہتی
تھی اس واسطے وہاں انگریزی فلمیں زیادہ چلتی تھیں۔ چوہدری اختر نے مجھ کو بتایا کہ اُس
نے پندرہ بیس روز پہلے شہر جا کر ایک انگریزی فلم دیکھی تھی جو جرم اور سراغ رسانی کی کہانی
پر بنائی گئی تھی۔

اُس نے اس انگریزی فلم کا نام بھی بتایا تھا جو میں آج بالکل ہی بھول گیا ہوں۔
چوہدری اختر نے مجھ کو اس فلم کی کہانی سنائی۔ یہ کہانی یونان کے کسی چھوٹے سے قصبے کی
تھی۔ وہاں کے مکان اور محلے ہمارے مکانوں اور محلوں جیسے ہوتے تھے یعنی مکان ایک
دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے تھے۔ کہانی یہ تھی کہ ایک نوجوان لڑکی ایک لڑکے کے
ساتھ محبت کرتی تھی اور اُسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی لیکن باپ اس کو اجازت نہیں دیتا
تھا اور لڑکی کی شادی کہیں اور کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی کی ماں لڑکی کی پسند کو اچھا سمجھتی تھی لیکن
باپ بہت ہی غصیلا اور سخت طبیعت کا تھا۔ وہ مانتا ہی نہیں تھا۔ لڑکی اس لڑکے سے ملتی ملاتی
رہتی تھی۔

لڑکی اپنے ماں باپ کی واحد اولاد تھی۔ ایک بار لڑکی کی ماں کو کوئی شدید تکلیف ہو گئی
اور اُس کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ اِدھر گھر میں رات کو لڑکی نے باپ کو جگایا اور کہا کہ
اوپر چھت پر اس کو کسی کے چلنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ باپ کو بھی آوازیں آئیں۔ یہ لڑکی
کا بیان تھا۔ باپ اوپر چلا گیا اور بالکل ملک انوار جیسا واقعہ ہوا کہ اس کی لاش ساتھ والی گلی
میں پائی گئی۔

لڑکی نے پولیس کو یہی بیان دیا جو میں نے سنایا ہے۔ پولیس نے تفتیش اور سراغ
رسانی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چوہدری اختر نے بتایا کہ باقی ساری کہانی تفتیش اور سراغ
رسانی کی ہے جو بہت ہی دلچسپ ہے۔ آخر میں یہ ہوتا ہے کہ بیٹی ہی پکڑی جاتی ہے اور یہ
ثابت ہوتا ہے کہ لڑکی نے اپنے باپ کو کس طرح قتل کیا تھا۔ وہ دراصل سویا ہوا تھا اور بیٹی
نے اس کے منہ اور ناک پر تکیہ رکھ کر اوپر سے دباؤ ڈالا اور باپ دم گھٹنے سے مر گیا۔

لڑکی نے ٹیلیفون کر کے لڑکے کو بلا لیا جس کے ساتھ وہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ لڑکا
آیا۔ دونوں نے مل کر لاش اٹھائی اور چھت پر لے جا کر گلی کی طرف پھینک دی۔ لڑکا اپنے
گھر چلا گیا اور لڑکی نے پولیس سٹیشن ٹیلی فون کر کے پولیس کو بلا لیا اور یہ بیان دیا جو میں
پہلے سنا چکا ہوں۔ پولیس نے اوپر جا کر دیکھا تو اس کو ویسے ہی شکوک اور شبہے ہوئے جو مجھ

کو اس واردات میں ہوئے تھے۔ آخر یہ سراغ ملا کہ باپ کو لڑکی نے خود ہی قتل کیا۔ اپنے محبوب لڑکے کو بلا کر لاش اوپر سے پھینکی تھی۔ دونوں کو عمر قید کی سزا دی گئی۔

''میں تمہیں یہی بات سنانے آیا تھا''۔۔۔ چوہدری اختر نے کہا۔۔۔ ''ملک انوار قتل کی واردات ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ میں تمہیں ایک بڑے ہی کام کی بات سنا ہوں، اس پر غور کرو۔ یہ خیال رکھنا کہ کسی کو یہ پتہ نہ لگے کہ یہ بات میں نے تمہارے میں ڈالی ہے...... تمہیں یہ بات دلچسپ بھی لگے گی اور تم میری طرح حیران بھی ہوگے کیسے کیسے اتفاق ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ملک انوار کی چھوٹی بیوی ایک نوجوان کو چاہتی ہے۔ یہ نوجوان اس لڑکی کو اس طرح چاہتا ہے کہ اس پر جان بھی قربان کر تیار رہتا ہے۔ عجیب وغریب اتفاق یہ ہے کہ یہ نوجوان ملک انوار کی پہلی بیوی کا چھوٹا ہے۔ بڑا خوبرو نوجوان ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی محبت فلموں اور ناولوں نہیں اور یہ ناپاک محبت بھی نہیں۔ ان کی شادی ہو سکتی تھی لیکن لڑکی کا باپ لالچی آدمی اور وہ ملک انوار کا احسان مند بھی تھا اس واسطے اُس نے نوجوان بیٹی ملک انوار کو دی''۔

''کیا شادی کے بعد بھی ان دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں؟''۔۔۔ میں پوچھا۔

''اب تو ملاقاتیں پہلے سے زیادہ آسان ہو گئی تھیں''۔۔۔ چوہدری اختر نے کہا۔۔۔ ''یہ نوجوان حمید، ملک انوار کا سالا تھا۔ یہ تو ملک انوار کے گھر کسی بھی وقت اور دن میں ہی بار جا سکتا ہے۔ یہ اس کی بہن کا گھر ہے۔ میرے دو دوستوں نے مجھ کو بتایا تھا کہ حمید کی موج لگ گئی ہے، وہ تو اب ہر روز ملک انوار کے گھر جاتا ہے۔ ملک انوار تو ڈیوٹی پر شہر گیا ہوا ہوتا تھا۔ حمید کی بہن کو ان کی محبت کا صرف علم ہی نہیں بلکہ وہ بھی چاہتی کہ ان دونوں کی شادی ہو جائے۔ اب تو وہ خود ان کو ملاقات کا موقع دیتی ہوگی''۔

اس عزیز اور بے تکلف دوست نے واقعی مجھ کو بڑے ہی کام کا سراغ مہیا کر دیا میں نے اس سے کچھ اور باتیں اس معاملے کے ساتھ تعلق رکھنے والی معلوم کر چوہدری اختر کو جو کچھ بھی معلوم تھا اور جو مشاہدہ اس نے خود کیا تھا، وہ سارے کا سارا سنا دیا۔ اس نے حمید کے دو بے تکلف اور گہرے دوستوں کے نام بھی بتائے اور کہا ان مجھ کو مزید باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔

''اب یہ سوچ لو محبوب!''۔۔۔ چوہدری اختر نے کہا۔۔۔ ''کہیں بھی اور کسی بھی موقع پر میرا نام ظاہر نہ ہو۔ میری سلام دعا ہر کسی کے ساتھ ہے اور سب میری عزت کرتے ہیں''۔

وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ میرا تھانے میں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔

سچا پیار بولتا ہے

اُس روز میں نے یہ کارروائی کی کہ اپنے خاص مخبروں کو بلایا۔ ان میں سے ایک تو ملک انوار کے محلے کا ہی رہنے والا تھا اور دوسرا اس محلے سے ذرا دور رہتا تھا۔ وہ جب آئے تو میں نے دونوں کو اکٹھے بٹھا لیا اور ان سے حمید اور مقتول کی نئی بیوی کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے چوہدری اختر جیسی ہی باتیں بتائیں اور یہ بھی کہا کہ اس لڑکی کی شادی ملک انوار کے ساتھ ہو گئی تو حمید ہر روز وہاں جاتا تھا۔ اس گھر میں جانے سے اُس کو کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا، اس واسطے کہ یہ اُس کی بڑی بہن کا گھر تھا۔

حمید خوشحال اور اچھی حیثیت والے خاندان کا بیٹا تھا۔ اُس کی یہ محبت خاصی مشہور ہو گئی تھی۔ سب کو یہ امید تھی کہ ان کی شادی ہو جائے گی لیکن لڑکی کے باپ نے کوئی اور ہی منظر دکھا دیا۔

میں نے اور میرے استاد جناب احمد یار خان صاحب نے اپنی تفتیشی کہانیوں میں مخبروں کے سلسلے میں اکثر معزز مخبروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ میں اس کو دہرانا نہیں چاہتا صرف یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ پولیس کے مخبروں میں بڑی اونچی حیثیت والے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ معزز حضرات تھانیدار کی خوشنودی کے طلبگار ہوتے ہیں۔ شام کو ان میں سے ایک میرے پاس آ گیا۔ میں حیران تھا کہ یہ معزز مخبر خود ہی آ جایا کرتے تھے مگر شام ہونے کو آ گئی تو یہ ایک ہی میرے پاس آیا۔ اُس سے بات ہوئی تو مجھ کو وجہ معلوم ہو گئی کہ یہ حضرات کیوں نہیں آئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ سب ملک انوار کے جنازے کے ساتھ چلے گئے تھے۔ یہ مخبر قبرستان سے سیدھا میرے پاس آ گیا تھا۔

اس شخص کو معلوم نہیں تھا کہ میں ملک انوار کے گھر سے اور اُس کے گھر کی چھت سے کیسے کیسے شبہے لے کر آیا ہوں۔ اُس نے ملک انوار کی دوستیوں اور دشمنیوں کی باتیں شروع

کر دیں۔ ان میں کوئی ایک بھی بات میرے کام نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے اس سے پ
کہ ملک انوار کی چھوٹی بیوی کے بارے میں اُس کا کیا خیال ہے۔ تب اُس نے حمید اور
لڑکی کی محبت کی باتیں شروع کر دیں اور یہ باتیں بالکل ویسی ہی تھیں جیسی چوہدری اختر
دو مخبر مجھ کو سنا گئے تھے۔ اُس نے فالتو بات یہ سنائی کہ عورتوں میں مشہور ہو گیا ہے کہ حمید ا
بہن کو ملنے کے بہانے وہاں جاتا ہے اور بہن ان دونوں کو الگ کمرے میں بٹھا کر درو
بند کر دیتی ہے اور خود صحن میں اس طرح موجود رہتی ہے جیسے کوئی کام کر رہی ہو لیکن
دراصل پہرہ دے رہی ہوتی ہے۔

میں مخبروں کی اور زیادہ کوئی بات نہیں سناؤں گا۔ اب یہ سناؤں گا کہ میں اس مسئلے
سوچنے بیٹھ گیا کہ یہی باتیں حمید کی زبانی اور حمید کی بڑی بہن کی زبانی کس طرح سنو
ایک طریقہ تو یہ تھا کہ حمید کو بلا لیتا اور سیدھا اس پر حملہ کر دیتا لیکن سوچ سوچ کر مجھ
طریقہ ٹھیک معلوم نہ ہوا۔ مجھ کو کوئی استادی طریقہ اختیار کرنا تھا۔ میں نے رات کو
آرام کیا اور تفتیش اگلے دن پر ڈال دی۔

میں اگلی صبح ذرا جلدی تھانے پہنچ گیا اور سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ملک انوار کی چ
بیوی کو تھانے بلوایا...... وہ کانسٹیبل کے ساتھ ہی آ گئی اور اس کے ساتھ اس کا بڑا بھائی تھا
میں نے دونوں کو اپنے پاس بٹھا کر بڑے جھوٹ بولے۔ میں نے کہا کہ میں دو تین دن
میں اصل قاتل پکڑ لوں گا۔

''مجھ کو خفیہ رپورٹیں مل رہی ہیں'' ــــ میں نے کہا ــــ ''یہ ملزم جو چھت پر آیا تھا
خطرناک ڈاکو تھا۔ ابھی اس کا پورا نام اور پتہ وغیرہ نہیں ملا۔ وہ اس شہر میں نیا نیا آیا ہے
میں اس کو جلدی پکڑ لوں گا''۔

یہ دونوں مطمئن ہو گئے کہ میں بڑی محنت سے تفتیش کر رہا ہوں۔ ان کو اس طرح
جھوٹی تسلیاں دے کر میں نے اس عورت کے بھائی کو کہا کہ وہ ذرا باہر بیٹھے اور تھوڑی
بعد اپنی بہن کو ساتھ لیتا جائے، میں نے اس سے دو تین باتیں پوچھنی ہیں۔ وہ باہر جا
برآمدے میں بیٹھ گیا۔

''میں تم کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا'' ــــ میں نے ملک انوار کی بیوی کو کہا
''لیکن واردات اتنی سنگین ہے کہ اس کی تفتیش میں کوئی پتہ نہیں ہوتا کس وقت کس
ضرورت پڑ جائے۔ میں نے تم سے دو تین باتیں پوچھنی ہیں''۔

میں دراصل اس عورت کو ایک جال میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری استادی
تب ہی کامیاب ہو سکتی تھی کہ اس کو ذرا جتنا بھی شبہ نہ ہو کہ میں اس پر شبہ کر رہا ہوں۔
میں نے اُس سے ویسے ہی کچھ اوٹ پٹانگ سے سوال کئے اور وہ جواب دیتی رہی۔ اُس کو
میں نے پھر تسلی دی کہ قاتل جلدی پکڑا جائے گا۔ میں اُس کے چہرے کو بھی غور سے دیکھتا
تھا کہ کس بات پر اُس کے چہرے پر کچھ تبدیلی آتی ہے۔ میں نے یہ نوٹ کیا کہ اُس کے
چہرے سے گھبراہٹ اُتر گئی تھی اور اس کی جگہ رونق سی آ گئی تھی۔ اس طرح کچھ اِدھر اُدھر کی
اور کچھ بے معنی باتیں کرتے کرتے اس کو بے تکلفی میں لے آیا۔

''ماکانی جی!'' ــــ میں نے کہا ــــ ''یہ تو تھیں تفتیش اور واردات کی باتیں۔ یہ میں
یہیں پر ختم کرتا ہوں اور اب میں کچھ باتیں اس طرح کروں گا جیسے میں تھانیدار نہیں ہوں
بلکہ تمہارا ہمدرد ہوں اور تمہارے معاملات میں میری بھی کوئی دلچسپی ہے۔ میں تمہارے اس
اخلاق سے بہت متاثر ہوا ہوں کہ تم نے اپنی سوکن کو ماں بن کر گلے لگایا اور اس کی دل جوئی
کرتی رہیں۔ یہ اتنی بڑی نیکی ہے جو کوئی اور عورت نہیں کر سکتی۔ تم خاندانی خاتون ہو اور
تمہارا ایمان بڑا مضبوط ہے۔ بات یہ ہے کہ اب اس لڑکی کو اپنے بھائی حمید کے ساتھ فوراً بیاہ
دو''۔

میری اس بات پر وہ اس طرح چونکی کہ اُس کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی کھل گئیں اور
اُس نے مجھ کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھا۔

''میں تھانیدار ہوں'' ــــ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ــــ ''مجھ سے کسی بھی گھر کے
اندر کی باتیں پوچھ لو۔ مجھ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہاری سوکن اور حمید کی آپس میں بڑی
گہری محبت ہے اور ان کی شادی ہونی تھی مگر لڑکی کے باپ نے لالچ میں آ کر نوجوان لڑکی
چالیس بیالیس سال کے آدمی کے ساتھ بیاہ دی۔ تم اب یہ کوشش کرو کہ حمید کی اور اس لڑکی
کی فوراً شادی ہو جائے ورنہ مجھ کو ڈر ہے کہ لڑکی کا لالچی باپ کسی اور بوڑھے سے رقم لے کر
بیٹی کو اس کے ساتھ بیاہ دے گا''۔

''میں کوشش تو یہی کروں گی'' ــــ اُس نے کہا ــــ ''لیکن میری بات نہ چلی تو پھر
سمجھ نہیں آتی کیا کروں گی۔ اپنے بڑے بھائی کو بھی کہوں گی کہ وہ بھی کوشش کرے''۔

''میں تمہاری مدد کروں گا'' ــــ میں نے کہا ــــ ''اگر لڑکی کا یہ لالچی باپ نہ مانے تو
اپنے بھائی کو میرے پاس بھیج دینا کہ لڑکی کا باپ نہیں مانتا، پھر میں اس شخص کو تھانیداری

کے رعب میں لا کر منوالوں گا۔ میں دیکھوں گا کہ وہ کس طرح نہیں مانتا...... میری اس بات پر حیران نہ ہونا کہ میں تمہارے بھائی میں اور اس لڑکی میں اتنی دلچسپی لے رہا ہوں۔ میں تھانیدار ضرور ہوں لیکن انسان بھی ہوں اور مجھ سے دیکھا نہیں جاتا کہ ایک کم عمر لڑکی کو ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا گیا اور وہ سات آٹھ مہینوں بعد ہی بیوہ ہوگئی جبکہ وہ اپنی مرضی کے ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ تمہاری طرح میں بھی یہ نیکی کرنا چاہتا ہوں''۔

میں نے اُس کے ساتھ یہی دو تین باتیں نہیں کی تھیں۔ یہ تو آپ کو کہانی سمجھانے کے واسطے مختصر سی باتیں لکھ دی ہیں۔ اُس کے ساتھ ذرا لمبی گفتگو ہوئی تھی اور میری یہ چال کامیاب ہوتی نظر آ رہی تھی۔ وہ واقعی مجھ کو اپنا ہمدرد سمجھنے لگی تھی۔ میں نے باتوں باتوں میں اُس کے منہ سے یہ بھی اُگلوا لیا کہ حمید روزانہ اُس کے گھر جاتا تھا اور اس لڑکی کے پاس الگ کمرے میں کچھ وقت گزار آتا تھا۔ اس عورت کے ساتھ میری یہ ملاقات بڑی ہی فائدہ مند رہی اور میں اُس کا دل جیتنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے اس سے جو کچھ بھی حاصل کرنا تھا وہ کر لیا اور اس کو کہا کہ وہ اب گھر چلی جائے لیکن کسی کے ساتھ ایسی بات نہ کرے کہ میں نے اُس سے کیا کچھ پوچھا تھا اور کیا کہا تھا۔ وہ چہرے پر خوف، گھبراہٹ اور اداسی لے کر آئی تھی لیکن جب مجھ سے رخصت ہوئی تو اُس کے چہرے پر سکون اور اطمینان تھا۔ میں اس سکون اور اطمینان کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔

وہ اپنے بھائی کے ساتھ چلی گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے ایک عقلمند سے کانسٹیبل کو بلایا اور اُس کو حمید کا نام بتا کر کہا کہ اس کو اپنے ساتھ تھانے لے آئے۔

حمید آ گیا۔ وہ چوہدری اختر کے کہنے کے مطابق واقعی خوبرو نوجوان تھا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی جو میں نے دوستانہ لہجے میں باتیں کر کے اُتار دی۔

''اس واردات کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں حمید!''—— میں نے کہا—— ''اس واردات کو الگ رکھ دو۔ میں تمہارے ساتھ کوئی اور بات کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارا یہ بہنوئی ملک انوار بے وقوف آدمی تھا۔ اُس نے اس عمر میں ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ مجھ کو اچھی طرح پتہ ہے کہ اس لڑکی کی شادی تمہارے ساتھ ہونی تھی لیکن لڑکی کا باپ لالچ میں آ گیا اور اس نے اپنی لڑکی تمہارے بہنوئی کے ہاتھ بیچ ڈالی۔ تمہاری بہن نے اس لڑکی کو اپنی بیٹی سمجھ کر گلے لگا لیا۔ میں خود ایسی ہی نیت کا آدمی ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ

تمہاری شادی اس لڑکی کے ساتھ ہو جائے۔ تمہارا بڑا بھائی اور بہن میرے پاس آئے تھے۔ میں نے ان کو کہا ہے کہ وہ تمہاری شادی اس لڑکی کے ساتھ جلدی کرا دیں ورنہ لڑکی کا باپ کسی اور بوڑھے سے رقم پکڑ کر لڑکی کو اُس کے حوالے کر دے گا''۔

''لیکن وہ مانے گا نہیں''—— حمید نے کہا۔

''میں نے تمہاری بہن کو کہہ دیا ہے کہ یہ شخص نہ مانے تو مجھ کو بتانا''—— میں نے کہا —— ''اُس کو ایک منٹ میں سیدھا کر لوں گا۔ دیکھتا ہوں وہ کس طرح نہیں مانتا...... اور تم حمید! یہ نہ سوچنا کہ میں تمہارا ہمدرد کیوں بن گیا ہوں۔ میں تھانیدار ہوں۔ یہ بھی میرا فرض ہے کہ کسی کی زندگی تباہ ہونے کی صورت بن رہی ہے تو ایسی صورت کو روکوں تاکہ آئندہ کوئی فساد نہ ہو۔ ویسے بھی میرے دل میں انسانی ہمدردی موجود ہے''۔

یہ نوجوان میری باتوں میں آ گیا اور مجھ کو اپنا سچا ہمدرد سمجھ بیٹھا۔ باتیں کرتے کرتے میں اس کے ساتھ اس طرح بے تکلف ہو گیا جیسے میں اس کا ہم عمر تھا۔ وہ میرے ساتھ بے تکلفی کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھ کو اس کی محبت کا پتہ کس طرح لگا ہے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ مجھ سے یہ بھی پوچھ لے کہ اس لڑکی کی شادی کے بعد وہ کس طرح اور کہاں اُس کو ملتا رہا ہے اور اس کے بعد کیا کچھ ہوا ہے۔ میں نے اس کو ہوا دینی شروع کر دی اور کہا کہ میں اس کے اخلاق کی تعریف کرتا ہوں کہ وہ تنہائی میں لڑکی سے ملتا رہا ہے لیکن اس نے محبت کو داغدار نہیں ہونے دیا۔ میری اس تعریف سے وہ بالکل ہی موم ہو گیا اور میں اس کو اپنے سانچے میں ڈھالنے لگا۔ وہ مجھ کو اپنا بے تکلف دوست سمجھ بیٹھا اور ایسے اطمینان اور آرام سے بیٹھ گیا جیسے میں اس کو کہوں گا کہ اب چلے جاؤ تو بھی وہ نہیں جائے گا۔

وہ ایف اے پاس تھا جو اس زمانے میں خاصی زیادہ تعلیم سمجھی جاتی تھی۔ وہ کسی اچھی نوکری کی تلاش میں تھا۔ میں اُس کو فلموں کی طرف لانا چاہتا تھا اور میں نے معلوم یہ کرنا تھا کہ اس نے وہ فلم دیکھی ہے یا نہیں جس کا حوالہ میرے دوست چوہدری اختر نے دیا تھا۔

''تمہیں اچھی نوکری مل سکتی ہے، میں دلا دوں گا''—— میں نے اُس کو جھوٹی تسلی دیتے ہوئے کہا—— ''انگریزی زبان پر عبور حاصل کر لو جس کا طریقہ یہ ہے کہ انگریزی اخبار پڑھا کرو اور شہر جا کر کبھی کبھی انگریزی فلم دیکھ لیا کرو۔ فلموں کے مکالمے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس طرح تمہاری انگریزی اتنی اچھی ہو جائے گی کہ جس انگریزی افسر کے

سامنے جاؤ گے وہ تم کو بڑی اچھی نوکری دے دے گا..... کبھی انگریزی فلم دیکھی ہے؟''

''ہاں صاحب!''—— اُس نے جواب دیا—— ''اردو کی فلمیں تو دیکھتا ہی رہتا ہوں لیکن کبھی کبھی انگریزی فلم بھی دیکھ لیتا ہوں''۔

''ہاں، یاد آیا''—— میں نے کہا—— ''پندرہ بیس روز پہلے میں ایک انگریزی فلم دیکھنے گیا تھا اور تم کو وہاں دیکھا تھا''—— میں نے اُس فلم کا نام لیا اور یہ ایک تیر تھا جو میں نے ہوا میں چلایا—— ''تم نے وہ فلم دیکھی تھی، بہت اچھی فلم تھی، تم کو بھی پسند آئی ہوگی''۔

میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ ہی اُڑ گیا اور اس کی آنکھوں میں بھی کوئی اور ہی تاثر آ گیا۔ یہ تبدیلیاں ایسی ہوتی ہیں جو صرف تجربہ کار افسر ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اس نے اچانک بیدار ہو کر کہا—— ''ہاں جی میں نے وہ فلم دیکھی تھی''۔

میں اُس کی زبان سے یہی سننا چاہتا تھا۔ اس کے چہرے پر اس فلم کے نام سے جو تبدیلی آئی تھی، وہ میرے واسطے ایک شہادت اور ایک ثبوت تھا لیکن مجھ کو ٹھوس شہادت اور ثبوت کی ضرورت تھی۔ کورٹ میں جج یہ تسلیم نہیں کیا کرتے کہ فلاں وقت ملزم کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ میں نے اب اس خوبرو نوجوان کے اندر سے یہ راز اس کی زبان پر لانا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اُس کو ابھی جکڑ لوں تو ٹھیک ہے۔ اگر اُس کو چھٹی دے دی تو معاملہ گڑ بڑ ہو سکتا ہے۔

''حمید بھائی!''—— میں نے کہا—— ''تم نے دیکھ لیا ہے کہ میں تمہارے واسطے کیا کر رہا ہوں۔ اُس لڑکی کو تمہارے ساتھ بیاہ دوں گا اور بڑی اچھی نوکری دلواؤں گا لیکن ایک شرط ہے جو پوری کر دو گے تو تمہارے وارے ہی نیارے ہو جائیں گے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہاری بڑی بہن کو بلایا تھا؟''

''ہاں جی!''—— اس نے جواب دیا—— ''مجھ کو معلوم ہے''۔

''تمہاری بہن کے ساتھ بات ہو چکی ہے''—— میں نے کہا—— ''اس نے کہا تھا کہ حمید کو بلا لیں اور وہ ساری بات بتائے گا''۔

''کون سی بات جناب؟''—— حمید نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا اور ذرا ہکلا کر بولا—— ''مجھ کو تو کسی ایسی ویسی بات کا علم نہیں''۔

بے وقوف لڑکا یہ نہ سمجھ سکا کہ اُس نے جس انداز سے بات کی ہے، یہ انداز اس کے اوپر سے پردے اٹھا رہا ہے۔

''یہی بات یار!''—— میں نے بے تکلف دوستوں کی طرح کہا—— ''ملک انوار کے قتل کی بات ...... اس نے ایک دن مرنا ہی تھا، اس طرح مارا گیا ہے تو کیا ہوا...... اس نے دو عورتوں کی زندگی برباد کر دی تھی۔ نقص اس کے اپنے جسم میں تھا اور قصوروار تمہاری بہن کو بناتا تھا''۔

''مجھ کو تو بہت افسوس ہے صاحب!''—— حمید نے کہا۔

''جانے دو یار!''—— میں نے مسکراتے ہوئے کہا—— ''مجھ سے اب سیدھی بات سن لو اور گھبرانا بالکل نہیں۔ صرف میں جانتا ہوں کہ ملک انوار کو نیچے کمرے میں سانس روک کر قتل کیا گیا تھا اور اس کی لاش اوپر لے جا کر گلی میں پھینکی گئی تھی۔ میں یہ بات صرف تم کو بتا رہا ہوں۔ میں نے کاغذوں میں یہ لکھ لیا ہے کہ وہ کوئی چور تھا جو ملک انوار کو مار گیا ہے۔ اس کے بعد میں تفتیش کو لٹکاتا اور ٹالتا چلا جاؤں گا اور آخر اس کو بالکل ہی غائب کر دوں گا''۔

میں حمید کو دیکھ رہا تھا، وہ تو بہت ہی بے چین ہو گیا تھا اور کرسی پر بار بار کروٹ بدلتا تھا۔ اُس کا چہرہ اس کے خلاف گواہی دے رہا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ کوئی بات کی تو وہ منہ کھول کر مجھ کو دیکھتا رہا لیکن اس کی زبان پر ایک لفظ بھی نہ آیا۔

''تم اب گھبراؤ نہیں''—— میں نے کہا—— ''اپنی خوشی کو اپنے چہرے پر قائم رکھو۔ میں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ تم کو بیاہ دوں گا لیکن ایک بات بہت ہی ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ تم اپنی زبان سے بتا دو کہ ملک انوار کو تم سب نے کس طرح قتل کیا تھا''۔

اُس نے کرسی پر ذرا سا اچھل کر اس الزام سے انکار کیا لیکن اس کے منہ سے کوئی ایک بھی لفظ صاف نہیں نکل رہا تھا۔ میں انکار کی مختلف قسموں سے واقف تھا۔ ایک انکار بالکل سچا ہوتا ہے اور ایسا انکار کرنے والا آدمی کچھ اور طرح کی حرکتیں کیا کرتا ہے۔ ایک انکار بالکل جھوٹا ہوتا ہے۔ اگر جرائم پیشہ آدمی مجرم ہو کر انکار کرے تو اس کا انداز کچھ اور طرح کا ہوتا ہے۔ ہر ملزم کا الگ الگ طریقہ ہوتا ہے لیکن حمید کا جو انداز تھا، اس کو میں بڑا ٹھیک ٹھاک سمجھتا تھا۔ میں حمید کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر دفتر سے باہر گیا اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ وہ ملک انوار کی دونوں بیویوں کو تھانے لے آئے اور ان کو الگ الگ بٹھا دے۔ ہیڈ کانسٹیبل چلا گیا اور میں اپنے دفتر میں آ بیٹھا۔

''ہاں حمید بھائی!''— میں نے کہا— ''اب بات کرو اور میں تمہاری چھٹی کر دوں''۔

''میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا''— اُس نے کہا— ''اگر ملک انوار قتل ہو گیا ہے تو اس میں مجھ پر کیوں الزام آتا ہے؟''

''تم کو میری دوستی قبول نہیں''— میں نے کہا— ''ایک بات سن لو۔ اگر میں نے ثبوت اور شہادت پیش کر کے تم کو یہ بتایا کہ تم پر کیوں الزام آتا ہے تو پھر میری تمہاری دوستی ختم ہو جائے گی اور تم سیدھے پھانسی کے تختے پر جاؤ گے۔ اب زبان سے بتا دو گے تو میں نے تم کو پہلے ہی بتایا ہے کہ یہ کیس تھانے میں ہی دفن ہو جائے گا''۔

''ذرا خود ہی سوچیں جناب!''— اُس نے کہا— ''میں بھلا اپنے بہنوئی کو کس طرح قتل کر سکتا ہوں؟''

''میں تمہیں بتاؤں گا تم نے اپنے بہنوئی کو کس طرح قتل کیا ہے''— میں نے کہا— ''تم نے اپنے بہنوئی کو بالکل اُسی طرح قتل کیا ہے جس طرح تم نے اس انگریزی فلم میں دیکھا تھا۔ تم نے قتل کا طریقہ تو دیکھ لیا تھا لیکن یہ ذہن سے اتار دیا کہ اُن قاتلوں کا انجام کیا ہُوا تھا۔ پولیس سے کوئی بات چھپائی نہیں جا سکتی...... میں تم کو سوچنے کی مہلت نہیں دوں گا۔ تم میری بات نہیں سمجھ رہے تو مجھ کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ میں تمہارا ہمدرد بنا رہوں''۔

وہ تو بڑی ڈھیٹ ہڈی کا بنا ہُوا تھا، انکار پر ہی اڑا رہا۔ میرے پاس پولیس والا سیدھا طریقہ موجود تھا۔ اس کو الگ کمرے میں لے جا کر صرف آدھے گھنٹے میں اقبالی بیان لے سکتا تھا لیکن ایسے بیان کورٹ میں بعض اوقات اُلٹ بھی جایا کرتے ہیں۔ مجھ کو پکی شہادت کی بھی ضرورت تھی۔

میں اس کو باتوں سے رام کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ باتوں کا کوئی اثر قبول نہیں کر رہا تھا۔ وہ کچھ دلیر سا بھی ہو گیا تھا پھر بھی میں نے سوچا کہ تشدد تک نوبت نہ ہی آنے دوں...... کچھ اور وقت گزرا تو ہیڈ کانسٹیبل نے مجھ کو اطلاع دی کہ ملک انوار کی دونوں بیویاں آ گئی ہیں۔ اُس نے مجھ کو یہ اطلاع اس طرح الگ کر کے دی تھی کہ حمید کو پتہ نہ لگ سکا۔ میں نے حمید کو تھوڑی دیر کے واسطے ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے یہ کہہ کر

کر دیا کہ اس کو کہیں الگ کمرے میں بٹھا لے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ملک انوار کی چھوٹی بیوی کو بلایا۔

وہ میرے دفتر میں داخل ہوئی تو اُس کے چہرے پر ویسی ہی گھبراہٹ تھی جو واردات کے سلسلے میں پہلی بار تھانے میں آنے والے کے چہرے پر ہوتی ہے۔ میں نے اس کو کرسی پر بٹھایا اور کچھ باتیں ہمدردی اور تسلی دلاسے کی کیں۔

''کیا تم حمید کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو؟''— میں نے پوچھا۔

وہ مجھ کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی اور بولی کچھ بھی نہیں۔ میں نے اپنا سوال پھر دہرایا اور اُس سے پوچھا کہ ملک انوار کی پہلی بیوی نے اُس کو کچھ نہیں بتایا؟

''ہاں!''— اس نے دبی دبی زبان میں کہا— ''خالہ نے بتایا تھا کہ آپ میری شادی حمید سے کرا دیں گے۔ باقی باتیں بھی بتائی تھیں''۔

''تو پھر تم گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''— میں نے پوچھا۔

''یقین نہیں آتا کہ میری شادی حمید کے ساتھ ہو جائے گی''— اُس نے کہا— ''میری قسمت اتنی اچھی ہو نہیں سکتی''۔

''میری بات سنو''— میں نے کہا— ''پہلے اپنے دل میں یہ رکھ لو کہ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ میں اپنے دل میں خوش ہوں کہ ملک انوار مارا گیا ہے۔ اُس نے پہلی بیوی کی زندگی برباد کی اور تمہاری جوانی برباد کر ڈالی۔ مجھ کو اس کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں۔ میں نے تھانیداری کی کچھ کارروائی ڈالنی ہے لیکن اس میں مجھ کو تمہاری مدد کی اور تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے۔ تم میری بات مان لو گی اور میری بات پر چلو گی تو تمہاری شادی حمید کے ساتھ ہو جائے گی۔ اگر نہیں تو پھر تم کو بہت بُرا نقصان برداشت کرنا پڑے گا''۔

وہ نو عمر گھریلو لڑکی تھی۔ اُس کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کہے یا میری بات پر یقین کرے یا نہ کرے۔ میں نے وہ گدی اپنے دفتر میں رکھی ہوئی تھی جس پر ایک داغ تھا۔ وہ گدی اٹھا کر اس لڑکی کے سامنے رکھ دی۔ وہ گدی کو دیکھ رہی تھی اور میں اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ میں ٹھیک طرح بیان نہیں کر سکوں گا کہ اُس نوجوان اور بھولی بھالی لڑکی کے چہرے پر کیسے کیسے رنگ آئے۔ اُس نے جب سر ذرا اوپر کیا تو اس کی آنکھیں سفید ہو چکی تھیں۔ اُس کے ہونٹ ہلکے نیلے ہو گئے تھے۔ یہ گھبراہٹ کی آخری حد ہوتی ہے۔ اس کے بعد اُس نے بے ہوش ہو جانا تھا۔

''مت گھبراؤ'' ـــ میں نے اُس کے قریب کھڑے ہو کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ـــ ''اس گدی کو دیکھ کر اتنا مت ڈرو کہ تم پر غشی طاری ہو جائے۔ یہ گدی اس واسطے دکھائی ہے کہ تمہارے اور حمید کے درمیان یہ گدی ایک چٹان کی طرح کھڑی ہو گئی ہے۔ اس چٹان کو ایک سچ بول کر ہٹا سکتی ہو''۔

اُس نے سر اوپر کر کے مجھ کو دیکھا اور اب اُس کے چہرے کا کوئی اور ہی رنگ ہو گیا تھا۔ اس کی زبان تو جیسے بالکل ہی بے جان ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک نہیں کئی سوال تڑپ رہے تھے۔

''تم شاید میری بات سمجھ نہیں رہیں'' ـــ میں نے کہا ـــ ''اس راز کو اب تم چھپا نہیں سکتیں کہ اس گدی سے تم لوگوں نے ملک انوار کو مارا ہے اور تم کو یہ طریقہ حمید نے بتایا تھا''۔

''نہیں'' ـــ اُس نے نہیں یوں کہا جیسے بندوق سے اچانک گولی نکل گئی ہو ـــ ''ملک صاحب تو چھت پر کسی کے ساتھ لڑ رہے تھے......''

''یہ بات گھس گئی ہے'' ـــ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ـــ ''اب اس بیان میں کوئی اثر نہیں رہا۔ میں تم کو آخری بار کہتا ہوں کہ سچ بولو گی تو حمید تمہارا ہو گا اور تم اس کا گھر آباد کرو گی۔ جھوٹ بولو گی تو تمہارا گھر جیل خانے کے اندر ہو گا۔ میں تم کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن یہ بھی سن لو۔ حمید تھانے میں موجود ہے۔ وہ بیان دے چکا ہے۔ اُس نے مجھ کو ساری واردات سنا دی ہے۔ میں تمہاری زبان سے یہ بیان سننا چاہتا ہوں۔ میں اس واسطے تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ حمید اور اس کی بہن نے سارا وزن تم پر ڈال دیا ہو اور تم خواہ مخواہ گڑی جاؤ۔ تم معصوم اور بھولی بھالی سی لڑکی ہو، یہ بہن بھائی کہیں تمہاری زندگی برباد نہ کر دیں''۔

''کیا واقعی حمید نے بیان دے دیا ہے؟'' ـــ لڑکی نے بڑے ہی اداس اور مایوس لہجے میں پوچھا۔

''ہاں'' ـــ میں نے کہا ـــ ''اُس کے منہ سے اقبالی بیان سن کر مجھ کو خوشی نہیں ہوئی بلکہ اُس پر مجھ کو غصہ آیا تھا کہ وہ تم کو دھوکہ دے رہا ہے اور تم اپنے دل میں اُس کی محبت پال رہی ہو۔ تم ساری بات بتا دو تا کہ میں کوئی گنجائش نکال کر تم کو اس واردات سے نکال دوں۔ میں تم کو پھر کہتا ہوں کہ اس بہن بھائی نے تم کو پھنسانے کا بندوبست کیا ہے''۔

میں اُس کے پاس کھڑا تھا اور وہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بخدا، آج بھی اس لڑکی کی معصوم سی اور بھولی بھالی سی صورت میرے سامنے ہے۔ لگتا تھا جیسے اس کو باہر کی ہوا بھی نہیں لگی لیکن وہ بڑی ہی سنگین واردات میں ملوث ہو گئی تھی۔ یہ جرم اس کے باپ کا تھا کہ لالچ میں آ کر اس کو ایک پرانی عمر کے آدمی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اگر اس کی شادی حمید کے ساتھ ہو جاتی تو اتنا بڑا جرم نہ ہوتا اور اس لڑکی کی زندگی سنور جاتی۔ اس لڑکی کا ردعمل یہ تھا کہ اس نے لپک کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اپنے سینے پر رکھ کر اور پھر اپنا سر میرے بازوؤں پر رکھ کر اتنا روئی کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ میں نے اس سے اپنے ہاتھ چھڑا کر اس کے سر پر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرے اور تسلیاں دیں لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں تھانیدار تھا اور میرا فرض یہی تھا کہ قاتل یا قاتلوں کو پکڑ کر قانون کے تمام تقاضے پورے کروں۔

آخر وہ ذرا صبر میں آ گئی اور پھر میرے ہاتھ پکڑ کر بھیک مانگنے کے لہجے میں بولی ''کیا آپ مجھ کو چھڑا لیں گے؟''

اگر میں حرامی پن پر اتر آتا تو اتنی خوبصورت اور کمسن لڑکی میری ملکیت تھی۔ میں اس کو جس طرح چاہتا استعمال کر سکتا تھا لیکن اس پر اتنا رحم آیا کہ یہی سوال میں اپنے آپ سے پوچھنے لگا ـــ ''کیا میں اس لڑکی کو اس ذلت سے چھڑا سکتا ہوں؟'' ـــ لیکن میں مجبور تھا۔ میں نے اپنے دل پر خاصا بوجھ محسوس کیا۔

''تم صحیح بات بتا دو'' ـــ میں نے بڑے پیار اور شفقت سے کہا ـــ ''میں تم کو چھڑانے کی پوری کوشش کروں گا لیکن پہلے میں نے یہ دیکھنا ہے کہ حمید اور اس کی بہن نے تمہارے خلاف کیا کیا جھوٹ بولے ہیں''۔

اس نے بڑی لمبی آہ بھری اور آہستہ آہستہ بولنے لگی۔ میں اُس کا بیان اپنے لفظوں میں سنا دوں تو زیادہ بہتر رہے گا، اس واسطے کہ اس کا بیان لمبا تھا اور میں اس سے کچھ باتیں پوچھتا بھی رہا تھا۔ یہ بیان سنانے سے پہلے میں وہ بات ایک بار پھر کہوں گا جو میں نے اس کہانی کے شروع میں کہی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میری تفتیشی کہانی میں آپ کو کوئی خاص بات نہیں ملے گی کہ آپ اس کی تعریف کریں۔ اس میں میرا ابھی کوئی خاص کمال نہیں ہے۔ اس کہانی میں دلچسپ بات یہی آ گئی ہے کہ ایک لڑکے نے ایک انگریزی فلم دیکھی اور جس طریقے سے ایک آدمی کو ایک لڑکی اور لڑکے نے قتل کیا تھا، ہمارے ملک کے لڑکے نے اسی طرح ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اس سے اندازہ کریں کہ آج کل ٹی وی والے انگریزی کے جو

سیریل یا فلمیں دکھاتے ہیں، ان کا ہمارے بچوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ سارے انگر
سیریل جرائم کے ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک اور شبہہ نہیں کہ ہمارے ملک میں جرا
جو اضافہ ہُوا ہے، دوسری وجوہات کے علاوہ اس میں ٹی وی کا بھی بہت عمل دخل ہے۔

وہ انگریزی فلم جس کا ذکر میرے دوست چوہدری اختر نے کیا تھا اور جو حمید نے دیکھی تھی، اس کی پوری کہانی مجھ کو چوہدری اختر نے سنائی تھی اور جو میں نے آپ کو مختصر یہ کہانی سنائی ہے، اس میں ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔ یونان کی اس لڑکی اور لڑکے لڑکی کے باپ کو قتل کرنے کا یہ جو طریقہ سوچا تھا، وہ ان دونوں نے ایک انگریزی ناول پڑھا تھا۔ پولیس نے تفتیش اور سراغ رسانی میں اتفاق سے یہ ناول لڑکی کے گھر میں دیکھ لیا تھا اور ایک پولیس مین نے ویسے ہی اس ناول کی ورق گردانی کی تو اُس کی نظر ایک صفحے پر اٹک گئی۔ پھر اُس نے ناول پڑھا تو کہانی میں قتل کا یہ عجیب وغریب طریقہ لکھا تھا۔ لڑکی نے اور لڑکے نے وہی طریقہ اختیار کیا تھا اور اسی سے دونوں پکڑے گئے تھے۔

اب میں اس لڑکی کے اقبالی بیان کی طرف آتا ہوں ...... یہ تو آپ سن چکے ہیں لڑکی حمید کو اور حمید اس لڑکی کو چاہتا تھا لیکن لڑکی کے باپ نے لالچ میں آ کر اپنی بیٹی ملک انوار کے ساتھ بیاہ دی۔ ملک انوار کی پہلی بیوی نے اس لڑکی کو صرف اس وجہ سے گ لیا تھا کہ وہ اس کے بھائی کی محبوبہ تھی اور اس بھائی کے ساتھ اس عورت کو بہت ہی پیار تھا۔

اب دیکھئے ان تینوں کو ملک انوار کے خلاف کیا کیا شکایت تھی۔ پہلی بیوی کو یہ کہ نقص ملک انوار میں تھا اور وہ الزام بیوی کو دیتا تھا اور پھر ایک نوعمر لڑکی بیاہ لایا۔ لڑکی کی شکایت بالکل صاف ہے کہ وہ چاہتی کسی اور کو تھی لیکن اس کو ایک قسم کا فروخت کر گیا۔ حمید کی شکایت بھی آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔

پہلے تو میں یہ سمجھتا رہا کہ ملک انوار شریف آدمی تھا اور معزز بھی تھا اور اس کا دونوں بیویوں کے ساتھ ٹھیک تھا لیکن اس لڑکی نے بیان دیا کہ وہ شکی مزاج تھا اور ا بیویوں پر شک شبہہ کرتا رہتا تھا۔ اُس کے دل میں نہ پہلی بیوی کی محبت تھی نہ نئی بیوی کی۔ ان دونوں بیویوں کو جسم سمجھتا تھا اور ان جسموں میں سے وہ اولاد پیدا کرنے کا خواہش لیکن یہ خواہش پوری نہیں ہوتی تھی تو وہ ان پر غصہ جھاڑتا تھا۔

حمید اس لڑکی کو ملنے کے واسطے ملک انوار کے گھر جاتا تھا لیکن ان تینوں کی کوشش ہوتی تھی کہ ملک انوار کو پتہ نہ لگے۔ ایک بار اُس کو پتہ نہیں کس طرح یہ معلوم ہو گیا کہ

اُس کے گھر اس کی غیر حاضری میں جاتا ہے۔ ملک انوار نے اُس روز گھر میں بہت ہی اودھم مچایا اور بیویوں کو دھمکیاں دیں کہ پھر کبھی حمید یہاں آیا تو وہ دونوں بیویوں کو طلاق دے دے گا۔ پھر بھی حمید وہاں جاتا رہا۔

قتل سے تین دن پہلے کا واقعہ ہے کہ حمید ملک انوار کے گھر گیا اور حسبِ معمول اُس کی بڑی بہن نے اُس کو اور لڑکی کو کمرے میں بھیج دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ گھنٹہ ڈیڑھ بعد وہ دونوں باہر نکلے تو محلے کی ایک عورت اندر آ گئی جس نے ان دونوں کو کمرے سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ یہ مخبری اسی عورت کی ہی ہو سکتی تھی کہ ملک انوار کو پتہ لگ گیا کہ آج یا کل پھر حمید آیا تھا اور اس کی چھوٹی بیوی کے ساتھ کمرے میں بند رہا تھا۔ ملک انوار نے چھوٹی بیوی کی پٹائی کر دی اور اُس کو یہاں تک کہا کہ میں نے تم کو خریدا ہے اور تم کھرلی پر بندھی ہوئی بکری ہو اور میں جب چاہوں تم کو ذبح کر سکتا ہوں۔ ملک انوار نے یہاں تک ہی بات ختم نہ کی بلکہ حمید کو بلا کر دھمکیاں دیں اور بُرا بھلا کہا۔

ملک انوار سے یہ لوگ اس واسطے ڈرتے تھے کہ وہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں سٹینوگرافر تھا اور اُس کے ہاتھ میں اتھارٹی تھی اور وہ کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ویسے اُس سے کوئی ڈرنے کی وجہ نہیں تھی، وہ تن تنہا آدمی تھا۔

لڑکی بیان دیتے وقت کئی بار روئی اور اُس کو بڑی مشکل پیش آئی کہ اپنے آپ کو کس طرح قابو میں رکھے۔ میں اُس کو جھوٹی تسلیاں دیتا رہا اور جھوٹے وعدے بھی کرتا رہا اور وہ بولتی گئی ...... اُس نے کہا کہ جب ملک انوار نے تینوں کو اس طرح ذلیل و خوار کیا اور دھمکیاں دیں تو حمید نے لڑکی کو کہا کہ وہ ملک انوار کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ لڑکی نے بھی ایسے ہی غصے کا اظہار کیا اور حمید کی تائید کر دی۔ بڑی بیوی کے ساتھ بات ہوئی تو اُس نے بھی غصے میں یہی کہا کہ اس مردود کو زہر پلا دو تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو گا۔ حمید نے اپنی بہن کو بعد میں بتایا، پہلے لڑکی کو بتایا کہ اُس نے ایک انگریزی فلم دیکھی ہے جس میں قتل کا ایسا طریقہ دکھایا گیا ہے کہ پکڑے جانے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ اُس نے یہ طریقہ لڑکی کو سنایا۔ پھر دونوں نے مل کر ملک انوار کی پہلی بیوی کو سنایا۔ اُس وقت ان کی عقل پر غصہ سوار تھا۔ شاید حمید کو وہ بڑا عقلمند بندہ سمجھتی تھیں۔ تینوں نے ایک پلان بنا لیا۔ پلان میں یہ بھی شامل تھا کہ ملک انوار مارا گیا تو اُس کی جائداد دونوں بیویاں آپس میں بانٹ لیں گی اور حصہ برابر برابر ہو گا۔ اس طرح غصے کے ساتھ ساتھ جائداد کا لالچ بھی شامل ہو گیا۔

واردات کی رات وقت مقرر کر دیا گیا تھا۔ ملک انوار رات سونے سے پہ
والی سیڑھیوں کا دروازہ اور حویلی کا باہر والا دروازہ خود دیکھا کرتا اور بند کر دیا کرتا
رات بھی اُس نے دونوں دروازوں کی زنجیریں خود چڑھائی تھیں۔ واردات
سے کچھ پہلے حمید نے اس گھر میں آنا تھا۔ ملک انوار چھوٹی بیوی کے کمرے میں جا
تو پہلی بیوی نے جا کر باہر والا دروازہ کھول دیا۔ اس کی زنجیر اتار دی، ویسے کواڑ بند

حمید وقت پر پہنچ گیا اور وہ ڈیوڑھی میں ہی چھپ گیا۔ ملک انوار گہری نیند
اور واردات کے وقت وہ پیٹھ کے بل تھا۔ لڑکی آہستہ سے اٹھی اور گدی کری
اُس وقت پہلی بیوی ننگے پاؤں کمرے میں آ چکی تھی۔ اس نے ڈیوڑھی میں جا کر حمید
کہ وہ آ جائے۔ حمید ننگے پاؤں آیا تھا تا کہ قدموں کی آہٹ نہ سنائی دے۔ اب
ملک انوار کے کمرے میں تھے۔ حمید نے لڑکی کے ہاتھ سے گدی لے لی اور جس طر
نے فلم میں دیکھا تھا اس طرح گدی ملک انوار کے منہ پر رکھ کر اوپر سے دونوں ہاتھو
دباؤ ڈالا۔ ملک انوار تڑپنے لگا تو دونوں بیویوں نے اُس کی ٹانگیں پکڑ کر دبا لیں۔

تین منٹ گزرے ہوں گے کہ ملک انوار کا تڑپنا بالکل بند ہو گیا۔ حمید نے گد
اور اُس کی ناک کے آگے انگلی رکھی پھر اُس کی دونوں نبضیں دیکھیں اور پھر دل پر
اور پھر سر سے اشارہ کیا کہ ختم ہو گیا ہے۔ اب لاش کو اوپر لے جانا تھا۔ حمید نے لا
کندھے پر اس طرح ڈالی کہ لاش کا سر پیٹھ کی طرف اور ٹانگیں آگے کی طرف تھیں
زیادہ تھا اس لئے حمید کو سیڑھیاں چڑھنے میں دشواری ہوئی۔ دونوں بیویوں نے
کہ تینوں مل کر لاش کو اٹھاتے ہیں۔

حمید نے لاش کندھے سے اتاری اور تینوں نے اس کو اٹھایا اور سیڑھیاں چڑ
وہاں سے وہ چھت کے پرنالے والے کونے تک گئے اور فصیل کے اوپر سے لاش
نیچے پھینکی کہ لاش کا سر نیچے کو رکھا۔ ظاہر ہے کہ لاش سر کے بل گلی میں گری۔

پلان کے مطابق دونوں بیویوں نے شور شرابہ کیا اور محلے والے آ گئے
دونوں بیویوں نے جو ڈرامہ کھیلا وہ میں پہلے سنا چکا ہوں۔

لڑکی کے بیان کے بعد میں نے حمید اور اس کی بڑی بہن سے بھی اقبالی
لئے۔ اقبالی بیان دے دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ پوری شہادت پیش

ہے۔ ملزم بعض اوقات اقبالی بیان دے کر سیشن کورٹ میں منحرف بھی ہو جایا کرتے ہیں۔
میں نے بڑی محنت سے مقدمہ تیار کیا۔ بہت کوشش کی کہ اس نوعمر لڑکی کو اس میں سے نکال
سکوں لیکن کوئی صورت نہیں تھی۔ میرے پاس وعدہ معاف گواہ بنانے کی گنجائش تھی لیکن یہ
بھی ممکن نہیں تھا۔ کیس کورٹ میں گیا اور یہ مقدمہ چلتا رہا آخر تینوں کو عمر قید کی سزا دی گئی۔
تینوں نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی لیکن اپیل مسترد ہو گئی اور سزا بحال رہی۔

❋ ❋ ❋

دِلوں کے بھیدی

یہ واردات مشرقی پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبے کی ہے۔ قصبہ تو چھوٹا سا لیکن یہاں آڑھت کی بہت بڑی منڈی تھی اور یہ مین لائن کا ریلوے سٹیشن بھی تھا۔ منڈی اناج کی اور دالوں وغیرہ کی تھی۔ مسلمان آڑھتی شاید ہی کوئی ہوگا، ہندو آڑھتی تھے اور ان کے بعد سکھ آڑھتی...... ایک صبح تھانے میں اطلاع آئی کہ ایک سکھ آڑھتی کے گھر نقب لگی ہے۔ اطلاع لانے والا سکھ خود تھا اور اس کے ساتھ اس کا بڑا بیٹا اور قصبے کا نمبردار بھی تھا۔

آپ وارداتوں اور ان کی تفتیشوں کی جو کہانیاں پڑھتے رہتے ہیں ان میں آپ نے نقب زنی کی بابت پڑھا ہوگا۔ ڈاکہ زنی تو آپ جانتے ہیں کہ ڈاکو گھر میں کسی طرح داخل ہو جاتے ہیں اور اپنے طریقے سے لُوٹ کر چلے جاتے ہیں۔ آج کل نقب زنی ہو ہی نہیں کیونکہ اب ڈکیتی کے طریقے اور انداز بالکل ہی بدل گئے ہیں۔ شہروں میں ڈکیتی وارداتیں جس طرح ہو رہی ہیں، وہ میرے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اُس دور بات سنا رہا ہوں جب انگریز حکمران ڈاکوؤں کو لوگوں کا بدترین دشمن سمجھا کرتے تھے کہتے تھے کہ ان کی بادشاہی میں کسی ڈاکو کو زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں۔ کسی علاقے ڈاکہ زنی یا نقب زنی کی واردات ہو جاتی تو اُس علاقے کا انگریز ڈی ایس پی تھانیدار کی جان کو آ جاتا تھا اور روز بروز کی تفتیش کی رپورٹ لیتا تھا۔

نقب اس طرح لگائی جاتی تھی کہ مکان کے پچھواڑے کی دیوار کو نیچے یعنی زمین قریب اس طرح کاریگری سے توڑا جاتا تھا کہ آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اگر دیوار اینٹ کی ہوتی تو لوہے کے ایک بڑے سُنبے سے ایک ایک اینٹ بڑے آرام سے نکالی تھی۔ دیوار پتھروں کی ہوتی تو اسی طرح ایک ایک پتھر نکالا جاتا اور اتنا شگاف کر لیا جس میں سے ایک آدمی ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگ کر اندر جا سکتا تھا اور جس عام سائز کا ایک ٹرنک نکالا جا سکتا تھا۔

نقب زنی سردیوں کے موسم میں نہیں کی جاتی تھی، وجہ یہ کہ سردیوں میں لوگ کمروں میں سویا کرتے تھے۔ نقب زنی عام طور پر اُس موسم میں ہوتی تھی جب لوگ صحن میں یا برآمدے میں سویا کرتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں بھی نقب زنی ہوتی تھی۔ گرمیوں میں لوگ چھتوں پر سویا کرتے تھے۔

نقب زنی کی واردات میں عام طور پر ایک گھر بھیدی ضرور ہُوا کرتا تھا۔ گھر بھیدی نقب زنوں کو بتاتا تھا کہ پچھواڑے کی دیوار کو کس جگہ سے توڑنا ہے۔ پھر وہ بتاتا تھا کہ ٹرنک یا وہ مال جو لُوٹنا ہوتا تھا، وہ اس کمرے میں یا ساتھ والے کمرے میں فلاں جگہ رکھا ہے۔ ڈاکہ زنی میں بھی گھر بھیدی ہوتے ہیں لیکن نقب زنی کے لئے گھر بھیدی ضروری ہوتا تھا۔ آپ خود غور کریں دیوار تو آپ نے آسانی سے توڑ لی۔ یہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ اُس وقت دیواروں میں سیمنٹ استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ مٹی کا گارا استعمال ہوتا تھا۔ اس وجہ سے یہ سہولت تھی کہ اینٹیں یا پتھر آسانی سے نکل آتے تھے...... آپ نے اندر جانے کا راستہ تو بنا لیا لیکن مکان کے اندر سے آپ واقف ہی نہیں کہ کتنے کمرے ہیں اور کس طرف کیا ہے اور مال کہاں رکھا ہے تو اندر آپ کا اتنا زیادہ وقت لگ جائے گا کہ گھر کا کوئی نہ کوئی فرد جاگ اٹھے گا۔

نقب زنی کی بابت میں کچھ اور دلچسپ باتیں بھی سنا سکتا ہوں لیکن اس وقت ایک واردات سنانی ہے جس کی میں نے تفتیش کی تھی۔ خواہ مخواہ بات کو لمبا نہ کروں تو مناسب رہے گا نہیں تو آپ کا وقت ضائع ہوگا...... اس سکھ آڑھتی کا مکان اینٹوں کا بنا ہُوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ گھر کے سب افراد صحن میں سوئے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے جو باتیں پوچھنی تھیں وہ سب پوچھ کر ایف آئی آر اسی کے نام کی تحریر کی اور اُس کے ساتھ اپنے عملے کے کچھ آدمی لے کر چل پڑا۔ میں نے راستے میں اس کو کہا کہ ایسی وارداتیں بعض اوقات دشمنی کی بنا پر یا انتقام کے طور پر بھی کی جاتی ہیں۔ اُس سے دریافت کیا کہ اس کی کسی کے ساتھ عداوت ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ کسی کے بھی ساتھ اس کی ذرہ جتنی بھی ناراضگی نہیں...... یہ تو مجھ کو علم تھا کہ کاروباری لوگ کسی کے ساتھ دشمنی مول نہیں لیتے تھے۔ ان تاجروں میں کاروباری رقابت تو چلتی ہے لیکن ایسی نہیں جس طرح مسلمان انتقامی طور پر قتل سے کم بات ہی نہیں کیا کرتے تھے۔

میں جائے وقوعہ پر پہنچا۔ مکان کے اندر جانے کی بجائے میں پچھواڑے گیا جدھر سے نقب لگی تھی۔ یہ مکان قصبے کے باہر تھا اور اس کے پچھواڑے کوئی اور مکان نہیں تھا بلکہ

وہاں سے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ اس مکان کے پچھواڑے مکئی کی پکی ہوئی فصل کھڑی تھی۔ میں نے نقب دیکھی۔ یہ کسی تجربہ کار نقب زن کی کاریگری تھی۔

ایک بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اُس وقت نقب زنی، ڈکیتی، راہزنی، جیب تراشی، قفل شکنی وغیرہ کے جرائم ہوتے تھے اور ہر طریقۂ جرم کے ماہر مجرم ہوتے تھے۔ خاص بات یہ کہ نقب زن صرف نقب زنی کرتے تھے۔ ڈاکہ زنی کا ارتکاب کرنے والے نقب نہیں لگاتے تھے بلکہ ان کا اپنا ایک جدا طریقہ تھا۔ ایسے ہی راہزن صرف راہزنی کرتے تھے اور قفل شکن صرف تالے توڑنے میں مہارت رکھتے تھے۔ ایسا تو ہوتا ہی نہیں تھا کہ ایک جیب تراش اور ایک راہزن اور قفل شکن مل کر نقب لگاتے۔ وہ اس واسطے یہ کام نہیں کرتے تھے کہ ان کو اس کاریگری کا تجربہ ہی نہیں ہوتا تھا۔

میں نے نقب لگی دیکھی تو میں سمجھ گیا کہ یہ کسی نقب زن کاریگر کا کام ہے اور اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں اپنے علاقے کے چار پانچ نقب زن آ گئے۔ میں نے ان کو تھانے طلب کرنا تھا۔

میں مکان کے اندر گیا۔ صحن بہت ہی وسیع تھا اور تین کمرے ایک لائن میں تھے۔ تینوں کے درمیان والا کمرہ زیادہ بڑا تھا۔ نقب بائیں طرف چھوٹے کمرے کی دیوار میں لگی تھی اور اسی کمرے میں ٹرنک اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے نوٹ یہ کیا کہ یہ ٹرنک اُسی دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے تھے جس میں نقب لگی تھی لیکن نقب اُس جگہ لگائی گئی تھی جہاں دیوار کے آگے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ نقب لگانے والوں کو معلوم تھا کہ دیوار کے اندر کی طرف خالی ہے۔ اگر معلوم نہ ہوتا تو وہ اُس جگہ بھی نقب لگا سکتے تھے جہاں دیوار کے ساتھ ٹرنک پڑے ہوئے تھے اور ایک بڑی پیٹی تھی جس میں رضائیاں اور گدے رکھے جاتے ہیں۔ وہاں نقب لگائی جاتی تو ملزم اندر نہیں جا سکتے تھے۔

پھر یہ خاص چیز نوٹ کی کہ جو ٹرنک ملزم اٹھا کر لے گئے تھے وہ گھر والوں کے بیان کے مطابق تین ٹرنکوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ملزموں کو پہلے ہی معلوم تھا کہ مال اس ٹرنک میں ہے۔ وہ آئے، اوپر سے تین ٹرنک اٹھا کر نیچے رکھے اور مال والا ٹرنک اٹھا کر چلے گئے۔ انہیں معلوم نہ ہوتا تو وہ سارے ٹرنکوں کے تالے توڑ کر مال تلاش کرتے اور پھر مطلوبہ ٹرنک لے جاتے۔ اس طرح ہوتا تو بے شمار وقت لگ جاتا۔

میرے دماغ نے یہ نکتہ قبول کر لیا کہ اس واردات میں گھر کا بھیدی شامل ہے۔

گھر کی بلّو

ایسی واردات کے موقعہ پر جا کر جو کاغذی کارروائی اور ضابطے کی جو دیگر کارروائیاں کرنی ہوتی ہیں، ان میں آپ کے واسطے کوئی دلچسپی نہیں، ان کو میں الگ رکھتا ہوں۔ آپ کہانی کے مطلب کی باتوں پر توجہ رکھیں...... میں تھانے سے روانہ ہوتے وقت کھوجی کے گھر پیغام بھیج کر آیا تھا کہ وہ فلاں جگہ فوراً پہنچے۔ وہ آ گیا تھا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ دیوار اور فصل کے درمیان اُس کو کھرے مل گئے تھے جو ملزموں کے تھے اور اب وہ یہ دیکھتا پھر رہا تھا کہ ملزم کس طرف گئے ہیں۔ یہ اُس کے واسطے آسان کام نہیں تھا، وجہ یہ کہ تمام کھیتوں میں فصل کھڑے تھے اور پکی مینڈھوں پر کھرے کا نظر آنا ممکن نہیں تھا...... میں اسی گھر کی بیٹھک میں بیٹھ گیا اور سکھ آڑھتی کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس سے پہلے تو یہ دریافت کیا کہ ٹرنک میں کیا کچھ تھا۔

اُس وقت تک یہ سکھ حوصلے میں تھا اور میرے ساتھ ساتھ لگا رہا تھا لیکن جونہی میں نے اس سے یہ پوچھا کہ نقصان کتنا ہوا ہے تو مجھ کو اس طرح لگا جیسے اس سکھ کو اب اطلاع ملی ہے کہ ڈاکو اس کا گھر لوٹ کر لے گئے ہیں۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا پھر لمبی آہ بھری اور یکلخت رو پڑا۔ رویا بھی اس طرح کہ ہچکیاں لینے لگا اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی ساری عمر کی کمائی نکل گئی ہے۔

''میرا تو ککھ بھی نہیں رہا''— اُس نے کچھ دیر بعد حوصلے میں آ کر کہا— ''ساری جمع پونجی اس ٹرنک میں تھی''— اب تو اُس کی دھاڑیں نکل گئیں۔

بعد میں اُس نے جو تفصیل بتائی وہ مختصر طور پر اس طرح تھی کہ سونے کے بے شمار زیورات اس ٹرنک میں تھے۔ ان میں اس کی بیوی کے زیورات تھے اور پھر انہوں نے اپنی جوان بیٹی کے واسطے زیورات بنوائے تھے۔ اُس کی بیٹی کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی۔ اس سے چھوٹی ایک اور بیٹی تھی جس کی عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ اس کے واسطے بھی انہوں نے کچھ زیورات تیار کروا لئے تھے۔ اُس زمانے میں اس سارے زیور کی مالیت اسّی نوے ہزار روپیہ تھی۔ آج کے ریٹ کے مطابق مالیت پچاس ساٹھ لاکھ کے برابر تھی۔ زیورات کے علاوہ بیس بائیس ہزار روپیہ نقد اس ٹرنک میں تھا۔ چھوٹے سے اس قصبے میں ایک بینک کھل گیا تھا جس میں کاروباری لوگوں نے روپیہ پیسہ رکھنا شروع کر دیا تھا لیکن کاروباری لوگ

ابھی تک زیادہ رقمیں اپنے گھروں میں چھپا کر رکھتے تھے۔

اس مال کے علاوہ ٹرنک میں بڑی بیٹی کے جہیز کے بڑے قیمتی کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ زیادہ تر کپڑے سلے ہوئے نہیں تھے۔ خالص چاندی کی چار طشتریاں بھی تھیں اور کچھ ایسی ہی دو تین اور قیمتی چیزیں تھیں۔

میں نے اس گھر کے افراد دیکھ لئے تھے۔ اس کی جوان بیٹی کو تو غور سے دیکھا تھا۔ سکھ خود اور اس کی بیوی تو آٹے کی بھری ہوئی اڑھائی من کی بوریوں جیسے تھے لیکن ان کی یہ بیٹی جس کا نام کلونت کور تھا صحیح معنوں میں خوبصورت لڑکی تھی۔ جسم ایسا جیسا کسی ایتھلیٹ کا ہوتا ہے۔ دیکھنے کو دل کرتا تھا۔ گردن بھی لمبوتری، چہرے کے نین نقش تو اور ہی زیادہ اچھے اور رنگ بھی گورا تھا۔ سکھ نے جس کو اپنی نوکرانی کہا تھا، میں اس کو بھی اس کی بیٹی سمجھا تھا۔ وجہ یہ کہ وہ کوئی زیادہ خوبصورت تو نہیں تھی لیکن ایسی ویسی صورت والی بھی نہیں تھی کہ اس کو کوئی اچھی طرح دیکھنا ہی نہ چاہتا۔ اس کا قد کاٹھ کلونت کور سے ملتا جلتا تھا، رنگ بھی صاف اور نکھرا ہوا تھا اور اس نے جو کپڑے پہنے ہوئے تھے، وہ نوکرانیوں والے نہیں تھے بلکہ گھر کی بیٹیوں جیسے تھے۔ ذرا بھی شک نہیں ہوتا تھا کہ یہ نوکرانی ہے۔

میں ان لڑکیوں کو خوبصورت اور جوان ہونے کے واسطے نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ تفتیشی نظروں سے ان کو جانچ اور پرکھ رہا تھا۔ سکھ آڑھتی سے میں نے اس نوکرانی کی بابت پوچھا کہ یہ وفاداری اور اعتبار کے لحاظ سے کیسی ہے۔ سکھ نے کہا کہ بہت دیانتدار اور وفادار نوکرانی ہے، اس گھر میں اس کو گھر کی لڑکی جیسا درجہ حاصل ہے۔

میں اس گھر میں گھومتا پھرتا رہا تھا، کمرے دیکھے اور باہر نکل کر مکان کو اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس دوران یہ نوکرانی کئی بار میرے سامنے آئی اور میری نظریں اس پر لگ گئی تھیں۔ آپ جس کو چھٹی حس کہا کرتے ہیں، اس نوکرانی کو دیکھ کر میرے اندر یہ حس پھڑک اٹھی تھی۔ ابھی تو میں نے سراغ رسانی کرنی تھی لیکن دل اور دماغ گواہی دیتے تھے کہ یہ لڑکی کوئی خاص اہمیت ضرور رکھتی ہے۔ سکھ نے یہ تو کہہ دیا تھا کہ یہ لڑکی پوری طرح وفادار اور قابل اعتبار ہے لیکن اس سکھ کی نظر میں اور میری نظر میں بہت فرق تھا۔ دونوں کی نظروں کے زاویے مختلف تھے۔ میں نے سکھ سے اس نوکرانی کی بابت چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھنی شروع کر دیں۔

اُس نے دو تین بار کہا کہ اُس کو اور گھر کے کسی بھی فرد کو اس نوکرانی پر ایسا شک نہیں

کہ اس نے گھر بھیدی بن کر واردات کروائی ہوگی...... اس نوکرانی کا پورا نام بلونت کور تھا اور اسے بلو کہتے تھے اور مجھ کو بتایا گیا کہ اس کو شاید اپنا اصل نام یاد ہی نہیں ہوگا۔ خود بھی اپنا نام بلو ہی بتاتی ہے۔ مزید یہ پتہ لگا کہ یتیم لڑکی ہے اور اس کا اپنا کوئی گھر گھاٹ نہیں۔ تین سالوں سے اس سکھ کے گھر میں رہ رہی تھی۔ ان لوگوں نے اس کو الگ کمرہ دیا ہوا تھا۔

سکھ نے یہ بھی بتایا کہ اس لڑکی کو اپنے گھر میں رکھ کر اس نے نیکی کا کام کیا ہے۔ اُس نے بلو کو دراصل گھر میں پناہ دی تھی اور یہ لڑکی یہاں گھر کا کام کاج کرتی تھی۔ یہ فیصلہ گوردوارے میں ہوا تھا کہ اس لڑکی کو یہ سکھ اپنے گھر میں رکھے اور اس کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لے۔ یہ تو ہندوؤں اور سکھوں میں آج بھی خوبی پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے مذہب کے کسی شخص کو کسی کا محتاج نہیں ہونے دیتے اور اس کے واسطے کوئی ذریعۂ معاش پیدا کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں یہ بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھیک مانگنے کا پیشہ صرف مسلمان اختیار کرتے ہیں۔

میں نے بلو کی پچھلی ہسٹری معلوم نہیں کی، صرف موجودہ حالات معلوم کئے اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ اس گھر میں اس کی حیثیت کیا ہے اور اس کو کتنی آزادی یا اپنی من مرضی کرنے کی اجازت حاصل ہے۔ مجھ کو سکھ نے بتایا کہ یہ ہے تو نوکرانی لیکن اس کی بڑی بیٹی بلونت کور کی سہیلی بنی ہوئی ہے اور کلونت کور بھی اس کو سہیلیوں جیسا چاہتی ہے۔ سکھ نے مزید تعریف کرتے ہوئے کہا کہ کلونت کور بلو پر سولہ آنے اعتبار کرتی ہے اور یہ مانا ہی نہیں جا سکتا کہ بلو دھوکہ دے گی۔

شیشے میں اُتر آئی

تفتیش اور سراغ رسانی دماغ اور عقل کا کھیل ہوتا ہے جس میں مزاج کو ٹھنڈا رکھنا بہت ہی ضروری ہوتا ہے۔ اگر تھانیدار تھانیداری کے رعب میں رہے اور یہ سمجھے کہ وہ تھانیداری دھونس جما کر سراغ لگا لے گا تو تفتیش میں سوائے ناکامی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا...... میرے واسطے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ سکھ کی بیوی کو پہلے پوچھ گچھ کے لئے بلاؤں یا بلو نوکرانی کو۔ دماغ پر بہت زور دیا اور آخر عقل نے یہ فیصلہ دیا کہ بلو کو پہلے بلایا جائے......

میں نے سکھ کو کہا کہ وہ اندر چلا جائے اور اپنی نوکرانی کو میرے پاس بھیج دے اور اسے پوری

تسلی دی کہ ڈرنے یا جھجکنے والی کوئی بات نہیں۔ سکھ چلا گیا اور بلو نوکرانی میرے پاس آ گئی۔

یہ لڑکی جب میرے اتنا قریب ہو کر بیٹھی تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر نوجوانی کا اور شباب کا ایسا تاثر ہے جسے کوئی مرد نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے جب میرے ساتھ بات کی تو مجھے ''آپ'' کہنے کی بجائے تم کہا۔ میں نے اس کو بُرا نہیں سمجھا۔ مجھ کو معلوم تھا کہ سکھ اور قبائلی پٹھان جس کی دلی طور پر عزت کرتے ہیں اس کو آپ کی بجائے تم یا تو کہتے ہیں۔ یہ تو اَن پڑھ لگتی تھی۔

''تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''——بلو نے پوچھا۔

مجھ کو تو یہ توقع تھی کہ یہ لڑکی ڈری ہوئی ہو گی اور میں ایک ایک بات کئی کئی بار دہراؤں گا تو یہ ڈرتے ڈرتے ادھورا سا جواب دے گی لیکن اس نے ایسی جرأت مندی سے بات کی جیسے مجھ کو پہلے سے جانتی ہے اور ہم کئی بار ملے ہیں۔ آپ شاید یقین نہیں کریں گے کہ ڈر یا گھبراہٹ کی بجائے اس کے انداز میں بے تکلفی اور شگفتگی تھی۔ میں نے فوراً سوچ لیا کہ اس کو یہ تاثر دینا ہی نہیں کہ میں تھانیدار ہوں اور ایک شبہے کی بنا اس کو شامل تفتیش کیا ہے۔ اس نے نڈر ہو کر پوچھا کہ میں نے اس کو کیوں بلایا ہے تو میں نے سوچ لیا کہ اس کے ساتھ بے تکلف دوستوں والا رویہ رکھوں گا۔

''تم کو کچھ سوچ کر بلایا ہے''——میں نے مسکراتے ہوئے کہا——''اس گھر میں مجھ کو صرف تم نظر آئی ہو جس میں کچھ عقل ہے۔ مجھ کو پوری امید ہے کہ تم ہر بات ٹھیک ٹھیک بتاؤ گی''۔

''کیوں نہیں بتاؤں گی''——بلو نے کہا——''تم پوچھو تو سہی کیا پوچھنا ہے''۔

میں نے دیکھا کہ وہ پہلے سے زیادہ کِھل اٹھی تھی۔ عموماً یہ غلطی کی جاتی ہے کہ اس قسم کے مشتبہوں کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے لیکن میں نے اس لڑکی کو ہنستا کھیلتا رکھنا زیادہ اچھا سمجھا۔ تعریف اور خوشامد جسے ڈپلومیسی بھی کہتے ہیں، اکثر بڑا کامیاب حربہ ثابت ہوتا ہے۔ میں نے بلو کے ساتھ کچھ اور باتیں کیں اور اس کی نوجوانی اور خوبصورتی کی بھی تعریفیں کر ڈالیں۔ میرا انداز بے تکلف دوستوں جیسا تھا۔ میں اپنے اس رویے کے اثرات اس کے چہرے پر اور اُس کی حرکتوں میں بھی دیکھ رہا تھا۔ میرا یہ تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ میں نے کہا کہ مجھ کو بہت افسوس ہے کہ ان بے چاروں کا اتنا زیادہ نقصان ہو گیا ہے۔

''ہاں جی!''——اُس نے کہا——''نقصان تو بہت ہُوا ہے لیکن ہم کیا کر سکتے

ہیں''

میں نے اس نقصان کی بابت کچھ اور باتیں کیں تو میں نے صاف طور پر نوٹ کیا کہ اس لڑکی کو اس نقصان کا کوئی افسوس نہیں۔ اس کے دل میں ذرا سا بھی درد ہوتا تو کچھ تو افسوس کرتی۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا، کیا اس کو معلوم تھا کہ جو ٹرنک چلا گیا ہے، سارا مال اسی میں تھا؟ ...... میں اس پر سیدھا سوال نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ ہیر پھیر کر بات کرنی تھی۔

''گھر والے تمہاری بہت تعریف کرتے ہیں''——میں نے کہا——''کلونت کور کا باپ کہتا تھا کہ اس کی بیٹی تو بلو کو اپنی سہیلی اور سگی بہن سمجھتی ہے...... سچی بات بتاؤں بلو! تم ہو ہی تعریفوں کے قابل۔ میں تمہیں اس گھر کی نوکرانی سمجھتا ہی نہیں۔ نوکرانیاں تو بڑی گندی اور کچھ اور ہی طرح کی ہوتی ہیں''۔

اس طرح میں نے جال بچھانا شروع کر دیا اور زبان کا ایسا جادو چلایا کہ وہ اور ہی زیادہ بے تکلف ہو گئی اور ایک دو مرتبہ کھل کر ہنسی حالانکہ جس بات پر وہ ہنسی تھی وہ اتنی زیادہ ہنسنے والی بات نہیں تھی۔ میں نے کچھ تعلیم بھی حاصل کی ہوئی تھی اور کتابیں پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ اس کا مجھ کو یہ فائدہ ملا کہ میں نفسیات کو بھی کچھ کچھ یا اپنی ضرورت کے مطابق سمجھ لیا کرتا تھا۔ اس لڑکی کی یہ ہنسی ایک بڑی صاف علامت تھی کہ لڑکی ڈھیلی ہے اور جلدی جال میں آ جائے گی۔ یہ تو میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ یہ بہت جلدی بے تکلف ہو جانے والی چیز ہے۔

وہ میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے بے تکلفی ذرا اور آگے بڑھانے کے واسطے یہ حرکت کی کہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مسلنے لگا اور ساتھ یہ الفاظ کہہ دیئے——''تمہارے سامنے کلونت کور تو کچھ بھی نہیں''۔

اُس کا فوری ردعمل ایسا تھا جیسے وہ اسی انتظار میں تھی کہ میں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں اور وہ میرا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لے۔ وہ اس نے کیا اور پوری طرح بے تکلفی کے موڈ میں آ گئی۔ میں یہاں وہ مکالمے نہیں سناؤں گا جو اُس کے ساتھ ہوئے، آپ یہ سمجھ لیں کہ میں نے دوستی کا جھانسہ دیا اور کہا کہ وہ بھول جائے کہ میں تھانیدار ہوں اور اس سے تفتیش کر رہا ہوں۔ اُس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ میں جان گیا کہ وہ دیکھنا چاہتی ہے کہ دروازہ کھلا ہُوا تو نہیں۔

یہ کیسے ہُوا اور وہ کیسے ہُوا اور میں نے کیا کیا اور کیا کہا کہ وہ پوری طرح شیشے میں اُتر آئی، یہ ذرا لمبی بات ہے، میں یہ سنانا چاہتا ہوں کہ اس کو شیشے میں اتار کر ایک خاص انداز

اور خاص الفاظ استعمال کر کے اس سے بھید لینے لگا۔ میری ان باتوں میں سکھ کی بڑی بڑ
کلونت کور کا بھی ذکر تھا۔ بلو نے بڑے پیار سے راز فاش کرنے شروع کر دیئے۔

سب سے پہلے تو میں معلوم کرنے کی فکر میں تھا کہ بلو کو معلوم تھا یا نہیں کہ جو مال گیا ہے وہ اس ٹرنک میں رکھا ہُوا تھا اور یہ ٹرنک تین ٹرنکوں کے نیچے پڑا ہُوا تھا۔ میں نے اس سے ایسی بات پوچھی نہیں، تاکہ اُس کو کوئی شک نہ ہو۔ میں نے اس کی اور کلونت کور کی دوستانہ بے تکلفی کی بات شروع کر دی اور ایک دو مرتبہ کہا کہ بلو، تم ہو ہی دوستی کے قابل۔ اُس نے اپنے آپ بتانا شروع کر دیا کہ کلونت کور کے دل کا کوئی راز ایسا نہیں جو اس کو معلوم نہ ہو۔ بلو کو پوری طرح معلوم تھا کہ یہ سارا مال جو گیا ہے وہ کالے ٹرنک میں رکھا ہوا تھا بلکہ کون سی چیز ٹرنک میں کس جگہ رکھی ہوئی تھی۔ کلونت کور کبھی کبھی یہ چیزیں بلو کو دکھایا کرتی تھی۔ واردات سے دس بارہ روز پہلے کلونت کور اور بلو نے مل کر یہ ساری چیزیں یعنی زیورات، رقم اور دیگر اشیاء ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے رکھ کر کپڑوں کو نئے سرے سے تہہ کیا اور رکھا تھا اور پھر تالا لگا دیا تھا۔

مجھ کو انتہائی ضروری سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اب یہ سراغ لینا تھا کہ ملزموں کے ساتھ بلو کا رابطہ تھا یا نہیں یا بلو کا کردار اتنا بڑا اور ڈھکا چھپا تھا کہ اس نے گھر بھیدی کا رول ادا کر کے نقب زنی کی واردات کروائی؟ ...... یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ بلو اس راز سے بھی پردہ اٹھا دیتی۔ مجھ کو ایک شک اور ہو رہا تھا۔ یہ لڑکی مجھ کو نارمل نہیں لگتی تھی۔ اس کا انداز اب ایسا ہو گیا تھا جیسے وہ میرے ساتھ ملاقات کرنے آئی تھی اور اب ہم دونوں کو یہاں سے کوئی اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں نے اس کی غلط فہمی کو خوش فہمی میں تبدیل کیے رکھا اور وہ بہت ہی خوش رہی۔

''تمہارے منہ پر تھوکتی ہوں''

اگر میں وہ سارے مکالمے لکھ ڈالوں جو میں نے اس کے ساتھ بولے تھے اور وہ حرکتیں بھی سنا دوں جو اس کے ساتھ کی تھیں اور اپنی ایکٹنگ بھی بیان کر دوں تو آپ یقیناً کہیں گے کہ یہ تھانیدار تفتیش کرنے کی بجائے رومان لڑا تا رہا ہے۔ اگر یہ حال احوال اُس وقت میری بیوی کے کانوں میں پہنچ جاتا تو وہ مجھ کو لائن حاضر کروا دیتی۔ یہ تو میں ہی جانتا

تھا کہ یہ مشتبہ لڑکی کس طریقے سے میری مٹھی میں آ کر رام ہو گی۔ میں نے وہی طریقہ اختیار کئے رکھا اور مجھ کو کامیابی ہوئی لیکن ابھی میں اس کو پوری کامیابی نہیں کہہ سکتا تھا۔

بلو نے بڑی شوخی اور دلچسپی سے مجھ کو ایک اور راز بتا دیا۔ وہ یہ تھا کہ کلونت کور ایک مسلمان صوبیدار میجر کے بیٹے کے ساتھ عشق و محبت کا ڈرامہ کھیل رہی تھی۔ بلو نے جو تفصیلات سنائیں وہ اس طرح تھیں کہ یہ لڑکا اٹھارہ انیس سال عمر کا تھا اور بڑا خوبرو لڑکا تھا۔ ان کی ملاقاتیں بلو کرایا کرتی تھی۔ بلو زبانی پیغام لاتی اور لے جاتی تھی۔ بلو نے یہ بھی بتایا کہ ان کی محبت غلط تعلقات والی نہیں تھی بلکہ ان کا پروگرام شادی کرنے کا بھی تھا۔

بلو نے یہ بات سنائی تو میرے دماغ میں ایک اور شک آ گیا۔ میں نے دو وارداتیں ڈکیتی کی ایسی دیکھی تھیں جن میں ایک نقب زنی کی تھی۔ تفتیش میں یہ راز کھلا کہ یہ واردات گھر کی اپنی ہی ایک بیٹی نے کروائی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ لڑکی ایک لڑکے کے ساتھ محبت کرتی تھی اور شادی کے عہد بھی ہو چکے تھے۔ گھر والوں کو پتہ چل گیا تو انہوں نے لڑکی پر تشدد شروع کر دیا۔ پھر اُس کی شادی کہیں اور طے کر دی۔ لڑکی نے لڑکے کو بتایا اور کہا کہ میرے گھر میں نقب لگواؤ اور مال فلاں جگہ پڑا ہے، نکال کر لے جاؤ پھر کچھ دنوں بعد میں گھر سے بھاگ آؤں گی اور کہیں دور چلے جائیں گے اور یہ مال ہمارے کام آئے گا۔ ان دونوں وارداتوں کی یہی کہانی تھی لیکن سراغ مل گیا اور دونوں عاشق اندر ہو گئے۔

مجھ کو شک ہُوا کہ کلونت کور نے خود ہی واردات کروائی ہو گی اور وہ اس صد بیدار میجر کے بیٹے کے ساتھ بھاگ جانے کا ارادہ رکھتی ہو گی۔ یہ شک دل میں رکھ کر میں نے بلو کو کریدنا شروع کر دیا۔ اس سے بہت سے سوال پوچھے لیکن یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میرے دماغ میں کیا شک آیا ہے۔ اُس نے جو جواب دیئے اور باتیں سنائیں وہ اس طرح تھیں کہ ماں باپ نے کلونت کور پر کبھی تشدد نہیں کیا تھا نہ کبھی اس کے ساتھ کوئی غصے سے بولتا تھا۔ اس کے گھر والوں کو تو ابھی پتہ ہی نہیں لگا تھا کہ کلونت کور ایک مسلمان کی محبت میں بندھی ہوئی ہے۔

دوسری بات یہ کہ کلونت کور کی ابھی کہیں بھی شادی طے نہیں ہوئی تھی۔ ابھی رشتوں کے پیغام آ رہے تھے اور اس کے ماں باپ نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ بلو نے مجھ کو بتایا کہ کلونت کور کہتی تھی کہ کوئی صاف ستھرا رہنے والا سکھ لڑکا پسند آ گیا تو اس کے ساتھ شادی کر لے گی، اگر لڑکا اس کی پسند کا نہ ہُوا تو صوبیدار میجر کے بیٹے کے ساتھ بھاگ جائے گی۔ مطلب یہ کہ ابھی اُس نے اس مسلمان لڑکے کے ساتھ بھاگ جانے کا پکا ارادہ نہیں کیا تھا۔

بلو نے جب یہ بات سنائی تو میرے دماغ سے یہ شک نکل گیا کہ واردات کلونت کور نے خود ہی کرائی ہوگی۔ ویسے بھی میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہر لڑکی ایسی نہیں ہوتی کہ اپنے گھر ڈاکہ ڈلوا دے۔ یہ تو وہ لڑکی کر سکتی ہے جس پر اتنا زیادہ ظلم ہوا ہو کہ وہ انتقام کے جذبے سے پاگل ہوگئی ہو۔ ہوش و حواس میں رہنے والی لڑکی ایسا خطرناک اور شرمناک جرم نہیں کیا کرتی۔

اس صوبیدار میجر کا نام تو میں لکھوں گا ہی نہیں، اس کے بیٹے کا اصل نام کچھ اور ہے لیکن میں امجد لکھوں گا۔ مجھ کو معلوم ہے کہ یہ خاندان 1947ء میں ہجرت کر کے پاکستان میں آ گیا تھا اور بڑی اچھی حیثیت سے آباد ہو گیا تھا۔ اب تو اس خاندان کا شمار ماشاءاللہ زمیندار خاندانوں میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے واردات والے قصبے کا نام نہیں لکھا۔

بلو نے ایک اور بات سنا کر ایک اور ہی شک میرے دل میں ڈال دیا۔ بات یہ تھی کہ امجد اور کلونت کور کی محبت دشمنی میں بدل گئی تھی۔ ایک مہینہ گزر گیا تھا کہ ان میں اَن بَن ہو گئی تھی۔ بلو نے سنایا کہ کلونت کور کی ایک سہیلی کی شادی تھی اور رات کو کلونت کور نے اس شادی کی ایک رسم میں شامل ہونا تھا۔ سہیلی کے ماں باپ امیر لوگ تھے اس واسطے انہوں نے بے شمار مہمان بلائے ہوئے تھے اور قصبے کے مہمان بھی تھے۔ کلونت کور کو امجد سے ملنے کا بڑا اچھا بہانہ مل گیا۔ اُس نے بلو کی زبانی پیغام بھیجا کہ آج رات فلاں وقت کھیتوں میں فلاں جگہ ملنا۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ان کے محلے کے ساتھ سے ہی کھیت شروع ہو جاتے تھے اور اُن دنوں فصل پوری طرح اونچی ہوگئی تھی۔

بلو امجد کو پیغام دے آئی۔ رات کو بلو بھی کلونت کور کے ساتھ شادی میں شریک ہونے کے واسطے چلی گئی۔ کلونت کور امجد سے ملنے کے واسطے کھیتوں کی طرف نکل گئی۔ بلو کو معلوم تھا کہ وہ ایک گھنٹے سے پہلے واپس نہیں آئے گی لیکن وہ پندرہ بیس منٹ بعد ہی واپس آ گئی اور آئی بھی غصے کی حالت میں۔ بلو کو یہ شک ہُوا کہ آج رات یہ پکڑے گئے ہیں لیکن بات کچھ اور نکلی۔

''میری بات سنو بلو!'' ___ کلونت کور نے بلو سے کہا ___ ''آج کے بعد میری کوئی بات اس حرامزادے امجد تک نہ پہنچانا نہ اس کی کوئی بات مجھ تک پہنچانا''۔

''کیوں؟'' ___ بلو نے پوچھا ___ ''لڑائی ہوگئی ہے؟''

''سؤر کا بچہ بدمعاش ہے'' ___ کلونت کور نے بلو کو بتایا ___ ''میں شادی کی بات کرتی ہوں اور وہ بدمعاشی پر اُتر آیا ہے''۔

بات اصل میں جو ہوئی تھی وہ میں اپنے لفظوں میں مختصراً بتا دیتا ہوں۔ اُس رات تک ان کی محبت پاکیزہ رہی اور ان کے درمیان رومان چلتا رہا۔ کلونت کور نے امجد کو بھی بتایا تھا کہ اس کی شادی اس کی پسند کے مطابق نہ ہوئی تو وہ امجد کے ساتھ گھر سے نکل جائے گی مسلمان ہو کر اس کے ساتھ شادی کر لے گی...... اس رات امجد کی نیت بد ہو گئی لیکن کلونت کور پاک محبت کو ناپاک کرنے پر راضی نہ ہوئی۔ امجد نے دست درازی کی اور پھر زبردستی کی بھی کوشش کی لیکن کلونت کور اُسے گالی گلوچ کر کے اور اُسے پھر کبھی نہ ملنے کا کہہ کر وہاں سے آ گئی۔ اس نے یہ ساری بات غصے کی حالت میں بلو کو سنا ڈالی۔

ایک دو دنوں بعد امجد بلو سے کہیں ملا اور اس کو کہا کہ کلونت کور کو کہنا کہ آج رات مجھ کو ضرور ملے۔ بلو نے اس کو جواب دیا کہ کلونت کور اب اس کو کبھی نہیں ملے گی۔ امجد نے اس کو بُرا بھلا کہا اور حکم کے لہجے میں کہا کہ کلونت کور تک میرا پیغام پہنچا دینا۔

بلو کو بھی امجد پر غصہ آیا اور اس نے کلونت کور کو بتایا کہ امجد نے کیا کہا ہے اور یہ بھی بتایا کہ امجد نے اس کو گالیاں دی ہیں۔ کلونت کور نے بلو کو کہا کہ ابھی جا کر امجد کو یہ بات کہہ دو کہ میں تمہارے منہ پر تھوکتی ہوں اور میری جوتی بھی تم سے ملنے نہیں آئے گی۔

بلو بڑی دلیر اور منہ پھٹ لڑکی تھی۔ وہ یہی الفاظ امجد کو کہہ آئی اور اپنا تھوڑا سا غصہ بھی نکال لیا۔ امجد نے یہ جواب اپنے پیغام کا سنا تو بلو کو کہا کہ کلونت کور کو کہہ دینا کہ اس نے میری بات نہ مانی تو پچھتائے گی۔

بلو نے امجد کی یہ بات بھی کلونت کور تک پہنچا دی۔ کلونت کور آخر سکھوں کی بیٹی تھی اور سکھ دلیری اور زبان درازی میں مشہور ہیں۔ کلونت کور نے بلو کو کہا کہ اب امجد کہیں سامنے آ جائے تو اس کو کہنا کہ میں سکھوں سے تمہاری دونوں ٹانگیں تڑوا دوں گی اور باقی عمر بیساکھیوں پر گزارنا۔ اس پیغام میں یہ لفظ بھی کہے کہ اس کو یہ بھی کہنا کہ تمہارے باپ کی صوبیداری میجری میرے باپ کی دولت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

بلو نے یہ پیغام بالکل ان ہی لفظوں میں امجد تک پہنچا دیا۔ امجد نے کہا کہ کلونت اپنی دولت اور زیور کا رعب مجھ پر جماتی ہے، اُس کو کہہ دینا کہ میں تمہارا بیڑا غرق کر دوں گا اور تم اس دولت اور زیور کو ڈھونڈتی رہنا جس کا رعب دکھاتی ہو۔

بلو نے یہ پیغام کلونت کور تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد کلونت کور نے کوئی پیغام نہ بھیجا

اور دو تین گالیاں دے کر چپ ہو گئی۔ میں نے جب بلو کی زبانی یہ ساری بات
دونوں کے پیغامات اور پھر امجد کی یہ دھمکی سنی تو بلو سے پوچھا کہ یہ پیغام کتنے
گیا تھا۔ بلو نے بتایا کہ چودہ پندرہ دن پہلے کی بات ہے۔

میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہ شک ضرور کرتا کہ یہ واردات امجد نے کروائی
ابھی تو میں نے کلونت کور سے بھی پوچھ گچھ کرنی تھی اور اس سے پوچھنا تھا کیا اُس
امجد کو بتایا تھا کہ اُس کے گھر میں اتنے زیادہ زیورات ہیں اور رقم بھی ہے اور
دولت فلاں ٹرنک اور فلاں کمرے میں رکھی ہوئی ہے؟ اس سے پہلے میں آپ کو
باتیں بتاتا ہوں۔ اگر ان کی محبت قائم بھی رہتی تو بھی ان کی شادی نہیں ہو سکتی تھی
وجہ یہ ہے کہ امجد کلونت کور کو ساتھ لے کر کہاں جاتا؟ یہ تو محض جذباتی باتیں تھیں
کلونت کور گھر سے بھاگ کر مسلمان ہو جاتی اور امجد کے ساتھ شادی کر لیتی تو سکھ
قتل کر دیتے۔ وہ سکھوں کا علاقہ تھا اور اس قصبے میں سب سے زیادہ آبادی سکھوں
اس کے بعد ہندوؤں کی اور پھر اس کے بعد مسلمانوں کا نمبر آتا تھا اور مسلمانوں کی
بہت کم تھی۔ سکھ جلسے جلوس نکالنے والی قوم نہیں تھی، انہوں نے قانون اپنے ہاتھ میں
ان دونوں کو سزائے موت دے دینی تھی۔

میں نے بلو کو دوستی کا یقین دلایا اور وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باقی تفتیش تھانے
کرنی تھی۔

ایک اور معاشقہ

میں تھانے چلا گیا۔ دن کے تین ساڑھے تین بجے کے درمیان کا وقت تھا۔
میں رونق لگی ہوئی تھی۔ تھانے میں میرے دو اسسٹنٹ تھے۔ ایک جونیئر سب انسپکٹر
سب انسپکٹر بنے ابھی تین ہی مہینے گزر رہے تھے۔ دوسرا اے ایس آئی تھا۔ انہیں معلوم
نقب زنی یا ڈاکہ زنی کی واردات ہو جائے تو کیا کرنا ہوتا ہے۔ میں تو جائے وقوعہ
تھا، ان دونوں نے میری غیر حاضری میں بہت سے مشتبہ تھانے میں اکٹھے کر
ان میں تین چار نقب زن تھے، کچھ ڈکیتی کرنے والے تھے اور دو تین دوسرے
تھے۔ ان میں اس قصبے کا رہنے والا ایک ہی آدمی تھا، باقی قصبے کے ارد گرد قریب

کے آدمی تھے۔ سب انسپکٹر اور اے ایس آئی نے ان سے پوچھ گچھ شروع کر دی

ان لوگوں سے ہمارا طریقۂ تفتیش عام مشتبہوں سے بالکل الگ تھلگ ہوتا تھا۔ وہ تو
یوں سمجھ لیں کہ ان عادی مجرموں کے ساتھ ہماری قریبی رشتہ داری تھی اور ہم ایک دوسرے
کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ان میں سے جن پر شبہ زیادہ ہوتا تھا، ان پر پولیس کا دوسرا
طریقہ بڑی بے دردی سے آزمایا جاتا تھا۔ پھر ان کو ایک دوسرے کے خلاف مخبری پر اکسایا
جاتا تھا۔ یہ ایک الگ تماشا ہوتا تھا جو یہاں سنانے کی ضرورت نہیں، پھر کبھی شاید سنا دوں
ان لوگوں کے ساتھ ہم بڑی استادیاں کھیلا کرتے تھے۔

ہر تھانے کا مخبری کا ایک بڑا ہی کارآمد نظام لازماً ہوتا ہے۔ بعض تھانے دار اس
نظام کو اور زیادہ بہتر بنا لیا کرتے ہیں۔ جونہی کہیں سنگین واردات ہو جاتی تھی، مخبر خود ہی
تھانے میں پہنچ جایا کرتے تھے۔ ان مخبروں میں شہر یا علاقے کے معززین بھی شامل ہوتے
تھے جو تھانیدار کو خوش رکھنے کی غرض سے مخبری کیا کرتے تھے۔ اس کو آپ مخبری کہہ لیں یا
چغل خوری کہہ لیں، یہ لوگ اپنی اور اپنے افراد خانہ کی کرتوت پر پردہ ڈالنے کے واسطے
دوسرے گھروں کے اندر کی باتیں معلوم کرتے رہتے تھے اور ہر کسی پر نظر رکھتے تھے اور اُس
کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ عورتوں پر بھی ان کی نظر رہتی تھی اور ان عورتوں کی نقل و حرکت کو
دیکھتے رہتے تھے۔ پولیس کے یہ معزز مخبر دراصل پیشہ ور اور خاندانی خوشامدی اور چاپلوس
ہوا کرتے تھے۔

سب سے پہلے جو معزز مخبر میرے پاس آیا وہ ایک سکھ تاجر تھا جس کا کپڑے کا
کاروبار تھا۔ وہ سوشل ورکر بھی تھا اور گوردوارہ کمیٹی کا سربراہ بھی تھا اور انگریز ڈپٹی کمشنر
جب کبھی دورے پر آتا تو وہ استقبال کرنے والوں میں پیش پیش ہوتا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ
وہ ہر ایک کا چمچہ تھا۔ کوئی بھی تھانیدار نیا آتا، وہ سب سے پہلے تھانے پہنچ کر اس کے پاس
جاتا اور درباری سلام کر کے اس کا خاص قابلِ اعتماد مخبر یا چغل خور بن جاتا تھا۔
وہ دراصل میرے بلاوے پر آیا تھا۔ مجھ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس نے اپنے مخبر پال
رکھے ہیں۔ بڑا امیر تاجر تھا۔ میں نے وقوعہ والے گھر سے تھانے آ کر سب سے پہلے اس کو
بلایا تھا اور وہ دوڑتا ہوا میرے پاس پہنچا تھا۔

وہ اس معاملے میں تو کوئی رائے نہیں دے سکتا تھا کہ یہ نقب کس نے لگائی ہے۔ میں

نے اس سے پوچھا کہ وہ نقب والے گھر کی لڑکی کلونت کور اور ان کی نوکرانی بلو
میں کچھ جانتا ہے تو بتائے ...... اُس نے بتایا کہ کلونت کور کو ایک مسلمان صوبیدار
بیٹے امجد کے ساتھ کھیتوں میں دو تین بار کھڑے باتیں کرتے دیکھا گیا ہے۔ کلونت
چال چلن کی بابت اُس نے تسلی کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ لڑکی چال چلن کی خراب نہیں
لڑکا امجد کوئی اچھے اخلاق والا نہیں۔ بڑا ہی شوباز اور اکڑ دکھانے والا لڑکا ہے
اس بارے میں کچھ اور باتیں پوچھیں لیکن وہ کوئی خاص بات نہ بتا سکا پھر بلو کی
بابت پوچھا۔

اُس نے بتایا کہ یہ لڑکی چال چلن کے معاملے میں داغدار ہے لیکن ایسی
نہیں کہ اس کو آوارہ کہہ دیں۔ اُس نے کہا کہ بے چاری یتیم لڑکی ہے اور در در
رہی اور اب اس سکھ تاجر نے بھی بتایا کہ گوردوارہ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ بلو کو
باپ اپنے گھر میں رکھ لے۔

آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں نقب زنی کی اس واردات کی بس یہی تفتیش
کلونت کور اور بلو کا چال چلن کیسا تھا اور ان کے تعلقات کس کس کے ساتھ تھے
کا ایک پہلو تھا۔ دوسرے پہلو کی تفتیش میرا جونیئر سب انسپکٹر اور اے ایس آئی
تھے۔ یہ میں نے بتا دیا ہے کہ وہ کیا تفتیش کر رہے تھے۔

اس کے بعد میرے دو تین اور مخبر آئے اور ان سے بھی میں نے ا
دریافت کیں۔ کچھ تو انہوں نے اس سکھ تاجر کی رپورٹ کی تائید کی اور ان
معلوم ہوا کہ بلو گھر سے باہر گھومتی پھرتی ہے اور کبھی ایسی ہنستی کھیلتی اور باتیں کر
یعنی پاگل لگتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کبھی وہ زندہ دل لڑکی لگتی ہے اور ا
کہ فوراً ہاتھ آ جائے گی لیکن ایسی بالکل نہیں۔ دو مخبروں نے یہ رائے بھی دی
آنے والی تو نہیں لیکن کوئی زیادہ مضبوط اخلاق والی بھی نہیں۔

یہ تو کوئی خاص باتیں نہیں تھیں جو ان لوگوں نے مجھ کو بتائیں۔ بلو ک
میں خود ہی اپنی نظر سے اور اس کے ساتھ کچھ وقت گزار کر بہت کچھ جان چ
مخبروں نے بہت ہی کارآمد بات بتائی۔ اس قصبے میں لہنگا سنگھ ایک مونا سکھ
مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ داڑھی نہیں رکھتا تھا اور سر کے بال بھی بڑھنے نہیں دیتا
سکھوں کے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ باقاعدہ ہیئر کٹ کرواتا تھا۔ وہ

مشہور تھا اور جرائم پیشہ بھی تھا۔ اس قسم کے لوگوں کا دراصل کوئی مذہب ہوتا ہی نہیں۔ اس کی
عمر تیس سال ہو چکی تھی۔ اس کو تو میں نے بھی دیکھا ہوا تھا لیکن زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے
کبھی شادی کی تھی اور بیوی جلدی مر گئی اور پھر اس نے شادی کی ہی نہیں۔ اس قماش کے
آدمی عموماً شادی کیا ہی نہیں کرتے۔ اُن کا اٹھنا بیٹھنا طوائفوں اور بدکار عورتوں کے ساتھ
رہتا ہے۔ لہنگا نے ڈکیتی کی ایک واردات میں تین سال سزائے قید بھی کاٹی تھی۔

یہ جو میں نے تصویر پیش کی ہے، یہ ایک بڑے ہی گھٹیا اور بدصورت آدمی کی تصویر بنتی
ہے لیکن لہنگا خوبرو آدمی تھا، ہنس مکھ بھی تھا اور کپڑے ایسے اچھے، صاف ستھرے اور شریفانہ
پہنتا تھا کہ اس کو نہ جاننے والے لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ شخص سزا یافتہ وارداتیا ہے
اور یہ پیشہ ور جواباز بھی ہے اور چوری اور راہزنی کی وارداتیں بھی کرتا ہے۔ قصبے میں ہر قسم
کے آدمی کے ساتھ اس کی بڑی اچھی سلام دعا تھی اور ہر کسی کی غمی خوشی میں شریک ہوتا تھا۔
اس میں خوبی یہ تھی کہ کبھی کوئی واردات اپنے قصبے میں یا قصبے کے اردگرد قریب کے کسی
گاؤں میں نہیں کی تھی۔ وہ اپنے گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کا ایک بالکا یا شاگرد اس کی روٹی
پانی کا انتظام کیا کرتا تھا۔

خاص بات یہ معلوم ہوئی کہ لہنگے کا بلو نوکرانی کے ساتھ معاشقہ چل رہا ہے۔ بلو کو
جب بھی موقع ملتا تھا وہ لہنگے کے گھر پہنچ جایا کرتی تھی۔ لہنگے اور بلو کے اخلاق اور چال چلن
کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جاتا تھا کہ ان کے یہ تعلقات شریفانہ نہیں لیکن لہنگے کے ایک مخبر
دوست نے بتایا کہ ان کی آپس میں صحیح اور صاف محبت ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ لہنگا بلو
کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر چکا ہے اور کسی بھی دن یہ خبر سنی جائے گی کہ لہنگے نے بلو کے ساتھ
شادی کر لی ہے۔

یہ نئی خبر میرے کسی کام آ سکتی تھی لیکن مجھ کو ایسی توقع ہرگز نہیں تھی کہ اس خبر سے مجھ کو
نقب زنوں کا سراغ مل جائے گا۔ یہ تو میں اپنی عقل کے مطابق اشارے ڈھونڈ رہا تھا کہ
شاید کوئی اشارہ مجھ کو بتا دے کہ فلاں راستے پر چلنا ہے۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مجھ کو یہ پتہ
لگ جاتا کہ کون کس کے ساتھ عشق بازی کر رہا ہے تو مجھ کو ملزم مل جائیں گے۔ میں اس چکر
میں پڑا ہوا تھا کہ گھر بھیدی کا سراغ مل جائے پھر میرا کام کچھ آسان ہو سکتا ہے۔

رات کچھ دیر تک میں مخبروں کی رپورٹیں سنتا رہا اور اپنے دونوں اسسٹنٹ بلائے
اور ان کے ساتھ بھی تبادلۂ خیالات کیا۔

اگلے روز دس ساڑھے دس بجے کے درمیان ایک آدمی یہ اطلاع لایا کہ ایک چھپڑ سے ایک ٹرنک برآمد ہُوا ہے۔ قصبے کے ساتھ ہی چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ اس گاؤں کے ساتھ تقریباً چار کنال چوڑا ایک قدرتی چھپڑ تھا جس میں بارش کا پانی جمع ہوتا رہتا تھا۔ میں اس اطلاع پر وہاں چلا گیا۔

چھپڑ کے کنارے بڑا پرانا بڑ کا ایک درخت تھا جس کا تنا بہت ہی پھیلا ہُوا تھا۔ وہاں کالے رنگ کا ایک ٹرنک پڑا ہُوا تھا جس کو تالا تو لگا ہُوا تھا لیکن تالا کھلا ہُوا تھا۔ وہاں مجھے بتایا گیا کہ گاؤں کی بھینسیں اس چھپڑ کے پانی میں جا کر بیٹھ جاتی ہیں اور گاؤں کے بچے بھی چھپڑ میں اُترتے اور تیرتے رہتے ہیں۔

دو تین بھینسیں چھپڑ کے اندر جا کر بیٹھ گئیں اور ان کو اٹھانے کے واسطے دو لڑکے پانی میں اتر گئے۔ ایک لڑکے کا پاؤں ٹرنک کے ساتھ لگا تو اُس نے ڈبکی لگا کر دونوں ہاتھ ٹرنک کو لگائے اور اس پر پھیرے اور باہر آ کر اُس نے بتایا کہ پانی میں ایک ٹرنک پڑا ہے۔ گاؤں کے آدمیوں کو پتہ لگا تو ان کو شک ہوا کہ یہ ٹرنک اس واردات والا ہی نہ ہو جو سکھ آڑھتی کے گھر ہوئی ہے۔ نقب زنی کی خبر اس گاؤں میں پہنچ گئی تھی۔ اس زمانے میں پولیس دیانتداری سے اپنے فرائض پورے کرتی تھی اور اس وجہ سے لوگ ملزموں کو پکڑنے کے واسطے پولیس کی پوری پوری مدد کیا کرتے تھے۔

دو آدمیوں نے پانی میں اُتر کر ٹرنک نکال لیا اور باہر لے آئے۔ تالا ہٹا کر ٹرنک کھولا تو اس میں پانی بھرا ہُوا تھا اور کپڑے بھی اس میں موجود تھے۔ گاؤں والوں نے فیصلہ کیا کہ ٹرنک یہیں پڑا رہنے دیا جائے اور تھانے اطلاع کر دی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ٹرنک واردات والے گھر کا ہو سکتا ہے۔

میں نے ٹرنک کا رنگ اور سائز دیکھا تو اس سے سمجھ گیا کہ یہ سکھ آڑھتی کے گھر کا ٹرنک ہے۔ ایک آدمی کو دوڑایا کہ وہ سکھ آڑھتی کو ساتھ لے آئے اور ٹرنک کی شناخت کرے۔

سکھ آیا اور دیکھتے ہی اُس نے ٹرنک شناخت کر لیا پھر کپڑے نکال کر دیکھے۔ اس بے چارے نے اتنی تیزی سے کپڑے باہر نکالے جیسے اُس کے زیورات اور رقم بھی اس میں موجود ہوگی لیکن کپڑوں کے سوا اس میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ بعد میں مجھ کو بتایا گیا کہ کپڑوں میں سے کچھ کپڑے نقب زن لے گئے تھے۔ میں نے ٹرنک کی برآمدگی کا کاغذ

کیا اور اس تحریر پر دو گواہوں کے انگوٹھے لگوائے اور ٹرنک تھانے لے آیا۔

میں تھانے میں پہنچا ہی تھا کہ میرے پیچھے پیچھے گاؤں کا ایک سیانا آدمی ایک ادھیڑ عمر عورت کو ساتھ لے کر آیا اور عورت نے مجھ کو یہ بیان دیا کہ آدھی رات کے وقت وہ رفع حاجت کے واسطے گاؤں سے باہر نکلی تو چاندنی میں اس کو تین آدمی نظر آئے جو ٹرنک کھول رہے تھے۔ عورت پیچھے ہی رک گئی اور دیکھتی رہی۔ وہ آدمی بڑ کے نیچے تنے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ چاندنی اتنی صاف تھی کہ وہ آدمی نظر آ رہے تھے لیکن بڑ کے سائے کی وجہ سے ان کے چہرے پہچانے نہیں جاتے تھے نہ یہ نظر آتا تھا کہ انہوں نے ٹرنک میں سے کیا کچھ نکالا ہے۔

پھر انہوں نے ٹرنک بند کر دیا۔ دو آدمیوں نے ٹرنک دونوں طرفوں سے پکڑا اور دو تین ہلارے دے کر ٹرنک پانی میں پھینک دیا۔ پھر دو آدمی ایک طرف چلے گئے اور تیسرا آدمی شہر (قصبے) کی طرف چلا گیا۔ عورت نے صبح اپنے گھر میں ذکر کیا تو اس کے ضعیف العمر سسر نے اُس کو کہا کہ وہ کسی اور کے ساتھ بات نہ کرے، ایسا نہ ہو کہ پولیس اُسی کو گھسیٹتی پھرے۔ حالانکہ اُس زمانے میں ایسا سلوک پولیس عوام کے ساتھ نہیں کیا کرتی تھی۔ اگلے روز جب ٹرنک پانی سے نکال لیا گیا اور میں ٹرنک اٹھوا کر لے آیا تو سسر نے ہی اس عورت کو کہا کہ وہ تھانیدار کے پاس جا کر بیان دے دے۔ اس طرح یہ عورت اپنے خاوند کے ساتھ تھانے آ گئی۔

ایک جوتشی کو ہاتھ دکھایا

میں نے اس عورت سے پوچھا کہ جو آدمی شہر کی طرف آیا تھا، اُس کا قد اور جسم کس طرح کا تھا اور اس نے کیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اُس نے سوچ سوچ کر میرے سوال کا صحیح جواب دینے کی پوری کوشش کی لیکن چہرہ پھر بھی پہچان نہ سکی۔ اس نے وہ سمت بھی بتائی جس طرف دوسرے دو آدمی گئے تھے۔

اُس طرف ایک چوڑی پگڈنڈی جاتی تھی جس پر بیل گاڑیاں اور تانگے چلتے تھے۔ میں نے اُس وقت ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ فلاں فلاں گاؤں کے نمبرداروں کو ساتھ لے آئے۔ وہ گاؤں شہر سے تین چار میل دور تھے۔ میں نے اُن کے نمبرداروں کو یہ کہنا تھا کہ وہ اپنے اپنے گاؤں کے گھروں پر نظر رکھیں اور رات کو بھی دیکھیں کہ کون کسی گھر میں آتا جاتا

ہے۔ نمبرداروں کو معلوم تھا یہ کام کس طرح کرنا ہے۔

اب میرے سامنے دو مشتبہے تھے۔ ایک لہنگا جس کا بڑا گہرا تعلق بلو کے ساتھ تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ بلو نے گھر بھیدی بن کر لہنگے سے ہی یہ واردات کروائی ہو لیکن ساتھ ہی یہ خیال آتا تھا کہ بلو کے ساتھ تو اس گھر میں بیٹیوں جیسا سلوک ہوتا تھا پھر وہ اس گھر کو اتنا زیادہ نقصان پہنچانے کے واسطے کیوں تیار ہوگئی؟ میں جب اس سوال پر غور کرتا تھا تو کچھ اندھیرا سا نظر آتا تھا۔ بہر حال لہنگے کو شامل تفتیش تو کرنا ہی تھا۔

دوسرا مشتبہ امجد تھا۔ امجد کو مال اور دولت کی ضرورت نہیں تھی نہ وہ جرائم پیشہ تھا اگر یہ واردات اس نے ساتھ ہو کر کی یا کروائی تھی تو یہ اس کا انتقامی اقدام تھا۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ اس کو معلوم ہوتا کہ مال کون سے ٹرنک میں رکھا ہوا ہے اور ٹرنک کہاں ہے۔

میں نے سوچا کہ امجد کو پہلے طلب کیا جائے۔ وہ میں نے کیا...... وہ جلدی آ گیا۔ قصبے کا ہی رہنے والا تھا اور اس کا گھر تھانے سے دُور نہیں تھا۔ میں نے اس کو دیکھا تو مجھ کو اچھا لگا۔ قد بھی اس زمانے کے مطابق بڑا ٹھیک ٹھاک اور جسم گٹھا ہُوا تھا اور چہرے سے خوبرو بھی تھا لیکن جب اُس کے ساتھ باتیں ہوئیں تو پتہ لگا کہ عقل کا کورا ہی ہے۔ میں نے دل میں طے کرلیا کہ اس کے ساتھ بلو کی طرح پیار و محبت سے بات کروں گا۔

''امجد بھائی!'' — میں نے اس کو اپنے پاس بٹھا کر کہا — ''تم ملزم نہیں ہو اور مجھ کو تم پر کوئی شبہ بھی نہیں ہے۔ تم ابھی نوعمر ہو اور نہیں جانتے کہ زمین کے نیچے جا کر کوئی حرکت کی جائے تو زمین اس کو اُگل کر باہر پھینک دیتی ہے اور لوگوں کو پتہ لگ جاتا ہے۔ تمہارا تعلق کلونت کور کے ساتھ ہے تو یہ کوئی جرم نہیں نہ میں تم سے اس بابت کوئی سوال کرسکتا ہوں نہ کروں گا۔ میں نے تم سے تھوڑی سی مدد لینی ہے تا کہ ملزموں تک پہنچ سکوں''۔

اس طرح میں نے بات شروع کی اور اس کو کچھ پھونک دی اور کہا کہ سکھوں کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی اس پر مرتی ہے۔ وہ خوش ہوتا رہا اور ذرا سا بھی نہ سمجھ سکا کہ میں اُس سے کس طرح اصل بات نکلوا رہا ہوں۔ میں نے اس طرح ہیر پھیر کر بات کی کہ یہ لڑکی اس کے پیچھے اتنی دیوانی ہوگئی تھی کہ اُس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اُس کے زیورات اور رقم کس جگہ رکھی ہے...... امجد ایسا بے وقوف نکلا کہ پھونک میں آ کر میری ہاں میں ہاں ملاتا گیا اور میری اس بات کو صحیح ثابت کر دیا کہ اس کو معلوم تھا کہ زیورات وغیرہ کہاں رکھے ہیں۔ میں اس پر زور دیتا رہا کہ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ ٹرنک کون سے کمرے میں اور کس جگہ رکھا ہوا تھا۔

میری اس بات پر وہ چونک پڑا اور مجھ سے پوچھا کہ یہ باتیں کیا کلونت کور نے مجھ کو بتائی ہیں؟...... میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ مجھ کو تو یہ بھی معلوم ہے کہ کلونت کور محبت کو ناپاک کرنے پر راضی نہیں ہو رہی تھی۔

''کیا تم اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے؟'' — میں نے پوچھا۔

''نہیں جی!'' — اس نے جواب دیا — ''میری اپنی رشتہ داری میں ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت لڑکی موجود ہے۔ میں نے بھلا ایک سکھنی کے ساتھ ہی شادی کرنی تھی؟ میں تو اس کے ساتھ دوسری قسم کی دوستی چاہتا تھا لیکن ابھی وہ مان نہیں رہی تھی''۔

میں اس کو اور زیادہ سر چڑھاتا گیا اور آخر کہا کہ اب یہ بتا دے کہ اُس نے یہ واردات انتقامی طور پر کروائی ہے یا اُس کا کچھ اور مقصد تھا...... اس بات پر تو وہ تڑپنے لگا اور قسمیں کھا کھا کر کہنے لگا کہ وہ اتنا گھٹیا اور ذلیل آدمی نہیں کہ اتنا بڑا جرم کرتا یا کسی سے کرواتا۔

میں نے کچھ اور سوچا ہُوا تھا۔ میں اُس پر یہی الزام لگاتا رہا کہ اُس نے انتقاماً یہ واردات کروائی ہے اور وہ انکار کرتا رہا۔ میں نے اس کے انکار کو تسلیم نہ کیا اور یہ کہا کہ اب وہ چلا جائے اور میں اُسے پھر بلاؤں گا اور وہ سوچ سمجھ کر مجھ کو جواب دے۔ اگر میں اُس کا انکار تسلیم کر لیتا تو وہ فوراً اُٹھتا اور بھاگ جاتا لیکن وہ تو وہاں سے اٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ وجہ یہ کہ میں اُس کو پکا مشتبہ کہہ رہا تھا۔

بڑی مشکل سے اُس کو اٹھایا اور بھیج دیا۔ میں نے دو مخبر تیار رکھے ہوئے تھے۔ امجد کے جانے کے بعد میں نے ان مخبروں کو بلا کر کہا کہ اب وہ امجد پر نظر رکھیں اور دیکھیں کہ یہ کہاں جاتا ہے اور کس کو ملتا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ رات کے وقت بھی اس کو دیکھتے رہنا ہے...... میں نے سوچا یہ تھا کہ یہ اگر ملزم ہے اور اس نے واردات کروائی ہے یا اس میں خود بھی شامل تھا تو یہ فوراً یا رات کے وقت اپنے ساتھیوں کے پاس ضرور جائے گا اور ان کو بتائے گا کہ تھانیدار نے اس پر شبہے کا صاف اظہار کر دیا ہے۔

اب لہنگے کی باری تھی۔ کچھ جرائم پیشہ مشتبہے ابھی تھانے میں موجود تھے۔ میں نے ان میں سے تین چار کو الگ کیا اور ہر ایک کو الگ الگ کر کے یعنی اکیلے اکیلے اپنے پاس بٹھا کر لہنگے کی بابت پوچھنے لگا۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف کم ہی بولا کرتے تھے لیکن تھانے میں ان کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا، اس سے وہ تنگ آ گئے تھے، اس وجہ سے انہوں

نے کچھ باتیں بتا دیں۔ ان کے خیال میں یہ باتیں کوئی زیادہ اہم نہیں تھیں لیکن میرے واسطے یہ باتیں کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ ان سب کی بتائی ہوئی باتوں سے یہ پتہ لگا کہ لہنگا اس قصبے سے ہمیشہ کے لئے جا رہا تھا۔

میں نے وجہ پوچھی تو یہ جواب ملا کہ لہنگا اس وہم میں مبتلا ہو گیا ہے کہ اس کی قسمت بگڑ گئی ہے اور یہ قصبہ اس کے واسطے منحوس ثابت ہو رہا ہے۔ وہ مسلسل جوا ہار رہا تھا اور کچھ عرصے سے اس نے کوئی واردات نہیں کی تھی۔ اس کے دل پر یہ ڈر بیٹھ گیا تھا کہ اس نے واردات کی تو پکڑا جائے گا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ یہ لوگ وہمی ہوتے ہیں اور جوتشیوں اور نجومیوں کے پاس جاتے رہتے ہیں۔ ان جرائم پیشہ اشخاص نے مجھ کو بتایا کہ لہنگے نے ایک جوتشی کو ہاتھ دکھایا تھا تو جوتشی نے اس کو کہا تھا کہ وہ اس شہر سے نکل جائے تو پھر اس کی قسمت جاگ اٹھے گی۔ قصبے سے ہمیشہ کے واسطے چلے جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں اس کی دو آدمیوں کے ساتھ بڑی سخت دشمنی ہو گئی تھی۔ وہ آدمی اتنی طاقت اور اثر والے تھے کہ اس کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔

لہنگے کا بالکا

میں نے لہنگے کو پھانسنے کا ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ میں نے جس طرح امجد کو پریشان کر کے بھیجا اور اُس پر مخبر لگا دیئے تھے اسی طرح میں لہنگے کے ساتھ بھی کر سکتا تھا لیکن وہ تمام مخبروں کو اچھی طرح جانتا اور پہچانتا تھا اس واسطے اس کے ساتھ امجد والا طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ڈیڑھ دو گھنٹے صرف کر کے ایک خاص انتظام کیا۔ یہ سارا انتظام جب مکمل ہو گیا، اُس وقت غالباً ایک یا ڈیڑھ بج گیا تھا۔ لہنگے کے ایک شاگرد کو جو اس کے ساتھ رہتا اور اس کے کھانے پینے کا انتظام کرتا تھا، ایک کانسٹیبل کو بھیج کر تھانے بلوایا۔ اُس کا نام پتہ ان ہی مشتبہوں سے معلوم کر لیا تھا۔

کانسٹیبل اُسے جلد ہی لے آیا۔ وہ بائیس تئیس سال عمر کا نوجوان تھا۔ آڑھت کی منڈی میں کوئی محنت مزدوری کا کام کرتا تھا اور چھوٹی موٹی چوری چکاری کر لیا کرتا تھا۔ میں نے پہلے تو اس کو ڈرایا اور کہا کہ لہنگے کو نہ بتانا کہ تمہیں تھانے طلب کیا گیا تھا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ نہیں بتائے گا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ سکھ آڑھتی کے گھر جس رات

نقب لگی اس رات لہنگا گھر میں تھا یا نہیں۔ شاگرد نے ذرا جھجک کر جواب دیا کہ وہ گھر سویا ہُوا تھا۔

اس وقت اے ایس آئی میرے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ میں نے شاگرد کی طرف سے توجہ ہٹا کر اے ایس آئی کے ساتھ دھیمی آواز میں باتیں شروع کر دیں۔ مجھ کو معلوم تھا کہ لہنگے کا یہ بالکا میری باتیں سن رہا ہے۔ میں اے ایس آئی کے ساتھ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا کہ مجھ کو لہنگے پر پورا شک ہے اور وہ اس واردات میں شامل تھا۔

میں پھر شاگرد کی طرف متوجہ ہُوا اور اس سے دو تین اور ویسے ہی بے معنی سی باتیں پوچھیں اور پھر ایک دو باتیں اے ایس آئی کے ساتھ کیں۔ میرا بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے رازداری کی باتیں کی جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے لہنگے کے اس شاگرد یا ساتھی کو جانے کی اجازت دے دی اور پھر کہا کہ وہ لہنگے کو نہ بتائے کہ اُس کو تھانے بلایا گیا تھا۔

شاگرد اٹھا اور باہر کو چل پڑا۔ وہ دروازے میں سے نکل رہا تھا تو میں نے کہا کہ آج رات لہنگے کو گرفتار کر لوں گا۔ مجھ کو پکا یقین تھا کہ یہ شخص سیدھا لہنگے کے پاس جائے گا اور اُس کو بتائے گا کہ وہ تھانے سے آیا ہے اور تھانیدار کیا کہہ رہا تھا۔

مجھ کو توقع یہ تھی کہ لہنگا بے گناہ ہُوا تو وہ سیدھا میرے پاس آئے گا اور اپنی بے گناہی ثابت کرے گا۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ جرائم پیشہ لوگ تھانے کے ہر بندے کے ساتھ سلام دعا رکھتے تھے اور چھوٹے بڑے تھانیداروں کو تو وہ خاص طور پر سلام کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ ہمارا تعلق رہتا ہی تھا۔

لہنگے کا یہ بالکا کوئی فرشتہ نہیں تھا بلکہ عادی چور اچکا تھا۔ اُس نے لہنگے کو میری باتیں سنائی ہی تھیں۔ باقی دن بھی گزر گیا اور رات آ گئی لیکن لہنگا تھانے نہ آیا نہ ہی تھانے کے کسی اور آدمی سے ملا۔ مخبروں نے مجھ کو یہ اطلاع دے دی تھی کہ لہنگا یہیں ہے اور اپنے گھر میں موجود ہے۔ اُس کو معلوم نہیں تھا کہ میں نے اُس کے ارد گرد مکڑی کی طرح کا جالا بُن دیا ہے اور اگر وہ نقب زنی کا مجرم ہُوا تو اس جالے میں سے نکل نہیں سکے گا۔ اتنی لمبی چوڑی اور گہری تفتیش کر کے مجھ کو پکا شبہ ہو گیا تھا کہ لہنگا اس واردات میں شامل ہے اور گھر بھیدی بلو ہے۔ امجد کو میں نے اب دوسرے نمبر پر رکھ دیا تھا۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ اُس زمانے میں چھوٹے قصبوں اور دیہات میں رات کے دس بجے کو لوگ آدھی رات کہا کرتے تھے۔ میں تھوڑی ہی دیر پہلے لیٹا اور سو گیا تھا۔

ایک کانسٹیبل نے آکر مجھ کو جگایا اور بتایا کہ اطلاع آئی ہے کہ لہنگا بلو کو ساتھ لے کر کہیں جا رہا ہے۔ میں اچھل کر اٹھا۔ وردی نہ پہنی، شلوار قمیض میں ہی دوڑتا ہوا تھانے پہنچا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور چھ کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا۔ سب کے پاس رائفلیں تھیں۔ میرے پاس اور ہیڈ کانسٹیبل کے پاس ریوالور تھے۔

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میرا انتظام کیا تھا۔ لہنگے کے گھر کے سامنے والے گھر میں اور اس کے دائیں اور اس کے بائیں دونوں گھروں میں مخبر بٹھا دیئے تھے۔ دو گھروں کے لڑکے ہی مخبر بن گئے تھے۔ سامنے والے گھر میں میرا ایک تجربہ کار مخبر جا کر چھپ گیا تھا۔

ان تینوں کو تھانے بلا کر میں نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ انہوں نے لہنگے کے گھر پر نظر رکھی اور میرا جو اپنا مخبر تھا وہ رات کو مجھ کو اطلاع دینے آ گیا۔ اُس نے عقلمندی یہ کی کہ ایک مخبر لڑکے کو لہنگے اور بلو کے پیچھے لگا دیا اور وہ دیکھتا رہے یہ دونوں کدھر جاتے ہیں لیکن خود ان کو نظر نہ آئے۔

صاف اور سفید چاندنی نے ہماری بہت مدد کی۔ ان دونوں مخبروں نے میری رہنمائی کی۔ لہنگا بلو کو ساتھ لئے ہوئے قصبے سے نکل گیا تھا۔ وہ کھیتوں میں جا رہا تھا۔ اس طرف کچھ علاقہ ایسا تھا جہاں کوئی فصل نہیں تھا نہ کوئی کھیت تھا۔ یہی وہ علاقہ تھا جہاں وہ چھپڑ تھا جس میں سے ٹرنک نکلا تھا۔ میں نے دونوں کو دیکھ لیا۔ وہ دونوں کھیتوں میں جا پہنچے جہاں فصل کھڑے تھے۔ وہ پگڈنڈی کو چھوڑ کر کھیتوں میں سے گزر کر جا رہے تھے۔

میں نے اپنی گارد کو بتایا کہ وہ میرے پیچھے فاصلہ رکھ کر اس طرح آئے کہ لہنگا پیچھے مڑ کر دیکھے تو اُس کو گارد نظر نہ آ سکے۔ میں نے دونوں مخبروں کو واپس بھیج دیا۔ انہوں نے پوری کامیابی سے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔

میں جھک کر آگے بڑھا اور فصلوں کی مینڈھوں پر چلنے لگا۔ چند قدم جا کر میں سر اوپر کرتا اور ان دونوں کو دیکھ لیتا تھا۔ اونچے فصلوں میں اُن کے صرف سر ہی نظر آتے تھے۔

اب تو میں شیر ہو گیا تھا۔ کوئی شک اور کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ میرا ملزم لہنگا ہی ہے۔ بلو کا اس کے ساتھ جانا پکا ثبوت تھا۔ میں اس کو وہیں پکڑ سکتا تھا اور اس سے پوچھتا کہ اس لڑکی کو وہ کہاں لے جا رہا ہے لیکن میں اس کو اُس جگہ پکڑنا چاہتا تھا جہاں یہ جا رہا تھا۔ وہ یقیناً اپنے اُن ساتھیوں کے پاس جا رہا تھا جن کے پاس نقب زنی کا مال تھا۔ اس نے اپنا حصہ وصول کر کے آگے چلے جانا تھا۔ یہ تو مجھ کو پہلے پتہ لگ گیا تھا کہ یہ ہمیشہ کے لئے یہاں

سے جا رہا ہے اور اس نے بلو کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ایک عورت نے بتایا تھا کہ تین آدمیوں نے ٹرنک یہاں کھولا اور پھر ٹرنک چھپڑ میں پھینک دیا تھا اور دو آدمی اس سمت چلے گئے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی قصبے میں واپس آیا تھا۔ اب مجھ کو یقین ہو رہا تھا کہ قصبے میں آنے والا آدمی لہنگا ہی تھا۔ اب میں نے اس کے دو ساتھیوں کو بھی پکڑنا تھا۔

بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جو لکھے نہیں جا سکتے یا شاید مجھ جیسے لکھاری ان کو لفظوں میں ٹھیک طرح بیان نہیں کر سکتے، یہ واقعات دیکھنے والے ہوتے ہیں اور اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ان کی فلم دیکھی جائے۔ میں آپ کو فلم تو نہیں دکھا سکتا، لفظوں میں بتا سکتا ہوں کہ یہ تعاقب کس طرح کا تھا۔ وہ دونوں یقیناً ہنسی خوشی جا رہے ہوں گے کہ پولیس کو اور سکھ آڑھتی کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اب لوٹے ہوئے مال سے مالدار ہو کر کہیں دُور جا کر نئی زندگی بنائیں گے۔ میں جھکا جھکا ان کے پیچھے پیچھے مینڈھوں پر جا رہا تھا اور یہ ڈر بھی تھا کہ ایسا نہ ہو کہ میں سر اوپر اٹھا کر ان کو دیکھوں اور وہ مجھ کو دیکھ لیں۔ میں اس صورت میں بھی ان کو گرفتار کر سکتا تھا لیکن لہنگا بڑا چالاک آدمی تھا۔ بلو یہ بیان دے سکتی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ جا رہی تھی۔ مطلب یہ کہ میں بہت ہی احتیاط سے اس ان کا تعاقب کر رہا تھا اور پیچھے خاصے فاصلے پر میری گارد آ رہی تھی۔ گارد کے واسطے بھی ضروری تھا سر نیچے کر کے چلے اور پاؤں کی آواز نہ آئے اور کوئی کھانسے بھی نہیں یعنی مکمل خاموشی اختیار کرنی تھی۔

بلّو کا بھید

آخر ایک چھوٹا سا گاؤں آ گیا اور لہنگا بلو کے ساتھ اس گاؤں میں داخل ہو گیا۔ یہ گاؤں قصبے سے اڑھائی پونے تین میل دُور تھا۔ میں نے اور میری گارد نے اتنا زیادہ فاصلہ جھک کر طے کیا تھا۔ اس پوزیشن میں چلنے سے آدمی بڑی جلدی تھک جاتا ہے اور ہڈیاں دُکھنے لگتی ہیں۔

وہ دونوں جب گاؤں میں داخل ہوئے تو میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں سیدھا کھڑا ہو کر تیز چل پڑا اور گاؤں میں داخل ہو گیا۔ ان دونوں کو ایک گھر میں داخل

ہوتے دیکھ لیا۔ میں رک گیا اور گارد کا انتظار کرنے لگا۔ دس بارہ منٹ بعد میری گارد آ گئی اور میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ نمبردار کو جگائے لیکن شور نہ ہو۔

ہیڈ کانسٹیبل کو نمبردار کا گھر معلوم تھا۔ اُس نے نمبردار کو جگایا اور میں بھی اُس کے پاس چلا گیا اور کہا کہ فلاں مکان کے پیچھے سیڑھی لگا دو۔ سیڑھی کا انتظام ذرا سی دیر میں ہو گیا۔ میں نے تین کانسٹیبل سیڑھی سے اس مکان کی چھت پر چڑھا دیئے اور خود اس مکان کے دروازے پر جا پہنچا۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ وہ گاؤں کے کچے مکان تھے جو زیادہ اونچے نہیں تھے۔

میں دروازے پر دستک دینے لگا تو اندر صحن سے کسی کی آواز آئی — ''اوئے کوٹھے پر کون ہے؟'' — وہ میرے کانسٹیبل تھے جو چھت پر چڑھے تو ان کے قدموں کی آواز نیچے والوں کو سنائی دی۔ ادھر میں نے بڑی زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

کوئی آدمی کمرے سے صحن میں نکل آیا تھا۔ چھت سے ایک کانسٹیبل نے اس کو کہا، جاؤ فوراً دروازہ کھول دو، تھانیدار صاحب آئے ہیں ...... دروازہ کھل گیا اور میں ہیڈ کانسٹیبل اور دوسرے کانسٹیبلوں کے ساتھ اندر چلا گیا اور صحن میں سے گزر کر سامنے والے کمرے میں گیا۔

ہمارے پاس بڑی ٹارچیں تھیں جن کی روشنی میں ہم نے سب کو دیکھا اور کہا کہ لالٹین یا دیے جلا دو۔ کمرے میں ایک بوڑھا تھا، ایک جوان آدمی تھا، اس کی بیوی اور دو بچے تھے، لہنگا اور بلو بھی وہیں تھے۔

''مال فوراً نکال دو'' — میں نے کہا — ''لہنگے! میں تم سے بالکل نہیں پوچھوں گا کہ اس لڑکی کو یہاں کیوں لائے ہو۔ مجھ کو سب معلوم ہے۔ خود مال نہیں نکالو گے تو تلاشی لوں گا، نہ ملا تو کھال ادھیڑ دوں گا اور سوچ لو تمہارے بچنے کی کوئی صورت نہیں ...... یہ بتا دو کہ تمہارا تیسرا ساتھی کون ہے اور کہاں ہے۔ اُس کو بھی حاضر کرو''۔

کمرے میں ایسا سناٹا طاری ہو گیا جیسے یہاں کوئی انسان ہے ہی نہیں۔ دو بچے تھے چھوٹے تھے، وہ بے فکری کی نیند سوئے ہوئے تھے۔

اچانک بوڑھا بم کی طرح پھٹا۔ اُس کے منہ سے تین چار گالیاں نکلیں جو اُس نے اپنے بیٹے کو دی تھیں۔ وہ جوان آدمی جو اس کمرے میں موجود تھا، اس بوڑھے کا بیٹا تھا۔ بوڑھے نے گالیاں دے کر انتہائی غصے کے عالم میں اس کو کہا کہ مال نکال دو یا یہ چاہتے ہو

کہ میں بھی اس عمر میں پکڑا جاؤں اور باقی عمر جیل خانے میں گزار دوں۔ بوڑھے نے اُس کو اور زیادہ گالیاں دے کر کہا کہ اس جوان بیوی اور معصوم بچوں کو بھی دیکھو۔ مال برآمد نہیں کراؤ گے تو تھانیدار صاحب ان کو بھی پکڑ کر تھانے لے جائیں گے۔

میں نے اُن کو بتایا کہ ان کے کھرے اور پوری شہادت میرے پاس موجود ہے، بچ کر جائیں گے کہاں۔

آخر لہنگا بولا اور اُس نے اپنے اس ساتھی سے کہا کہ چلو یار، مال دکھا دو...... دونوں مجھ کو صحن میں کھرلی کے پاس لے گئے اور بتایا کہ مال اس کھرلی کے اندر گڑھا کر کے اس میں دبایا ہُوا ہے۔ میں نے کہا کہ تیسرے ساتھی کی نشاندہی کرو۔ وہ بھی انہوں نے کر دی۔

ان کی نشاندہی کے مطابق ان کا تیسرا ساتھی یہاں سے دو میل دور ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ میں نے اُسی وقت ہیڈ کانسٹیبل کو چار کانسٹیبل دیئے اور کہا کہ وہ فوراً روانہ ہو جائیں اور اس کو پکڑ لائیں۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو یہ بھی کہا کہ تیسرا ساتھی آئے گا تو پھر مال کی برآمدگی کریں گے۔ یہ پارٹی اُسی وقت روانہ ہو گئی۔ اُس وقت لوگ زیادہ تر پیدل چلتے تھے اور پیدل چلنے کی اتنی پریکٹس ہوتی تھی کہ لوگ لمبے لمبے فاصلے تھوڑے سے وقت میں طے کر لیا کرتے تھے۔

یہ پارٹی تیسرے ملزم کو پکڑ کر لے آئی اور اس میں اڑھائی گھنٹے لگ گئے۔ میں یہ اڑھائی گھنٹے اسی گاؤں میں اور اسی گھر میں رہا اور اس دوران بلو میرا دماغ چاٹتی رہی۔ وہ مجھ کو اپنا دوست سمجھتی تھی اور میرے پاس بیٹھ کر بار بار منت کرتی تھی کہ میں لہنگے کو اور اُس کو چھوڑ دوں۔ اُس نے یہ بھی کہہ دیا کہ گھر بھیدی کا کام اُس نے کیا تھا اور لہنگے کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ مال کون سے ٹرنک میں رکھا ہے اور وہ ٹرنک تین ٹرنکوں کے نیچے پڑا ہے۔ بلو نے سادگی میں یہ بھی بتا دیا کہ اس نے لہنگے کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ ٹرنک کو تالا کس قسم کا لگا ہُوا ہے۔ لہنگے نے چابیاں بنانے والے لوہار کو یہ قسم بتا کر چابی بنوا لی تھی۔ انہوں نے یہ تالا چھپڑ کے پاس آ کر کھولا تھا۔

بلو کو میں دھتکارنا نہیں چاہتا تھا اور اس پر تھانیداری کا رعب بھی ڈالنے کو جی نہیں چاہتا تھا، اس واسطے میں اس کے ساتھ پیار محبت والا سلوک کرتا رہا۔ وہ بے چاری سمجھتی تھی کہ کسی مرد کو خوش کرنا ہو تو اپنا آپ اس کے حوالے کر دو۔ اُس نے یہ پیشکش بھی کی، تب

میں نے اُس کو یہ لفظ کہے کہ بلو، قانون میرا نہیں بادشاہوں کا ہے اور میں اس قانون کو توڑ مروڑ نہیں سکتا۔

تینوں ملزموں نے دو گواہوں کی موجودگی میں نشاندہی کی کہ مال کھرلی کے اندر دبا ہُوا ہے۔ لہنگے نے آگے بڑھ کر کھرلی میں ایک جگہ سے چارہ ہٹا کر ایک اینٹ ہٹائی اور ہاتھوں سے مٹی باہر نکالی اور پھر ایک گٹھڑی سی کھینچ کر وہاں سے باہر نکالی اور میرے حوالے کر دی۔

میں نے گٹھڑی کھولی تو اس میں سے سارے زیورات اور رقم برآمد ہوئی۔ قیمتی کپڑے جوان لوگوں نے ٹرنک سے نکالے تھے، وہ بھی اسی گھر کے اندر رکھے ہوئے ایک صندوق سے برآمد ہوئے۔ میں نے مال کی برآمدگی کا مشیر نامہ تحریر کیا اور دونوں گواہوں کے انگوٹھوں کے نشان لگوائے اور پھر تینوں ملزموں کو ہتھکڑیاں لگوا دیں۔ ہر کانسٹیبل کے پاس ایک ہتھکڑی تھی۔ اب سب کو اور اس بوڑھے کو بھی ہم تھانے لے آئے۔ میں نے معصوم بچوں کا خیال کرتے ہوئے اس جوان عورت کو گھر میں ہی رہنے دیا جو ایک ملزم کی بیوی تھی۔

کہانی تو یہاں پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پولیس کی کارروائیاں تھیں اور ملزموں کے اقبالی بیانات تھے جو سنانے کوئی ضروری نہیں۔ میں جب ملزموں کو لے کر اپنے تھانے پہنچا تو صبح طلوع ہو چکی تھی۔ ہر ملزم نے الگ الگ مجھ کو کہا کہ اُس کو وعدہ معاف گواہ بنا لوں۔ میں نے ہر کسی کے ساتھ وعدہ کر لیا اور تینوں کے اقبالی بیان بمعہ تفصیلات لے لئے۔

یہ واردات لہنگے نے کروائی تھی۔ اُس کو اتنی زیادہ رقم درکار تھی جس سے وہ کسی دوسری جگہ جا کر آباد ہو جاتا۔ بلو کے معاملے میں وہ سنجیدہ بھی تھا اور مخلص بھی۔ وہ اس لڑکی کو داشتہ نہیں بلکہ بیوی بنانا چاہتا تھا۔ میرے پوچھنے پر لہنگے نے بتایا کہ اس کے بالکے نے اس کو بتا دیا تھا کہ تھانیدار اس پر شک کر رہا ہے اور اُس کو گرفتار کر لے گا۔ لہنگے نے کہا کہ وہ اسی وقت بھاگ جاتا لیکن بلو نہیں مل رہی تھی اور بلو کے بغیر اس نے جانا ہی نہیں تھا۔ بلو اس کو شام کے وقت ملی اور اس نے بلو کو بتایا کہ آج رات نہ بھاگے تو کل حوالات میں ہوں گے۔ لہنگا اس گاؤں میں اپنا حصہ لینے آیا تھا اور یہاں سے اس نے رات کو ہی آگے روانہ ہو جانا تھا اور اس کی منزل لاہور تھی۔

بات تو ختم ہو گئی ہے لیکن میں بلو کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ دیکھیں کہ پیار کی محرومی اور دوسری محرومیاں انسان کے دماغ کا کیا حال کر دیتی ہیں۔ بلو دراصل ایک نفسیاتی کیس تھی۔ وہ بدکار نہیں تھی لیکن پیار کے جھانسے میں آ کر اس سے بدی بھی کروائی گئی۔

بلو کی ماضی کی کہانی پوری سنانے لگوں گو بڑی لمبی ہے لیکن میں یہاں مختصر سناؤں گا۔ اس کا باپ دکاندار تھا۔ بلو اس کی واحد اولاد تھی۔ وہ دس برس کی تھی تو ماں مر گئی۔ باپ نے اس کے ساتھ بہت پیار کیا لیکن ایک سال بعد وہ بھی مر گیا۔ نہ جانے کہاں سے بلو کا ایک چچا آن ٹپکا اور اُس نے مکان اور دکان پر قبضہ کر لیا اور اُس نے یہ کہا کہ اس نے مکان بلو کے باپ کی بیماری کے دوران اُس سے اپنے نام لکھوا لیا تھا۔

چچا بلو کو اپنے گھر لے گیا۔ بلو ماں باپ کو یاد کر کر کے روتی تھی تو اس کو مارتے پیٹتے تھے۔ پھر اس کے ساتھ یہ سلوک ہوا کہ چچا کے بچوں نے بلو کو اپنی نوکرانی سمجھ لیا۔ وہ تو اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی اور لاڈ اور پیار میں پلی تھی لیکن اب اُس کے واسطے پیار ختم ہو گیا تھا اور پیچھے مار پٹائی اور دھتکار رہ گئی تھی۔

اُس کی عمر 14 سال ہوئی تو اُس نے پیار کی تلاش میں بھٹکنا شروع کر دیا۔ وہ بہت خوبصورت تو نہیں تھی لیکن اچھی خاصی صورت والی نکلی اور اس کے نین نقش بھی اچھے تھے۔ وہ تو پیار کی پیاسی تھی۔ جہاں اس کو پیار کی جھلک ملی وہاں کی ہی ہو کے رہ گئی لیکن پیار کرنے والے ہوس کار نکلے۔ یہیں سے وہ بدنام ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ امجد نے بھی ایک بار اس کو پیار کا ایسا ہی دھوکہ دیا تھا۔

ایک بار وہ چچا کے گھر سے بھاگ کر ایک اور گھر میں چلی گئی اور اُن کی نوکرانی بن گئی لیکن اُس کے اندر ایسی بے چینی اور تشنگی تھی کہ ہر کسی سے پیار کی توقع رکھتی تھی۔ اسی تشنگی نے اس کے خلاف غلط فہمیاں پیدا کر دیں اور وہ ذلیل و خوار ہوتی رہی۔ آخر گوردوارہ کمیٹی تک یہ مسئلہ پہنچا تو کمیٹی نے اس کو اس سکھ آڑھتی کے حوالے کر دیا۔

اُس کی یہی جذباتی محرومی تھی جس نے اُس کو میرے جال میں اُلجھا دیا تھا اور میں نے اُس کی اس فطری تشنگی کو سمجھتے ہوئے پیار اور محبت کی جھلک دکھائی تو وہ میری ہی ہو کر رہ

گئی۔ اس کو خیال ہی نہ آیا کہ میں تھانیدار ہوں اور تفتیش کر رہا ہوں۔

بلو کو صحیح پیار لہنگے سے ملا۔ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ خود لہنگا بھی ا محرومیوں کا شکار ہو کر جرائم پیشہ بن گیا تھا۔ اُس نے بلو کو پورے خلوص کے ساتھ او گہرائیوں سے چاہا تھا اور اس کو اپنے گھر میں آباد کرنے کے واسطے یہ واردات کی یہ پکڑے نہ جاتے تو لاہور پہنچ کر آباد ہو جاتے۔

تینوں ملزموں کو سات سات سال سزائے قید ہوئی اور بلو کو اعانت جرم می سال سزا دی گئی تھی۔

⁂ ⁂ ⁂

خودکُشی سے قتل تک

اللہ نے انسان کی فطرت بھی کیا چیز بنائی ہے۔ انسان شروع سے ہی ایک ہی قسم رتا چلا آ رہا ہے۔ ان گناہگاروں میں سے کئی ایک کو دنیا میں ہی سزا مل جاتی ہے ھنے والے انسان ذرا جتنی بھی عبرت حاصل نہیں کرتے اور ویسے ہی گناہ کرتے ا۔

ئی کے پہلے ہفتے میں اخباروں میں ایک خبر پڑھی۔ کسی بینک کے ایک آفیسر نے یوی کو چھوڑ دیا اور بینک میں کام کرنے والی ایک لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ ابھی ل ہی گزرا تھا کہ یہ آفیسر دوسری بیوی سے بھی تنگ آ کر ایک ہوٹل میں چلا گیا اور کمرے میں رہنے لگا۔ اس کا کمرہ تین دن اندر سے بند رہا اور آخر دروازہ توڑ کر اُس کی لاش چھت کے پنکھے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ اُس نے ایک تحریر چھوڑی تھی نے پڑھی۔ اُس نے لکھا کہ دوسری بیوی نے اُس کے ساتھ وفا نہیں کی۔ دوسری اصل کھانے پینے والی اور عیش عشرت کرنے والی لڑکی تھی۔ اُس نے اس شخص کو کھا دیئے اور اُس کے اخراجات پورے کرنے کے واسطے اس بینک آفیسر نے غبن ازی سے کچھ رقم حاصل کی تھی لیکن اس کی حرام خوری کی یہ واردات پکڑی گئی۔ اس ے اس صورتِ حال سے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پہلی بیوی سے شرمساری بھی س نے فرار کا یہ راستہ اختیار کیا کہ اپنے آپ کو پھانسی دے لی اور پیچھے ایک کی و بیویاں چھوڑ گیا۔

میں نے جب یہ خبر پڑھی تو میرا ذہن پستول سے نکلی ہوئی گولی کی رفتار سے دور پیچھے ری تک جا پہنچا جب میں پاکستان کے ایک بڑے شہر کے ایک تھانے کا ایس ایچ او کا پاکستان نہیں بنا تھا۔ جنگ عظیم کا آخری وقت تھا۔ ایسی ہی ایک واردات ہوئی تھی نے اس کی تفتیش کی تھی۔ واردات ایسی ہی تھی جیسی اس خبر میں بیان کی گئی تھی لیکن

آگے چل کر اس کے حالات اور واقعات مختلف ہو گئے تھے۔ میں اس بڑے شہر کا
لکھوں گا اور اشخاص کے جو نام لکھوں گا وہ سب اصلی کی بجائے فرضی ہوں گے، اس
کہ اس خاندان کے افراد یقیناً زندہ اور سلامت ہوں گے۔

ایک روز صبح ساڑھے نو دس بجے کے درمیان ایک بڑی اچھی وضع قطع کا آ
صاحب حیثیت اور اونچی تعلیم والا لگتا تھا، تھانے میں آیا اور یہ رپورٹ دی کہ اس کی
گھر میں قتل ہوگئی ہے۔ اس شخص کی عمر پینتالیس چھیالیس سال لگتی تھی۔ اس نے بتا
اپنے دفتر میں تھا جب اس کے پڑوسی نے اس کو ٹیلیفون کیا کہ وہ فوراً گھر پہنچے، اس
کہ اس کی بیوی قتل ہوگئی ہے۔ اس اطلاع پر وہ فوراً اپنے گھر پہنچا۔ اس نے بتایا کہ
گھر اس کو پتہ لگا کہ علی الصبح جمعدارنی اپنے کام کاج کے واسطے آئی تو اس نے دیکھا
شخص کا نوکر برآمدے میں فرش پر اس حالت میں پڑا ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں
کی پگڑی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور اس کے منہ میں ایک کپڑا ٹھونسا ہوا
جمعدارنی ڈر گئی اور اس نے باہر نکل کر شور شرابہ کیا تو کچھ لوگ اندر آئے۔ انہوں نے
کھولا اور نوکر کے کہنے پر وہ اندر گئے تو بیڈروم میں پلنگ پر اس عورت کی لاش پڑی
تھی۔

میں نے اس شخص سے پوچھا کہ وہ کس وقت گھر سے نکلا تھا۔ اس نے جواب
کر مجھ کو حیران کر دیا۔ اس نے کہا وہ گھر میں موجود نہیں تھا اور وہ پانچ چھ دنوں سے
ہوٹل میں کمرہ لے کر رہ رہا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بلا جھجک جواب دیا
کے ساتھ تھوڑی سی ناراضگی ہوگئی تھی اس واسطے اس کو تھوڑا سا ڈرانا تھا۔ اس کو ڈ
طریقہ یہ اختیار کیا کہ وہ ہوٹل میں جا کر رہنے لگا۔ اس نے کہا کہ ایک دو دنوں بعد
پھر گھر آ جانا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ بیوی کو سبق سکھانا چاہتا تھا۔ بہرحال کسی پڑوسی
مقتولہ کے خاوند کو یعنی اس شخص کو دفتر ٹیلی فون کیا اور وہ دفتر سے گھر آ گیا۔

نوکر سے تو میں نے خود پورا بیان لینا تھا۔ اس شخص نے جس کو میں کہانی کے
واسطے قریشی کہوں گا، نوکر کی جو بات سنائی وہ یہ تھی کہ رات کے گیارہ بجے کے
دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر کی آنکھ کھلی اور وہ سر پر پگڑی لپیٹ کر باہر نکلا ا
کھولا۔ دو آدمی اندر آئے۔ نوکر نے برآمدے کی بتی جلا لی تھی۔ ان دونوں آدمیوں
نوکر کو دھکیلا اور اندر آ گئے۔ نوکر کو کہا کہ وہ اونچی آواز نہ نکالے ورنہ مارا جائے گا۔

نوکر کو برآمدے میں دونوں نے گرا لیا اور اس کی پگڑی کے ایک سرے سے اس
کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھے اور اسی پگڑی سے اس کے پاؤں بھی باندھ دیئے۔ پھر انہوں
نے نوکر کی قمیض کے پچھلے حصے کو پھاڑ لیا اور یہ کپڑا اس کے منہ میں دے دیا۔ ان میں ایک
آدمی اس کے قریب کھڑا رہا اور دوسرا اندر چلا گیا۔ اس کو معلوم نہیں ہوا کہ اندر جانے
والے نے کیا کیا ہے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ باہر آیا اور دونوں چلے گئے۔ نوکر ساری
رات بندھا پڑا رہا۔ صبح جمعدارنی کے شور و غل پر لوگوں نے آ کر اس کو کھولا۔

میں نے جو ضروری کاغذات تیار کرنے تھے وہ کئے اور قریشی کے ساتھ چل پڑا۔ وہ
جس علاقے میں رہتا تھا وہ اس شہر کی ایک نئی آبادی تھی۔ جنگ عظیم نے بعض لوگوں کو اتنا
زیادہ پیسہ دے دیا تھا کہ انہوں نے پرانے مکان گرا کر نئی طرز کے بنا لئے تھے یا شہر میں
کہیں پلاٹ لے کر نئے مکان تعمیر کر لئے تھے۔ قریشی کا مکان نیا تھا۔ قریشی کاروباری
آدمی نہیں تھا بلکہ وہ وہاں کے فوجی ہیڈکوارٹر میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ میں اس فوجی ہیڈکوارٹر کا
نام نہیں لینا چاہتا ورنہ اس شہر کی نشاندہی ہو جائے گی۔ یہ جی ایچ کیو نہیں تھا۔ اس وقت جی
ایچ کیو دلی میں ہوتا تھا۔ قریشی نے جب بتایا کہ وہ سپرنٹنڈنٹ ہے تو میں سمجھ گیا کہ یہ مکان
فضل ربی سے بنا ہے، تنخواہ میں سے ایسا مکان کوئی نہیں بنا سکتا۔

وہ مجھے اس کمرے میں لے گیا جہاں اس کی بیوی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ یہ ان کا
بیڈروم تھا جس میں دو پلنگ پڑے ہوئے تھے۔ لاش دونوں پلنگوں پر پڑی تھی۔ میں نے
سب سے پہلے دیکھا کہ لاش کی گردن پر ایسے نشان تھے جو ظاہر کرتے تھے کہ اس کا گلا گھونٹا
گیا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ گلا ہاتھوں سے گھونٹا گیا ہے۔ پھر میں نے
لاش کے پورے جسم کو دیکھا۔ کہیں بھی چوٹ یا زخم کا نشان نہیں تھا۔

مقتولہ نے کھلا پاجامہ اور لمبا کرتہ سا پہن رکھا تھا۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا اور
اس نتیجے پر پہنچا کہ مقتولہ کی عزت پر حملہ نہیں کیا گیا۔ مجھ کو ایک اور خیال آ گیا۔ میں نے
قریشی سے پوچھا کہ گھر سے زیورات یا نقد بھی رقم غائب ہوگی۔ اس نے پورے یقین کے
ساتھ جواب دیا کہ یہ تو وہ پہلے ہی دیکھ چکا ہے۔ کوئی ایک بھی چیز چوری نہیں ہوئی۔ گھر میں
زیورات بھی تھے اور نقد رقم بھی خاصی تھی۔ یہ سارا مال وہیں جوں کا توں پڑا تھا جہاں رکھا
گیا تھا۔

مقتولہ بہت ہی خوبصورت عورت تھی۔ اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ

بالکل گورا تھا۔ قاتل نے اتنی خوبصورت عورت کی عزت پر حملہ نہیں کیا، گھر سے کوئی
چوری نہیں ہوئی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ انتقامی قتل کی واردات ہے۔ قریشی نے
کی بے جا حق تلفی کی ہوگی یا اپنے کسی ماتحت کو نوکری سے نکلوا دیا ہوگا۔ اُس شخص نے
سے یوں انتقام لیا کہ اس کی اتنی خوبصورت بیوی کو قتل کر دیا، مقتولہ نے کسی کو ٹھکرایا ہوگا
ہوگا اور اُس شخص نے اسے قتل کر کے انتقام لیا لیکن ایسی بات ہوتی تو وہ اس کی آبرو ریزی
ضرور کرتا۔ بہرحال یہ باتیں تو تفتیش میں ہی سامنے آ سکتی تھیں۔

میں نے پلنگ پر، کمرے میں اور باہر برآمدے میں بھی بہت غور سے دیکھا کہ شاید
قاتل اپنی کوئی نشانی پھینک گیا ہو لیکن کوئی ایسی چیز نہ ملی۔ پھر میں نے لاش کے ناخن اور
انگلیاں دیکھیں۔ یہ تجربے کی بات تھی۔ میں نے اُس وقت تک دو ایسے کیس دیکھے تھے [illegible]
گھونٹا گیا اور مقتول نے ناخنوں سے قاتل کے ہاتھوں کے الٹی طرف ناخن مارے اور کھال
چھیل ڈالی۔ اسی سے قاتل پکڑا گیا۔

اُس وقت لڑکیوں میں ناخن بڑھانے کا فیشن شروع ہو چکا تھا۔ مقتولہ کے ناخن
بڑھے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی ساری انگلیاں دیکھیں۔ اس کے ناخنوں پر گہری
نیل پالش لگی ہوئی تھی۔ ناخنوں کے اندر کی طرف ان کا رنگ قدرتی تھا۔ شہادت کی
اور درمیانی انگلی کے ساتھ ذرا ذرا سا خون لگا ہوا تھا اور دونوں انگلیوں کے ناخنوں کے اندر
نیل پالش جیسا رنگ تھا جو یقیناً خون تھا۔ یہ خون قاتل کا ہی ہو سکتا تھا۔ مقتولہ نے اپنی گردن
چھڑانے کے لئے قاتل کے ہاتھوں کے الٹی طرف یہ ناخن مارے ہوں گے۔

میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی اور اسی مکان کے ایک کمرے میں
گیا۔ یہ ڈرائنگ روم تھا جسے ہم بیٹھک کہتے ہیں۔

نام کی مسلمان

قتل کی واردات کی تفتیش میں سب سے پہلے پوچھا جاتا ہے کہ کسی کے ساتھ
عداوت ہوگی۔ میں نے یہی سوال قریشی سے پوچھا تو اس نے وثوق سے جواب دیا
کا کوئی ایسا دشمن نہیں جو اُس پر اتنا زیادہ شدید وار کرتا۔ اُس نے ایک ایسی بات
ظاہر کرتی تھی کہ اس شخص کے دشمن موجود ہیں۔ بات یہ تھی کہ قریشی کی پہلی بیوی

وہ پرانے مکان میں رہتی تھی۔ اُس کو قریشی نے طلاق نہیں دی تھی اور اُس کا ماہوار خرچہ
دے رہا تھا۔ اُس کے دو جوان بیٹے تھے۔ چھوٹے کی عمر چودہ پندرہ سال اور بڑے کی
اٹھارہ اُنیس سال تھی۔ بڑا کالج میں پڑھتا تھا اور چھوٹا ابھی میٹرک کی کلاس میں تھا۔ قریشی
ان کی تعلیم کے اخراجات بھی دیتا تھا۔

مقتولہ اُس کی دوسری بیوی تھی۔ تیس اکتیس سال کی عمر کی یہ انتہائی خوبصورت عورت
اینگلو انڈین تھی۔ ایک تو ہندوستانی عیسائی ہُوا کرتے تھے جیسے پاکستان میں بھی ہیں۔
دوسرے اینگلو انڈین ہوتے تھے جن کے باپ انگریز اور مائیں ہندوستانی تھیں یا مائیں
انگریز اور باپ ہندوستانی تھے۔ یہ اب بھی ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ میں اس
عورت کا صحیح نام لکھ دیتا ہوں۔ اُس کا نام اینجلا تھا اور قریشی کی خاطر اس نے اسلام قبول کر
لیا تھا اور قریشی نے اُس کا نام آمنہ رکھا تھا۔ میں اس کا مطلب یہ سمجھا کہ مقتولہ کو قریشی کے
ساتھ اتنی زیادہ محبت تھی کہ اس نے اپنا مذہب بھی چھوڑ دیا تھا۔ شادی ہوئے ابھی مشکل
سے ایک سال گزرا تھا کہ آمنہ قتل ہو گئی۔

میں نے قریشی سے پوچھا کہ اتنی زیادہ محبت میں ایسی کون سی غلطی مقتولہ سے ہو گئی
تھی کہ قریشی نے ہوٹل میں رہنا شرع کر دیا تھا؟...... قریشی نے بتایا کہ اس نے تو اس لڑکی
کے ساتھ محبت کر کے شادی کی تھی لیکن یہ عورت بہت ہی فضول خرچ نکلی۔ اسے زیورات
اور انتہائی قیمتی کپڑوں کا شوق تھا اور پھر سیر سپاٹے میں خوش رہتی تھی۔ گرمیوں میں مری چلی
جاتی اور ایک یا ڈیڑھ مہینہ وہیں رہتی تھی۔ شادی کے بعد گرمیوں کا ایک ہی موسم آیا تھا اور
وہ مری چلی گئی تھی۔ یہ تو میں نے بیڈ روم میں، ڈرائنگ روم اور ایک اور کمرے میں دیکھا
کہ فرنیچر شاہانہ تھا اور دیگر اشیاء ایسی تھیں جو میں اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ تو کسی
شاہی خاندان کا محل معلوم ہوتا تھا۔

قریشی کو ایسی چوٹ پڑی تھی کہ وہ اپنے آپ میں رہا ہی نہیں تھا۔ اتنی خوبصورت
بیوی کا قتل ہو جانا اُس کے واسطے کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا۔ اس صدمے کا اُس پر ایسا اثر
ہُوا کہ وہ بولتا ہی چلا جا رہا تھا اور شاید وہ بھول گیا تھا کہ اُس کی باتیں ایک تھانیدار سن رہا
ہے اور یہ تھانیدار تفتیش کر رہا ہے۔

اُس نے کہا کہ میں نے مقتولہ کو مسلمان کیا تھا اور پھر یہ کوشش کی کہ یہ مسلمانوں
والے طور طریقے اور رہن سہن اختیار کر لے مگر اس نے نہ کئے۔ اس نے قریشی کو ایک کلب

کا ممبر بنوا دیا۔ کبھی کبھی ہفتے کی شام مقتولہ قریشی کو کلب میں لے جاتی تھی اور دوسروں کے ساتھ ڈانس کرتی تھی اور قریشی کی حوصلہ افزائی کرتی تھی کہ وہ دوسری عورتوں کے ساتھ ڈانس کرے۔ وہ خود بھی شراب پیتی تھی اور قریشی کو بھی پلاتی تھی۔

میں قریشی کی اس بات پر دل ہی دل میں ہنسا بھی اور اس پر غصہ بھی آیا کہ ایک طرف وہ کہتا تھا کہ مقتولہ اسلامی طور طریقے اختیار نہیں کرتی تھی اور دوسری طرف وہ بلا جھجک کہتا تھا کہ وہ شراب پیتا تھا...... وہ تو پوری پوری تفصیل سے ہر بات کر رہا تھا۔ اس پر ایسی دردناک کیفیت طاری تھی کہ وہ بولتے چلے جانے میں سکون محسوس کرتا تھا۔ میں اس کو کہیں کہیں روک کر کچھ پوچھتا تھا اور وہ پورا پورا جواب دیتا تھا۔ میں آپ کو یہ ساری گفتگو تو نہیں سنا سکتا، اس واسطے کہ یہ بہت لمبی ہے، کام کی بات یہ ہے کہ میں نے بڑی جلدی یہ بات نوٹ کر لی کہ یہ شخص کوئی ایسا شریف آدمی نہیں بلکہ اس کا رجحان عیاشی کی طرف ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو یہی تھا کہ اس نے پہلی بیوی کو چھوڑ کر ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ شادی کر لی اور لڑکی بھی ایسی جو صرف نام کی مسلمان ہوئی تھی اور اس کے باقی طور طریقے اس کے اپنے سابق مذہب والے تھے۔

مقتولہ قریشی کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ جنگ عظیم میں تعلیم یافتہ لڑکیوں کے واسطے روزگار کے مواقع نکل آئے تھے۔ لڑکیوں کو باقاعدہ فوج میں بھرتی کر کے ان کی الگ فوج بنا دی گئی تھی۔ ایسی فوجی عورت کو ویکائی کہتے تھے۔ یہ مخفف تھا Women Auxi liary Corps (India) کا اور اس کا انگریزی مخفف تھا WACI۔ اس مخفف سے ان کو ویکائی کہتے تھے۔ ان لڑکیوں کو فوجی بنانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان کو محاذوں پر بھیجا جاتا تھا بلکہ ان کو فوجی دفتروں میں کام دیئے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض کو کمیشن دے کے افسر بھی بنایا گیا تھا۔ یہ افسر باقاعدہ لیفٹیننٹ، کیپٹن وغیرہ کے عہدوں کے نشان کندھوں پر لگاتی تھیں۔ اس زنانہ فوج میں زیادہ تر اینگلو انڈین، انڈین کرسچن، ہندو اور سکھ لڑکیاں بھرتی ہوئی تھیں۔ مسلمان لڑکیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لڑکیوں کا اصل کام انگریز افسروں کی تفریح طبع تھا۔

اُس زمانے میں سول دفتروں میں لڑکیاں کم ہی کام کرتی تھیں۔ جنگِ عظیم میں یہ سلسلہ بھی شروع ہو گیا کہ بڑے بڑے سرکاری دفتر میں لڑکیوں کو بھی جاب ملنے شروع ہو گئے تھے۔ مقتولہ جنگ عظیم شروع ہوتے ہی اس فوجی ہیڈ کوارٹر میں ملازم ہو گئی تھی۔ وہ

دراصل سٹینوگرافر تھی لیکن جنگ کے آخر میں آ کر وہ ایک جرنیل کی سیکرٹری بنا دی گئی تھی۔ قریشی اسی ہیڈ کوارٹر میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ مقتولہ قریشی کے ماتحت تھی۔

قریشی کو سپرنٹنڈنٹ ہوئے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ڈیڑھ دو سال پہلے اس کو یہ عہدہ ملا تھا۔ میں ذاتی طور پر جانتا تھا کہ اس عہدے میں بالائی آمدنی ہوتی تھی۔ یہ میں اس واسطے کہہ رہا ہوں کہ اس شخص کے محکمے کا ایک کام یہ بھی تھا کہ فوج کے واسطے سامان وغیرہ خریدا جاتا تھا۔ آخری بل قریشی نے پاس کرنے ہوتے تھے اور آرڈر بھی اسی سے ملتے تھے۔ میں نے اُسی وقت محسوس کر لیا تھا کہ قریشی نے ہاتھ صاف کرنے شروع کر دیئے تھے اور پھر اُس نے مقتولہ کی طرف توجہ دی۔ اس کے ساتھ اس کی دوستی ہو گئی۔ پھر وہ اس کو ہوٹلوں میں اور ہر طرح عیش موج کرانے لگا تھا۔

قریشی نے یہ بات جو میں نے کہی ہے، اپنی زبان سے نہیں کہی تھی۔ یہ تو میں خود اندازہ اور خیال کر رہا تھا۔ اس نے مجھ کو یہ بتایا کہ جب اُس کی دوستی مقتولہ کے ساتھ شروع ہوئی تو اُس وقت مقتولہ کو پہلے خاوند سے طلاق ہو چکی تھی۔ جب اُس نے یہ بات کہی تو میں چونک پڑا۔ مجھ کو ایک سراغ نظر آنے لگا۔ قاتل اُس کا پہلا خاوند ہو سکتا تھا۔ میں نے قریشی سے پوچھا کہ وہ کون تھا۔

قریشی کو جو کچھ معلوم تھا وہ اُس نے مجھ کو بتا دیا۔ وہ ایک اینگلو انڈین تھا اور سی ایم اے میں کسی اچھے عہدے پر تھا۔ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے قریشی نے بتایا کہ اُس کو بالکل معلوم نہیں کہ جب مقتولہ کی پہلے خاوند سے علیحدگی ہوئی تو اس خاوند کا ردِعمل کیا تھا۔

قریشی نے تو بڑی ہی لمبی بات کر ڈالی تھی اور میں نے اس بات کو اس طرح اور زیادہ لمبا کیا کہ اُس سے کچھ نہ کچھ پوچھتا چلا جا رہا تھا...... آخر اُس کو میں نے اٹھا دیا اور اُس کے پڑوسیوں کو بلایا جن کو میں نے پہلے ہی پابند کر دیا تھا۔ ان میں دو ہندو تھے اور ایک مسلمان۔ مسلمان کا گھر بالکل سامنے تھا اور ایک ہندو کا مکان قریشی کے مکان کے دائیں طرف اور دوسرے کا بائیں طرف تھا۔ ان تینوں نے یہاں نئے مکان بنائے تھے اور یہ تینوں کاروباری آدمی تھے۔ میں نے ان کو باری باری بلایا اور ان سے یہ پوچھا کہ وہ قریشی اور اس کی مقتولہ بیوی کے بارے میں کیا جانتے ہیں اور کیا وہ میری کچھ مدد برائے تفتیش کر سکتے ہیں؟

ان تینوں نے ایک ہی جیسی بات کی۔ وہ یہ تھی کہ یہ میاں بیوی صبح اکٹھے نکل جاتے تھے اور اکٹھے ہی واپس آتے تھے۔ قریشی ملنسار آدمی تھا اور اڑوس پڑوس کے ساتھ سلام و دعا رکھتا تھا۔ مقتولہ بھی ایسی ہی اچھی طبیعت کی تھی۔ کسی کے گھر میں تو اس کا آنا جانا نہیں تھا لیکن کوئی عورت اس کے گھر چلی جاتی تو اس کی اچھی آؤ بھگت کرتی تھی۔ ان تینوں نے یہ بھی بتایا کہ قریشی اور مقتولہ میں کم از کم انہوں نے ناچاقی یا لڑائی جھگڑا کبھی نہیں دیکھا اور سنا تھا۔ ان میں جو مسلمان تھا، اس نے بتایا کہ مسلمان خوش تھے کہ قریشی نے غیر مذہب کی ایک عورت کو مسلمان کر لیا ہے لیکن پھر لوگوں کو پتہ لگ گیا تھا کہ مقتولہ کا رہن سہن ابھی تک پہلے مذہب والا ہی ہے۔ اس نے اپنا لباس تو مسلمان عورتوں جیسا بنا لیا تھا لیکن ویسی مسلمان نہیں ہوئی تھی جیسی مسلمان عورتیں ہُوا کرتی ہیں۔

ان تینوں نے بتایا کہ پانچ چھ دنوں سے قریشی ان کو نظر نہیں آیا تھا۔ ان کو معلوم ہی نہیں تھا کہ قریشی ہوٹل میں منتقل ہو گیا ہے...... میں ایک مشکل محسوس کر رہا تھا۔ میں زیادہ تر قصبوں کے تھانوں میں یا دیہاتی علاقے کے تھانوں میں ایس ایچ او رہا تھا جہاں لوگ اَن پڑھ یا بہت تھوڑے پڑھے لکھے ہوتے تھے۔ یہ پہلا تھانہ تھا جہاں مجھ کو اونچی حیثیت اور زیادہ تعلیم والے لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑا۔ دیہاتیوں کو تو ڈرایا بھی جا سکتا تھا لیکن ان لوگوں کے ساتھ سنبھل کر بات کرنی پڑتی تھی۔

میں نے ان تینوں سے پوچھا کہ انہوں نے کبھی دیکھا ہے کہ قریشی کی غیر حاضری میں اس گھر میں کوئی آتا ہو گا...... تینوں نے کہا کہ انہوں نے کبھی ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا اور ان کی غیر حاضری میں کوئی آتا ہو یا کبھی آیا ہو تو اس کی بابت وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔

میں نے قریشی کو کہا کہ وہ اب مجھ کو ملتا ملاتا رہے اور کچھ دیر کے واسطے تھانے آ جایا کرے۔ تفتیش کے واسطے مجھ کو قدم قدم پر کچھ نہ کچھ پوچھنا تھا۔

اب وہاں ایک اور اہم آدمی تھا جو مجھ کو تھوڑی بہت روشنی دکھا سکتا تھا۔ وہ ان لوگوں کا یعنی قریشی کا نوکر تھا جس کو قاتل باندھ گئے تھے۔ وہ تیس پینتیس سال کے درمیان عمر کا آدمی تھا اور شکل وصورت سے عقل والا لگتا تھا۔ میں نے اُس کو اپنے پاس بٹھایا اور یہ سوچ کر اُس کے ساتھ ٹھیک ٹھاک دوستوں والا انداز اختیار کیا کہ یہ اپنے مالک کے خلاف نہیں بولے گا۔ میں نے اُس کو بولنے کے واسطے تیار کر لیا اور کہا کہ اُس نے کوئی بات چھپائی اور وہ مجھ کو کہیں اور سے پتہ لگی تو پھر میں اُس کے خلاف کارروائی کروں گا۔

''تھانیدار صاحب جی!'' نوکر نے ہاتھ جوڑ کر کہا —— ''مجھ سے جو پوچھنا ہے ضرور پوچھیں، میں بتاؤں گا اور میں تو کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتا ہوں کہ اس گھر میں نوکری نہیں کروں گا۔ مجھ کو یہ سن کر بہت ہی خوشی ہوئی تھی کہ قریشی صاحب نے ایک اینگلو انڈین عورت کو مسلمان کر لیا ہے۔ میں بڑی خوشی سے اس گھر میں نوکر ہُوا تھا لیکن ان دونوں کی جو حالت دیکھی تو میرے دل کو بہت دکھ ہُوا۔ میں تو کہتا ہوں کہ قریشی صاحب نے اس عورت کا صرف نام اسلامی رکھ دیا تھا، اصل میں قریشی صاحب نے خود اُس کا مذہب قبول کر لیا تھا۔ دونوں شراب پیتے تھے اور کلب میں بھی جاتے تھے۔ مجھ کو معلوم ہے کلب میں کیا ہوتا ہے''۔

''میں تمہاری ساری بات سنوں گا'' —— میں درمیان میں بول پڑا —— ''سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ ان دونوں کے درمیان کوئی سخت قسم کی ناراضگی تھی؟''

''ہاں صاحب جی!'' —— نوکر نے جواب دیا —— ''مجھ کو یہ تو معلوم نہیں کہ ناراضگی کس بابت تھی لیکن یہ مجھ کو یقین ہے کہ اب آخر میں آ کر ان کی اَن بن ہو گئی تھی۔ قریشی صاحب نے کچھ دن پہلے اس عورت کو گالیاں بھی دی تھیں اور میں نے ان کے یہ الفاظ سنے تھے کہ میں نے اپنی اتنی اچھی بیوی کو اور جوان بیٹوں کو چھوڑا اور تمہاری خاطر حرام کی کمائی گھر لا کر تجھ کو عیش کرائی مگر تو ایسی بے وفا نکلی کہ تیری محبت صرف روپے پیسے کے ساتھ ہے''۔

''کیا اس عورت کے پاس کوئی اس کا دوست آتا تھا؟'' —— میں نے پوچھا۔

''نہیں صاحب بہادر!'' —— نوکر نے جواب دیا —— ''یہ عورت کسی کے ہاتھ آنے والی نہیں۔ دیکھئے صاحب! میں نے انگریزوں کے گھروں میں اور دیسی افسروں کے گھروں میں کام کیا ہے اور میں اچھے بُرے کو سمجھتا ہوں۔ اس عورت نے قریشی صاحب کے ساتھ شادی صرف اس واسطے کی تھی کہ قریشی صاحب دفتر میں ہاتھ مار کر دولت لے آتے تھے اور یہ عورت عیش موج کرتی تھی۔ بازار جاتی تو واپس لدی ہوئی آتی تھی۔ دراصل جناب! یہ عورت اپنے آپ کو شہزادی یا ملکہ سمجھتی تھی اور قریشی صاحب کو اس کے خلاف یہی شکایت تھی''۔

مجھ کو یہ شک ہونے لگا تھا کہ مقتولہ کو قریشی نے خود ہی مروایا ہے۔ اُس کی باتوں سے جو اُس نے میرے ساتھ کی تھیں، یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ قریشی اس عورت سے تنگ آ گیا

تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ ہوٹل میں چلا گیا تھا۔ میں نے اس شک کو دل میں رکھ کر نوکر کے ساتھ بہت سوال جواب کیئے اور اُس پر جرح بھی کی اور بہت چھوٹی چھوٹی باتیں بھی پوچھیں اور پھر ایسا ہُوا کہ نوکر نے بھی یہ لفظ کہہ دیئے کہ یہ ہوسکتا ہے قریشی صاحب نے اس گھر سے بوریا بستر گول اسی واسطے کیا ہو گا کہ اپنی غیر حاضری میں اس عورت کو مروا دے۔ نوکر نے یہ بھی کہا کہ اب قریشی صاحب پر کسی کو شک نہیں ہوسکتا، اس واسطے کہ وہ صاف کہہ دیں گے کہ میں تو گھر سے ہی غیر حاضر تھا۔

''دیکھ میرے بھائی!'' ــــ میں نے کہا ــــ ''اگر تم نے یہ نوکری چھوڑنی ہے تو مجھ کو بتائے بغیر کہیں چلے نہ جانا، مجھ کو تمہاری ضرورت رہے گی''۔

نوکر نے مجھ کو بڑی خوشی سے یقین دلایا کہ وہ نہیں جائے گا اور اگر چلا بھی گیا تو مجھ کو اپنا پتہ دے کر جائے گا۔ میں نے دیکھا کہ اس شخص کے دل میں قریشی اور مقتولہ کے خلاف زہر بھرا ہُوا تھا۔ وہ اچھے کردار کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ میرے دماغ میں ایک اور بات آ گئی۔ میں نے نوکر کو کہا کہ وہ اسی گھر میں رہے اور یہ دیکھتا رہے کہ یہاں کون کون آتا ہے۔ اگر کوئی ایسا ویسا آدمی آئے یا کوئی بھی آئے تو وہ اس آدمی کی اور قریشی کی باتیں سننے کی کوشش کرے...... مختصر بات یہ کہ میں نوکر کو اس گھر کا مخبر بنانا چاہتا تھا۔ نوکر نے بڑی خوشی سے میری یہ تجویز مان لی۔ تب میں نے اُس کو کہا کہ اس نے اگر مجھ کو کوئی اچھا سراغ دے دیا تو میں اُس کو نقد انعام دوں گا۔ یہ سن کر وہ بے چارا اور خوش ہو گیا۔ میں اٹھا اور تھانے چلا گیا۔

آدمی کو ہپناٹائز کر لیتی تھی

میں تھانے میں پہنچا تو شام گہری ہو گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کا پتہ لگ گیا تھا۔ مقتولہ کی موت ہاتھوں سے گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اُس کو رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے درمیان ہلاک کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے یہ بات صاف لکھی کہ مقتولہ کی آبروریزی نہیں ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ مقتولہ کے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کے ناخن اندر کی طرف سے دیکھے اور بتائے کہ یہ خون ہے یا نیل پالش ہے...... ڈاکٹر نے صاف الفاظ میں لکھا کہ دونوں ناخنوں کے

اندر کی طرف اور دونوں انگلیوں کے اوپر والے حصے پر انسانی خون پایا گیا ہے۔

اس سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ یہ خون قاتل کا تھا اور قاتل کے ایک ہاتھ کے الٹی طرف زخم ہو گا۔ میں نے مقتولہ کے ناخن دیکھے تھے۔ بڑے سخت اور تیکھے ناخن تھے اور بڑھے ہوئے بھی تھے۔ یہ تو جہاں لگے ہوں گے وہاں کچھ اندر اُتر گئے ہوں گے۔

میرا ایک مشتبہ تو خود قریشی تھا۔ میں نے اُس کو ذرا سا شک نہیں ہونے دیا تھا کہ مجھ کو اُس پر شک ہے۔ میں نے سوچا کہ اس کو دو دن اسی طرح چھوڑ کر رکھوں گا۔ ایک تو اُس کا اپنا نوکر مخبری کے واسطے مل گیا تھا پھر میں نے ایک دو اور تجربہ کار مخبر اُس کے پیچھے لگا دیئے تھے۔ میں گھر چلا گیا اور دل میں یہ ارادہ رکھا کہ کل صبح مقتولہ کے پہلے خاوند کو تھانے بلاؤں گا۔ اُس کے گھر کا ایڈریس معلوم نہیں ہوسکا تھا، اُس کے دفتر کو ہم سب تھانے والے جانتے تھے۔

صبح میں تھانے پہنچا تو ایک ہیڈ کانسٹیبل کو سی ایم اے کے دفتر میں بھیجا اور اس کو مقتولہ کے پہلے خاوند کا نام بتایا کہ اس کو اپنے ساتھ لے آئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد قریشی آ گیا۔ میں نے بڑی اچھی طرح اس کا استقبال کیا اور اس کو کہا کہ میں اُس کی بیوی کے قاتل کو انشاء اللہ جلدی پکڑ لوں گا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ہوٹل سے اپنے گھر میں آ گیا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون سا ہوٹل ہے جس میں ٹھہرا تھا۔ اُس نے ہوٹل کا نام لیا۔ وہ کوئی فائیو سٹار ہوٹل نہیں تھا بلکہ اچھی قسم کا درمیانہ سا ہوٹل تھا۔ قریشی کے دفتر کا ٹائم ہو رہا تھا اس واسطے وہ جلدی چلا گیا۔ میں نے اس کو یہ تاثر دیا کہ میں اُس کا بڑا ہی مخلص اور ہمدرد دوست ہوں۔ وہ جب اٹھ کر چلنے لگا تو ایک بات یاد آ گئی۔ میں نے اُس سے یہ بات پہلے نہیں پوچھی تھی۔ اُس سے پوچھا کہ اپنی پہلی بیوی اور اپنے بیٹوں کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے؟ ساتھ ہی یہ بھی پوچھا کہ اُس کی پہلی بیوی کے بھائی وغیرہ ہوں گے، ایسا تو نہیں کہ انہوں نے انتقاماً اس کی دوسری بیوی کو قتل کر دیا ہو؟

''نہیں'' ــــ اُس نے جواب دیا ــــ ''ان لوگوں میں اتنا دم نہیں۔ اگر انہیں انتقام لینا ہوتا تو وہ ایک سال انتظار نہ کرتے۔ انتقام گرما گرمی میں فوراً ہی لے لیا جاتا ہے''۔

مقتولہ کے پہلے خاوند کو آتے آتے تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ وہ آیا تو سب سے پہلے میں نے اُس کا چہرہ پھر اس کا قد کاٹھ اور لباس دیکھا۔ وہ گورے رنگ کا اینگلو انڈین تھا۔ میرے ساتھ اُس نے ہاتھ ملایا تو اُس کے انداز میں گرمجوشی تھی۔ میں نے اُس کو احترام

سے بٹھایا اور پوچھا کہ یہ خبر اُس تک پہنچی ہے یا نہیں کہ اُس کی سابقہ بیوی قتل ہو گئی ہے؟

اُس نے بتایا کہ اُس کو کل پچھلے پہر خبر مل گئی تھی۔ اُس نے میرے اگلے سوال کا انتظار نہ کیا اور بولا کہ اُس کے مرنے کا افسوس ہے لیکن خوشی ہے کہ اُس سے اُس کی علیحدگی ہو گئی تھی۔

''کیا اُس نے خود آپ سے طلاق مانگی تھی؟''—— میں نے پوچھا—— ''یا آپ نے اُس کو طلاق دی تھی؟''

''میں خود اُس سے آزاد ہونا چاہتا تھا''—— اُس نے جواب دیا—— ''وہ اتنی مہنگی عورت تھی کہ اس کی شادی کسی نواب یا مہاراجے کے ساتھ ہونی چاہئے تھی۔ وہ تو اپنے آپ کو کسی شاہی خاندان کی شہزادی سمجھتی تھی۔ اس قدر شاہ خرچ کہ میرا تو پسینہ ہی نکل آتا تھا۔ میں اس کو کہتا تھا کہ اس تنخواہ میں اتنے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ مجھ سے ناراض نہیں ہوتی تھی بلکہ بڑے خوشگوار لہجے میں کہتی تھی کہ اس محکمے میں اگر اوپر کی آمدنی نہیں تو یہ نوکری چھوڑ دو، میں تمہیں ایسی جگہ لگوا دوں گی جہاں اوپر کی آمدنی بے شمار ہو گی...... آپ مسلمان ہیں صاحب! ہمیں آپ جو کچھ بھی سمجھیں سمجھتے رہیں، ہم لوگ شراب پیتے ہیں اور خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ رشوت اور بالائی آمدنی کو میں کس طرح حرام سمجھتا ہوں۔ میں قرض لے لیا کرتا ہوں، حرام کی آمدنی کی طرف دیکھتا بھی نہیں اور اس عورت نے مجھ کو مقروض بھی کر دیا تھا''۔

''پھر آپ نے اسے پہلے ہی طلاق کیوں نہ دے دی؟''—— میں نے پوچھا—— ''اتنا عرصہ اس کے ساتھ کس طرح گزار دیا تھا؟''

''میرے جواب سے آپ شاید مطمئن نہیں ہوں گے''—— اُس نے مسکرا کر کہا—— ''اگر اس عورت کے ساتھ آپ کی دوستی ہو جاتی تو آپ کو اس سوال کا جواب مل جاتا۔ وہ ایکٹنگ میں اتنی مہارت رکھتی تھی کہ پتھر کو بھی موم کر لیتی تھی۔ اس کو ماں بہن کی گالیاں دیتے تو بھی وہ مسکراتی رہتی اور اپنی بات پر اڑی رہتی تھی۔ اس کی خوبصورتی میں تو کوئی شک شبہ تھا ہی نہیں لیکن وہ اپنی اس خوبصورتی کو استعمال کرنا جانتی تھی۔ وہ تو آدمی کو ہپناٹائز کر لیتی تھی۔ میں کتنا ہی ناراض کیوں نہ ہوتا، وہ اپنی بڑی پیاری حرکتوں اور مسکراہٹوں سے فوراً راضی کر لیتی تھی۔ آپ مجھ کو بے وقوف کہہ لیں لیکن میں حقیقت بیان کر رہا ہوں کہ میں اس کے ہاتھوں میں بے وقوف بنا رہا''۔

اس اینگلو انڈین کے بارے میں میری رائے اچھی ہو گئی۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اُس نے اچھی طرح بیان کیا کہ یہ عورت اندر باہر سے بڑا ہی خوبصورت فراڈ تھی اور جس پر ہاتھ ڈالتی تھی اُس کو مالی لحاظ سے چوس لیتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اُس نے ضرور کئی آدمی یار بنائے ہوئے ہوں گے۔ اُس نے جواب دیا کہ وہ اتنی کچی نہیں تھی کہ ہر کسی کی داشتہ بنی رہتی۔ اس نے کہا کہ اس عورت کا کمال تو یہ تھا جیسے پانی کا پیالہ ہاتھ میں لے کر پیاسے کو دکھاتی اور اپنے پیچھے پیچھے چلاتی رہتی تھی۔ صحرا کا سراب تو آپ نے سنا ہو گا۔ آدمی اس کے پیچھے پیچھے چلتے چلتے گر پڑتا اور مر جاتا تھا۔

پھر اُس اینگلو انڈین نے بتایا کہ اس عورت نے اس کے ساتھ شادی پچیس چھبیس سال عمر میں کی تھی۔ اُس سے پہلے وہ دوستیاں لگاتی رہتی تھی۔ ان دوستیوں سے ہی اس نے اپنے آپ کو شہزادی بنا لیا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے تو مقتولہ نے دو اڑھائی سال پہلے نوکری کا فیصلہ کر لیا اور اس کو اس فوجی ہیڈ کوارٹر میں بڑی اچھی نوکری مل گئی۔ وہ شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ اچھی طرح جانتی تھی۔ اس سے پہلے بھی اس نے دو تین دفتروں میں نوکری کی تھی لیکن ترقی اس دفتر میں کی اور بڑے صاحب کی سیکرٹری بن گئی۔ اُس نے بتایا کہ قریشی اسی دفتر کا سپرنٹنڈنٹ بن گیا اور ان کی دوستی ہو گئی۔

اس اینگلو انڈین نے بتایا کہ وہ ہر وقت سوچتا تھا کہ اس عورت سے کس طرح علیحدگی اختیار کی جائے۔ اس کو ایک بہانہ مل گیا۔ وہ اس طرح کہ وہ بچے پیدا ہونے کے سخت خلاف تھی۔ کوئی نہ کوئی دوائی لے لیتی تھی۔ آخر ایک بچے کی امید بندھ گئی لیکن اُس نے اس اینگلو انڈین خاوند کی اجازت کے بغیر ایبارشن کرا لی۔ خاوند نے اس کے علاج معالجے کے اخراجات تو دے دیئے لیکن پہلی بار اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اب ان کو علیحدہ ہو جانا چاہئے۔ اس کا مطلب طلاق تھا۔ اس عورت نے تو جیسے خدا کا شکر ادا کیا ہو۔ وہ فوراً رضامند ہو گئی اور دو تین دنوں میں طلاق ہو گئی جو مقتولہ نے بڑی خوشی سے قبول کر لی اور اس گھر سے رخصت ہو گئی۔

اُس نے بتایا کہ طلاق کے فوراً ہی بعد اُس نے ایک انڈین کرسچن لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ اس نے کہا کہ اب چل کر میرا گھر دیکھیں، سکون ہی سکون ہے اور دو مہینے ہوئے میرا پہلا بچہ پیدا ہوا ہے۔

ہوٹل اور عصمت فروش لڑکی

مجھ کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ یہ اینگلو انڈین مقتولہ کے دوسرے خاوند قر
بابت سب کچھ جانتا تھا اور اس کو اس شخص کے دوسرے حالات بھی معلوم تھے۔ اس۔
کہ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ مقتولہ نے قریشی کو پھانس لیا ہے۔ پھر مقتولہ نے قریشی کے
شادی کر لی۔ قریشی ایسی پوسٹ پر پہنچ گیا تھا کہ وہ فوج کے واسطے مال کی خریداری میں
منہ مانگی کمیشن کما سکتا تھا اور وہ یہ حرام کی دولت کما رہا ہے۔ اُس نے نئی بات یہ بت
قریشی نے اتنا بڑا ہاتھ مار لیا تھا جو چھپا نہیں رہ سکا اور اوپر والوں کو پتہ لگ گیا۔ اس
کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے اور اگر صحیح معاملہ سامنے آ گیا تو ہو سکتا ہے اس کو نوکر
برطرف کر دیا جائے اور اگر رقم اور زیادہ ہوئی تو اس کو جیل کی سزا بھی مل سکتی ہے۔

قریشی کے متعلق پہلے بات ہو چکی ہے کہ وہ حرام خوری بہت کرتا تھا اور اس
خوری سے وہ مقتولہ کی فرمائشیں پوری کرتا رہتا تھا۔ میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ قا
ہے اور وہ دو آدمی کون تھے جو اِس واردات کے واسطے قریشی کے گھر گئے تھے۔ میں
مقتولہ کے اس پہلے خاوند کی رائے معلوم کرنا چاہی۔

''خدا مجھ کو معاف کرے صاحب!'' ___ اُس نے کہا ___ ''میں کسی کے خلاف
بات نہیں کہوں گا کہ قریشی نے بیوی کو قتل کیا ہے۔ البتہ اپنی رائے دے دوں گا۔ میں
حقیقت بتاتا ہوں کہ ایک دو دفعہ میں اس بیوی سے اتنا تنگ آ گیا تھا کہ میں نے سو
اس کا گلا گھونٹ دوں اور پولیس کو یہ بتاؤں کہ معلوم نہیں کون اس کو قتل کر گیا ہے۔ م
اندر ایسی ہمت نہیں تھی۔ اگر قریشی نے اس کا گلا خود گھونٹا ہے یا اُس نے یہ کام کرا
قاتلوں سے کروایا ہے تو میں حیران نہیں ہوں گا۔ غور کریں کہ قریشی کے خلاف انکوا
رہی ہے اور اس نے یہ رقم مقتولہ کی فرمائشیں پوری کرنے کے واسطے اڑائی تھی یا کمی
صورت میں حاصل کی تھی۔ مقتولہ کی فرمائشیں تو ختم ہوتی ہی نہیں تھیں۔ پھر قریشی
پوزیشن بھی دیکھیں کہ اس نے اس عورت کے پیچھے پرانی بیوی کو اور دو جوان لڑکوں
دیا تھا۔ میرا تو خیال ہے کہ میں نے تو طلاق کے ذریعے اس عورت سے نجات حاصل
تھی، قریشی نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوگا جس کی آپ تفتیش کر رہے ہیں''۔

یہ دانشمند اور معزز اینگلو انڈین میرے شک کی تائید کر رہا تھا۔ میں اپنا شک

بیان کر چکا ہوں۔ قریشی ہوٹل میں اس واسطے نہیں گیا تھا کہ بیوی کو سبق سکھانا چاہتا تھا بلکہ اس واسطے گیا تھا کہ وہ گھر سے غیر حاضر رہنا چاہتا تھا تاکہ اس غیر حاضری میں مقتولہ کو ختم کرا دے۔ اُس اینگلو انڈین نے یہ بھی کہا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقتولہ نے کسی کے ساتھ درپردہ دوستی لگا لی ہو گی اور اُس کا مال کھا کر اُس کو دھوکہ دیا ہو گا۔ ہر کوئی ہماری طرح تو نہیں ہوتا کہ برداشت کر لے گا۔ یہ آدمی کوئی رسوخ اور بدمعاشی والا ہو گا، اُس نے مقتولہ کو دنیا کے تختے سے ہی اٹھا دیا۔

میں نے اس اینگلو انڈین کو رخصت کر دیا اور سوچ میں پڑ گیا۔ قریشی جس ہوٹل میں رہتا تھا وہ کوئی نیک نام ہوٹل نہیں تھا۔ اُس دَور میں ایسے ہوٹلوں میں عصمت فروشی بھی ہوتی تھی اور غنڈے اور بدمعاش بھی اس ہوٹل میں رہتے تھے۔ سوچ سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ ہوٹل کے مالک کے ساتھ بات چیت کی جائے۔ مجھ کو یاد نہیں کہ میں اُسی روز ہوٹل میں گیا تھا یا اگلے روز گیا تھا، بہر حال میں اس ہوٹل میں گیا اور اس کے مالک سے ملا۔

ہوٹل کا مالک تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ میں نے جوں ہی قریشی کا نام لیا تو اُس نے کہا کہ وہ قریشی کو جانتا ہے اور اس کی بیوی گھر میں قتل ہو گئی ہے۔ میں نے اُس کو کہا کہ میں تفتیش کے سلسلے میں آیا ہوں۔ اس قسم کے ہوٹلوں کے مالک پولیس کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا کرتے تھے۔ اس مالک نے پورے پورے تعاون کا یقین دلایا۔

اس ہوٹل میں صرف سولہ رہائشی کمرے تھے اور ہر سہولت موجود تھی سوائے ٹیلیفون کے۔ ٹیلیفون کاؤنٹر پر آ کر سننا پڑتا تھا اور وہیں سے فون کیے جا سکتے تھے۔ قریشی کے بارے میں اُس نے بتایا کہ پانچ چھ دن یہاں رہا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ قریشی کے پاس کوئی آدمی آتے ہوں گے۔ مالک نے بتایا کہ اُس کے ملنے والے شام کے بعد آیا کرتے تھے لیکن ان میں سے وہ کسی کو بھی نہیں جانتا کہ وہ کون تھے تاہم وہ میرے سامنے آ جائیں تو میں پہچان لوں گا۔

اُس نے یہ بھی بتایا کہ قریشی جب شام کو اپنے کمرے میں ہوتا تھا تو اس کے ٹیلیفون بھی آتے تھے اور وہ کاؤنٹر پر آ کر بات کیا کرتا تھا۔

میں نے مالک کو کہا کہ جرائم پیشہ لوگ اُس کے پاس آتے ہوں گے تو مالک نے کہا کہ ہو سکتا ہے آتے ہوں لیکن وہ کسی کو نہیں جانتا سوائے قریشی کے بڑے بیٹے کے جو دو مرتبہ باپ کو ملنے آیا تھا۔ ہوٹل کے مالک کو اس طرح پتہ چلا تھا کہ یہ قریشی کا بیٹا ہے کہ اُس

نے اُس سے پوچھا تھا کہ آپ کون ہیں تو اُس نے بتایا تھا کہ میں قریشی صاحب کا
ہوں۔ مالک نے یہ بھی بتایا کہ قتل سے دو دن پہلے یہ ایک بار پھر باپ سے ملنے آیا
دونوں بار ڈیڑھ دو گھنٹے باپ کے ساتھ گزار کر گیا تھا۔

میں نے ہوٹل کے مالک سے پوچھا کہ اُس کی رائے میں قریشی کیسا آدمی ہے
نے بتایا کہ اس شخص کے کیریکٹر کا اندازہ اس سے کریں کہ شراب پیتا ہے اور دو مرتبہ
نے ایک بڑی خوبصورت عصمت فروش لڑکی کو پوری پوری رات کمرے میں رکھا اور
اُس کو پیسے دیئے تھے۔ پیسوں کی بابت مالک کو اس طرح پتہ لگا کہ اس عصمت فروش
نے اُس کو بتایا تھا اور مالک کو کمیشن دی تھی۔ میں نے پوچھا کہ قریشی کی بیوی بھی آ
گی۔ مالک نے بتایا کہ صرف ایک مرتبہ آئی تھی اور دو اڑھائی گھنٹے گزار کر گئی تھی۔

ہوٹل کے مالک سے مجھ کو کوئی سراغ نہ ملا سوائے اس کے کہ قریشی کے بارے
یہ انکشاف ہوا کہ وہ ٹھیک آدمی نہیں تھا اور ہر طرح کی عیش عشرت کرتا تھا۔ میرا اپنا جو
تھا وہ مزید پختہ ہو گیا کہ مقتولہ کا قاتل یہی شخص ہے اور اس نے کرائے کے قاتل اس
کئے ہیں۔ تفتیش کے دوران قریشی میرے پاس تھانے میں آتا رہا تھا اور میں نے اُس
جتنا بھی شک نہیں ہونے دیا کہ مجھ کو اُس پر شک ہے۔ میں نے ظاہری طور پر اس کو
دیئے رکھا کہ میں اس کا بڑا ہی ہمدرد دوست ہوں۔ دوسرا تاثر یہ دیا کہ وہ بہت ہی
اور مظلوم آدمی ہے۔ اس کے ساتھ میری بہت سی باتیں ہوتی تھیں اور میں اس کی ہر
غور سے سنتا تھا۔ ایک روز میں نے باتوں باتوں میں کہا کہ وہ اپنی پہلی بیوی سے تو کبھی
نہیں ملا ہوگا لیکن اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ کبھی ملاقات ہوئی ہے یا نہیں...... اُس۔
کہ اُس کے دونوں بیٹے یا ایک بیٹا ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو دفتر میں آتا ہے اور پورے
کا خرچہ لے جاتا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ بہت ہی پیار
اور بیٹا بھی اُس کو بہت چاہتا ہے۔ اُس نے کہا کہ اُس کا بڑا بیٹا دو مرتبہ ہوٹل میں اُس
پاس گیا تھا اور کچھ وقت اُس کے ساتھ ہی رہا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ بڑا بیٹا
کو بار بار کہتا تھا کہ وہ اپنے گھر واپس آجائے اور اپنی دوسری بیوی کو بھی ساتھ لے
لیکن اس بات میں قریشی کی پہلی بیوی کی رضامندی شامل نہیں تھی اس واسطے وہ
پرانے گھر میں نہیں جاتا تھا۔

میں آپ کو ایک خاص بات بتا دوں، میں نے یہی تفتیش نہیں کی تھی جو آپ کو

ں۔ یہ تو ضروری باتیں ہیں جو آپ کو سنائی ہیں۔ میری حالت تو یہ تھی جیسے کوئی آدمی
کھود کر نیچے سے کوئی چیز ڈھونڈ کر نکالنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ میں نے مخبروں سے
ہیں لی تھیں۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ میرے واسطے مشکل یہ تھی کہ یہ دیہات کا معاملہ
تھا جس کا میں عادی ہو گیا تھا، یہ بڑے شہر کا معاملہ تھا جہاں کی تہذیب اور تعلیم کچھ اور
اور جن لوگوں کے ساتھ میرا واسطہ پڑا وہ بھی کچھ اور تھے۔ میرا تو دن رات ایک ہو گیا

اگر مجھ کو اچھی طرح یاد ہے تو قتل کو چار دن گزر گئے تھے اور پانچویں دن میں قریشی
پہلی بیوی کے گھر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے علاقے کا انگریز ڈی ایس پی میری جان کو آیا ہوا
انگریز قتل اور ڈکیتی کی وارداتوں کو تو برداشت ہی نہیں کرتے تھے۔ یہاں معاملہ یہ بھی
یا تھا کہ مقتولہ اینگلو انڈین تھی اور ایک افسر کی بیوی تھی۔ ڈی ایس پی تو یہ توقع رکھتا تھا کہ
مسمریزم کے ذریعے قاتل کو سامنے لے آؤں۔

میں کچھ رپورٹیں مخبروں سے حاصل کر کے اور بہت ساری سوچ بچار کے بعد قریشی
پہلے گھر میں گیا۔ وہاں تو جانا ہی تھا۔ میں نے یہ دیکھنا تھا کہ قریشی کی پہلی بیوی کس
پ کی ہے اور اس کے بیٹے کیسے ہیں اور اس کے بھائی بھی تھے جن کے بارے میں معلوم
نا تھا۔ یہ شک بے جا نہیں تھا کہ اس عورت نے مقتولہ کو قتل کروایا ہوگا۔

قریشی کی پہلی بیوی کے نقش کوئی بُرے تو نہیں تھے لیکن اُس کا رنگ گہرا گندمی تھا اور
کی عمر چالیس برس سے اوپر تھی۔ اس کا جسم پھول گیا تھا اور پیٹ آگے بڑھ آیا تھا۔ وہ
لہ کے مقابلے میں تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی تھی بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ مقتولہ کی
انی لگتی تھی۔

میں اس عورت کے ساتھ ابھی رسمی سی بات کر رہا تھا۔ بات اتنی ہی کی تھی کہ افسوس کا
ار کیا تھا کہ اس کے خاوند نے اس عمر میں آکر دوسری شادی کر لی۔ اس کے بعد میں
اس کو یہ کہنا تھا کہ اللہ کی ذات اس عورت کے حق میں ہے اس واسطے ان کے خاوند کی
ری بیوی قتل ہو گئی ہے...... میں نے ابھی یہ دوسری بات نہیں کہی تھی کہ مجھ کو باہر تیز تیز
وں کی آواز سنائی دی اور ایک نوجوان کمرے کے دروازے میں داخل ہوا۔ وہ گٹھے
ئے جسم کا نوجوان تھا جس کی عمر اٹھارہ اُنیس سال تھی۔ میں وردی میں تھا۔ مجھ کو دیکھ کر وہ
وازے میں ہی رک گیا اور میں نے جو بات نوٹ کی، وہ یہ تھی کہ اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں

تھیں اور اُس کا منہ ذرا سا کھل گیا تھا۔

دوسری بات یہ نوٹ کی کہ اُس کے چہرے پر بائیں طرف جہاں کان کا نچ
حصہ ختم ہوتا ہے، زخموں پر لگانے والی ٹیپ کراس کی شکل میں لگی ہوئی تھی۔ وہاں زخم
جگہ ایسی تھی کہ اس پر پٹی نہیں باندھی جاسکتی تھی، اس واسطے اس پر دوائی اور کپڑا رکھ
ٹیپ لگادی گئی تھی۔ یہ زخم جبڑے پر تھا۔ میں نے نوٹ یہ کیا کہ اس نوجوان نے فوراً
کی زخم والی سائیڈ پھیر لی اور اپنے پورے جسم کو بھی اسی طرف کرلیا۔ اب اُس کا دایاں
میری طرف تھا۔ اُس کو شاید معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی تھا
اس عورت نے میرے کہنے پر ساتھ والے کمرے میں بٹھا دیا تھا۔

''یہ میرا بیٹا ہے''—— قریشی کی بیوی نے کہا پھر اس سے مخاطب ہوئی——
کیوں رُک گئے ہو بیٹا! آگے آؤ ان سے ہاتھ ملاؤ اور ان کے پاس بیٹھو''۔

''تم تو ڈر ہی گئے ہو''—— میں نے ہاتھ اُس کی طرف بڑھا کر کہا——''
میرے پاس بیٹھو''۔

وہ میری طرف آ تو گیا لیکن بڑے عجیب طریقے سے، وہ اپنے چہرے کی
سائیڈ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا اور اُس کو ہاتھ
کر ساتھ والی کرسی پر بٹھانا چاہا لیکن وہ دوسری سائیڈ پر بیٹھا جس سے مجھ کو یقین ہو
اپنا زخم مجھ سے چھپا رہا ہے۔

میں یہ سمجھا کہ یہ ابھی نوجوان ہے اور اس کو یہ ڈر ہے کہ اس زخم سے اور
پٹیوں سے اس کا چہرہ بدصورت معلوم ہوتا ہے۔ زخم مجھ سے چھپانے کی یہی وجہ
لیکن میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ میں
گھبراہٹ ختم کرنے کے واسطے کہا کہ میں ایک دو باتیں پوچھنے آیا ہوں اور ابھی
گا۔

''تمہارے ابا جان کی دوسری بیوی قتل ہوگئی ہے''—— میں نے کہا——''
ابا جان کے ساتھ افسوس کرنے کے واسطے ضرور گئے ہوگے!''

''نہیں ...... نہ جی!''—— اُس نے اُکھڑی ہوئی سی آواز میں کہا——
گیا۔ مجھ کو جانے کی کیا ضرورت تھی......''

اُس کی ماں اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی کہ وہ میرے واسطے چائے بنا

خانے میں جارہی ہے۔ وہ چلی گئی تو میں نے اُس کے بیٹے کی طرف توجہ دی۔ میں نے
پوچھا کہ یہ منہ پر زخم ہے یا پھنسی پھٹ گئی ہے؟

''ہاں ذرا سا زخم ...... نہیں نہیں''—— اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا—— ''پھنسی نکل
آئی تھی''۔

میں نے دیکھا کہ وہ زیادہ بے چین ہوگیا تھا۔ اس کے اس جواب سے کہ پہلے زخم
کہا تو فوراً پھنسی کہہ دیا، مجھ کو کچھ شک ہوگیا۔ میں تھانیدار تھا اور اُس وقت تک بے شمار
وارداتوں کی تفتیش کر چکا تھا اور سینکڑوں آدمی، مرد اور عورتیں، میرے ہاتھوں میں سے
گزرے تھے۔ تجربہ اتنا زیادہ ہوگیا تھا کہ چہرے کو دیکھ کر میں بتا سکتا تھا کہ اس شخص کے
دل میں کیا ہے یا اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ تفتیش کے دوران میرا دماغ اپنے آپ
ہی سوچنا شروع کر دیتا تھا۔ میرے دماغ میں مقتولہ کے ناخنوں پر لگا ہوا خون آ گیا۔ میں
نے سیدھی ہٹ کرنے کی بجائے گھما پھرا کر بات کی۔

''تمہارے ابا جان ہوٹل میں رہتے تھے''—— میں نے کہا—— ''تم دو دفعہ انہیں
ملنے کے واسطے گئے تھے۔ اب کیوں نہیں گئے؟ تم کو جانا چاہئے تھا''۔

''میں تو اُن کو ملنے ہوٹل میں نہیں گیا''—— اُس نے کہا—— ''میں ان کو کبھی نہیں
ملا''۔

اب بتائیے، مجھ کو اس پر شک کیوں نہ ہوتا۔ ہوٹل کے مالک نے مجھ کو بتایا تھا کہ
قریشی کا بڑا لڑکا باپ کو ملنے کے واسطے ہوٹل میں دو بار آیا تھا پھر قریشی نے بھی مجھ کو بتایا تھا
کہ اس کا یہ لڑکا اس کے ساتھ بہت محبت کرتا تھا اور وہ خود بھی اس لڑکے کو بہت چاہتا تھا اور
یہ لڑکا اس کو ہوٹل میں ملنے کے واسطے آیا تھا لیکن لڑکا انکار کر رہا تھا۔

''یہ زخم کب آیا تھا؟''—— میں نے پوچھا۔

''کل''—— اُس نے بے جان سی آواز میں کہا اور فوراً ہی ہکلا کر بولا—— ''کل نہیں
...... پرسوں ...... ہاں ہاں پرسوں''—— اور پھر وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس پڑا۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے یہ پٹی کہاں سے کروائی تھی۔ وہ اور زیادہ گھبرا
گیا اور اُس کے ہونٹ ہلے مگر کوئی آواز نہ نکلی، آخر اس نے ایک کیمسٹ کا نام لیا جو اُسی
آبادی میں دکان کرتا تھا اور ڈسپنسر بھی تھا۔ میں نے اُس کو کہا کہ میں اس کیمسٹ سے جا کر
پوچھوں گا کہ زخم کی کیا حالت ہے۔ یہ بات سن کر یہ نوجوان تو اس طرح لگا جیسے کانپ رہا

ہو۔

''پوچھنے کی کیا ضرورت ہے!''— اُس نے کہا— ''زخم کوئی زیادہ خراب
نہیں''۔

''تم تو کہتے ہو کہ پھنسی ہے''— میں نے مسکراتے ہوئے کہا— ''اب کہتے ہو ز
ہے''۔

اب اُس نے جس طرح مجھ کو دیکھا، میں بیان نہیں کرسکتا۔ مجھ کو تو یہ ڈر لگ گیا تھا کہ یہ لڑکا غش کھا جائے گا۔ اتنے میں اُس کی ماں چائے لے کر کمرے میں آ گئی...... میرا خیال تو یہ تھا کہ اگر یہی قاتل ہے تو یہ زخم اُس کے ایک ہاتھ کی الٹی طرف ہونا چاہئے تھا لیکن زخم چہرے پر تھا۔ مجھ کو خیال آیا کہ وہ سکتا ہے مقتولہ کا ہاتھ اس کے چہرے تک پہنچ گیا ہو۔ مقتولہ کے دائیں ہاتھ کے ناخنوں میں خون تھا اور اس لڑکے کے چہرے پر بائیں طرف زخم تھا اور بائیں طرف ہی ہونا چاہئے تھا۔ میں اُس کے اس زخم کو شاید نظر انداز کر دیتا لیکن اُس نے میرے واسطے وجوہات پیدا کر دی تھیں کہ اس پر شک ہوتا تھا۔ ایک یہ کہ وہ اس زخم چھپا رہا تھا اور اس کو پھنسی کہہ رہا تھا، دوسرے یہ کہ وہ باپ کو ملنے کے واسطے ہوٹل میں دو
گیا تھا لیکن یہ انکار کر رہا تھا اور تیسری بات یہ تھی کہ اس کی زبان ہکلا گئی تھی اور اس کا رنگ ہی اڑ گیا تھا۔ اب میں نے اس کیمسٹ سے پوچھنا تھا کہ اس نے اُس سے پٹی کروا
تھی یا نہیں۔

میری چکر بازیاں

''آپ کا بیٹا تو بہت ہی شریف اور سیدھا لڑکا ہے''— میں نے بڑی شفقت پیار کے لہجے میں کہا— ''اس کو وہم ہے کہ یہ زخم اس کے چہرے پر اچھا نہیں لگتا۔ یہ مجھ کو تھانیدار سمجھ کر ڈر بھی رہا ہے۔ میں اس کو پولیس میں اے ایس آئی بھرتی کرواؤں اس کو سمجھائیں کہ چہرے پر یہ زخم ہے یا پھنسی ہے، ٹھیک ہو جائے گی اور چہرہ بالکل ٹھ
ہو جائے گا''۔

اس کی ماں نے چائے کی پیالی میرے آگے رکھی اور کہنے لگی— ''چار روز ہو
یہ اپنے ایک چچازاد بھائی کے ساتھ فلم کا آخری شو دیکھنے گیا تھا۔ رات بارہ بجے کے بع

ا تو میں نے اس کے منہ پر یہ پٹی لگی ہوئی دیکھی تو پوچھا تو اس نے بتایا کہ دونوں ایک ہی ائیکل پر گئے تھے اور واپس آتے سائیکل سلپ ہو گیا اور دونوں گر پڑے۔ وہاں شاید ے کا کوئی ٹکڑا یا لوہے کی کوئی پتری پڑی ہوئی تھی جس پر اس کا منہ لگا اور یہ زخم آ گیا''۔

''ارے بھائی!''— میں نے اس نوجوان کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا— 'جوانوں کو زخم آتے ہی رہتے ہیں۔ تم جوان مرد ہو، زخم کا تھوڑا سا نشان رہ بھی گیا تو کچھ ہیں ہو جائے گا''۔

میں نے یہ بات اس طرح کہی جس طرح کوئی دوست بڑے اچھے موڈ میں کہتا ہے یکن اندر سے میری حالت کچھ اور ہو گئی۔ اس لڑکے نے مجھ کو بتایا تھا کہ یہ زخم یا پھنسی سوں کی بات ہے۔ دراصل اس نے پہلے کل کہا تھا اور اب اس کی ماں کوئی اور ہی کہانی سنا ی تھی۔ میں نے دماغ پر زور دیا تو اس فیصلے پر پہنچا کہ اس کی ماں کو فی الحال رہنے دوں ور اس کو تھانے لے چلوں۔

میں آپ کو نہیں بتاؤں گا کہ میں اس کو کس جتن سے تھانے لے گیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بڑے پیار کی اور استادی کی باتیں کیں اور اس کو یہ جھانسہ بھی دیا کہ اس کو اے ایس آئی بھرتی کرواؤں گا لیکن میرے ایک بڑے افسر کے ساتھ اس کی ایک ملاقات بہت ضروری ہے۔ بہرحال میں لمبی بات نہیں کروں گا، آپ یہ سمجھ لیں کہ میں اس لڑکے کو اپنے ساتھ لے چلا اور اس کی ماں کو بہت تسلیاں دیں کہ اس کے بارے میں پریشان نہ ہوتی رہے، میں اس کو تانگے میں بٹھا کر بھیجوں گا۔

اس کے گھر سے نکلے تو میں نے اس کو کہا کہ وہ مجھ کو اس کیمسٹ کی دکان پر لے چلے جس سے اس نے یہ پٹی کروائی تھی...... پہلے تو وہ ویسے ہی ٹالتا رہا لیکن میں ٹلنے والا نہیں تھا۔ تب اُس نے کہا کہ یہ پٹی اُس کے چچازاد بھائی نے کی تھی۔ میں نے پوچھا کہ اُس کے چچازاد بھائی کا گھر کہاں ہے۔ اس نے بتا دیا۔ میں نے چلتے چلتے وہیں کانسٹیبل کو الگ کیا اور اُس کے کان میں اس لڑکے کے چچازاد بھائی کا مکان سمجھایا اور کہا کہ وہ اُس کو ساتھ لے کر تھانے پہنچ جائے۔ میں قریشی کے اُس بیٹے کو جس کا نام میں رشید لکھوں گا ساتھ لے کر تھانے چلا گیا اور اس کو الگ بٹھا دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ہیڈ کانسٹیبل اُس کے چچازاد بھائی کو بھی لے آیا اور اس کو کانسٹیبلوں کی بارک میں بٹھا دیا تا کہ رشید ابھی اس کو نہ دیکھ سکے۔ اس کے اصلی نام کی بجائے میں نذیر

لکھوں گا۔

میں نے رشید کو اپنے سامنے بٹھایا اور اس کو کہا کہ وہ صرف یہ بتا کر میری تسلی کر دے کہ اُس نے اس زخم کو پھنسی کیوں کہا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اُس نے یہ جھوٹ کیوں بولا کہ یہ زخم کل یا پرسوں آیا تھا۔ تیسری بات یہ کہ وہ دو مرتبہ ہوٹل میں اپنے باپ کو ملنے کے واسطے گیا تھا لیکن اُس نے جھوٹ بولا کہ وہ نہیں گیا۔ اُس نے چوتھا جھوٹ یہ بولا کہ ڈ... کیمسٹ سے پٹی کروائی تھی مگر بعد میں یہ کہا کہ یہ پٹی چچازاد بھائی نذیر نے کی تھی۔

''صحیح جواب دے دو اور تمہاری چھٹی'' — میں نے کہا۔

وہ عادی مجرم تو تھا نہیں کہ اِدھر اُدھر کے جھوٹ جوڑ لیتا، اس نے کچھ کہنے کی بجائے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا'' — میں نے اُس کو کہا کہ سوچنے کی مہلت نہیں دوں گا۔ اُس کی حالت یہ ہو گئی جیسے ابھی رو پڑے گا۔

''میں دراصل ڈر گیا تھا'' آخر اُس نے ایسے لہجے میں کہا جس سے صاف پتہ لگتا کہ اُس کا دماغ اُس کا ساتھ نہیں دے رہا اور یہ بلا سوچے سمجھے بات کر رہا ہے — ''یہ قتل کا کیس ہے۔ اس واسطے میں جھوٹ بولتا رہا کہ آپ مجھ کو ہی شک میں نہ پکڑ لیں''۔

میں نے اُس کی یہ بات سنی اور کچھ کہے بغیر اپنے کمرے سے نکل آیا اور کانسٹیبلوں کی بارک میں جا کر اُس کے چچازاد بھائی نذیر کو الگ بٹھا لیا۔ وہ رشید کی ہی عمر کا نوجوان اور اس کا رنگ بھی اڑا ہُوا تھا۔ وہ مجھ کو اس طرح سہم کر دیکھ رہا تھا جیسے میں اس کو ذ... کرنے لگا ہوں۔

''حوصلہ کرو نذیر!'' — میں نے اُس کو کہا — ''ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ تم پر کو... الزام نہیں۔ مجھ کو دو تین سوالوں کا سولہ آنے صحیح جواب دے دو اور گھر چلے جاؤ ...... جس رات قریشی صاحب کی اینگلو انڈین بیوی قتل ہوئی اُس رات تم اور رشید کہاں تھے؟ ...... مت کہنا کہ تم اپنے گھر تھے۔ میں جانتا ہوں تم اُس وقت اپنے گھر نہیں تھے جس وقت عورت قتل ہوئی تھی۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ رشید کے چہرے پر یہ زخم کس طرح آیا ہے اور تم نے اس کی پٹی کی تھی؟''

مقتولہ کے نوکر کا بیان تھا کہ دو آدمی آئے تھے جنہوں نے اُس کو باندھ کر برآمدے میں پھینک دیا تھا اور ایک آدمی اندر گیا تھا۔ مجھ کو یہ شک ہوا کہ رشید ہی اگر قاتل تھا تو اُس کے ساتھ یہ لڑکا نذیر تھا۔ میں دراصل ہوا میں تیر چلا رہا تھا۔ کبھی تو مجھ کو یہ خیال بھی آ جاتا

کہ یہ میرا وہم ہے، یہ بدھو سے لڑکے اتنا سنگین جرم کرنے کی ہمت رکھتے ہیں نہ ان میں اتنی عقل ہے۔

میں اٹھ کھڑا ہُوا تھا لیکن نذیر بیٹھا رہا اور میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں جو صاف نشانی تھی کہ یہ میرا اصل ملزم ہے۔ یوں پتہ لگتا تھا جیسے اُس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ اُس کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔

''میں نے تم کو پہلے کہا ہے کہ سچ بولو اور چھٹی کرو'' — میں نے کہا — ''میں نے تم کو ویسے ہی تھانے نہیں بلا لیا، ساری باتیں معلوم کر کے بلایا ہے۔ اٹھو اور ذرا میرے ساتھ آؤ''۔

میں اُس کو بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف لے گیا اور دروازے میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ میرے کمرے میں رشید بیٹھا ہُوا تھا۔ رشید نے ہماری طرف دیکھا۔ میں نے نذیر کو پھر بازو سے پکڑا اور بارک میں لے گیا اور اُسی جگہ بٹھا دیا۔

''میں تم کو یہی دکھانا چاہتا تھا کہ اصل بات مجھ تک کس نے پہنچائی ہے'' — میں نے کہا — ''رشید صبح سے یہاں ہے اور وہ اصل بات بتا چکا ہے۔ میں اب یہ دیکھوں گا کہ تم کتنا کچھ سچ بولتے ہو پھر فیصلہ کروں گا کہ تمہاری مدد کروں یا رشید کی۔ میں تم میں سے ایک کو چھوڑ سکتا ہوں ...... بولو، کیا کہتے ہو ...... تھوڑا وقت دے دوں گا، سوچ لو''۔

میں اس کو بڑی سخت پریشانی اور اذیت میں چھوڑ کر وہاں سے اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''دیکھ لیا رشید!'' — میں نے قریشی کے بیٹے رشید کو کہا — ''تمہارے چچازاد بھائی نے تو ایک منٹ بھی دیر نہیں لگائی اور اصل بات سنا ڈالی ہے۔ میں نے اب یہ دیکھنا ہے کہ تم زیادہ سچ بولتے ہو یا نذیر۔ تم دونوں میں سے جو سولہ آنے سچ بولے گا اُس کو میں چھوڑ دوں گا ...... بولو کیا کہتے ہو ...... تمہارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ مقتولہ کے نوکر نے تم دونوں کو پہچان لیا تھا۔

یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ان دونوں کو میں نے یہی الفاظ نہیں کہے تھے جو آپ کو سنا رہا ہوں۔ یہ ایک استادی طریقہ ہوتا ہے جس میں زبان کے کچھ کرتب کرنے پڑتے ہیں۔ اس خاص طریقے سے اکثر تھانیدار بڑے پکے اور ڈھیٹ ملزموں کو بھی توڑ لیتے ہیں اور

اقبالی بیان لے لیتے ہیں۔ یہ لڑکے تو بالکل ہی اناڑی اور بچے تھے۔ یہ اب میرے دماغ کا کمال تھا کہ میں پوری کامیابی حاصل کرلوں۔ بہت ہی سوچ سوچ کر میں نے تیر چلائے اور رشید نے رونا شروع کر دیا۔

میں رشید کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل اندر آیا اور اُس نے میرے کان میں کہا کہ اس لڑکے کا باپ آ رہا ہے۔ میں فوراً اٹھا اور باہر نکل گیا۔ میں اُس وقت نہیں چاہتا تھا کہ وہ تھانے میں کچھ دیر بیٹھے۔ میں نے باہر ہی اُس کا استقبال کیا۔ وہ کچھ زیادہ پریشانی کی حالت میں تھا۔ اُس نے کہا کہ اُس کو ٹیلی فون پر بتایا گیا ہے کہ میں اُس کے بیٹے اور بھتیجے کو تھانے لے آیا ہوں۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں ان کو کیوں لایا ہوں۔ میں نے اُس کو بتایا کہ وہ ملزم تو نہیں کہ اُس کو اتنی فکر لگ جائے۔ میں تفتیش کر رہا ہوں، ان لڑکوں سے دو چار باتیں پوچھ کر گھر بھیج دوں گا۔

وہ میرے پیچھے ہی پڑ گیا کہ میں ان لڑکوں سے کیا پوچھنا چاہتا ہوں اور پھر وہ کہنے لگا کہ وہ تھانے میں ہی رہے گا اور ان دونوں لڑکوں کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ میں نے پہلی بار اُس کے ساتھ تھانیداروں کے لہجے میں بات کی۔ اُس کو کہا کہ وہ میرے کام میں دخل اندازی نہ کرے ورنہ میں اس کو تھانے کے احاطے سے باہر نکال دوں گا اور میں یہ کام دو کانسٹیبلوں سے کرواؤں گا۔ اس طرح وہ ٹلا۔ میں پھر رشید کے پاس جا بیٹھا۔

رشید بدستور رو رہا تھا۔ میں نے اُس کو تسلیاں دیں اور اُس کا حوصلہ بڑھایا اور یہ وعدہ پھر کیا کہ اُس کو اس واردات سے نکال دوں گا۔ اُس کا کوئی جواب سنے بغیر میں بارک کی طرف چلا گیا۔ دروازے میں جا کر دیکھا کہ دو کانسٹیبل نذیر کے پاس بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ وہ پرانے تجربہ کار کانسٹیبل تھے۔ مجھ کو معلوم تھا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ وہ نذیر کا حوصلہ بڑھا رہے تھے اور اُس کو سبز باغ دکھا کر تیار کر رہے تھے کہ اس نے کوئی جرم کیا ہے تو اقبالی بیان دے دے اور اُس کو اس کا بہت فائدہ ملے گا۔

میں جب نذیر کے پاس پہنچا تو دونوں کانسٹیبلوں نے مجھ کو کہنا شروع کر دیا کہ جناب عالی یہ بڑا اچھا اور شریف لڑکا ہے اور خاندانی بھی ہے، اس کا بیان لے کر چھوڑ دیں، بے چارہ خواہ مخواہ پریشان ہو رہا ہے۔ کانسٹیبل یہ باتیں باری باری اس طرح کر رہے تھے جیسے وہی اس لڑکے کے والی وارث تھے۔ میں نے کہا کہ میں تو پہلے ہی اس کو کہہ چکا ہوں کہ بیان دے دے اور چھٹی کرے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اُس کے چچا قریشی نے اتنی بھلی اور

شریف بیوی کو چھوڑ کر ایک کافر عورت کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ اچھا ہُوا وہ قتل ہو گئی ہے۔ میری دلچسپی اور ہمدردی تو اِن لوگوں کے ساتھ ہے۔

میری اس چکر بازی کا خاطر خواہ اثر ہُوا اور نذیر نے بیان دینے کی رضامندی دے دی۔ قتل ایک ایسا جرم ہے جس کو عادی اور پیشہ ور قاتل بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس سنگین واردات کا اثر انسان کی فطرت اور ضمیر پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اقبال جرم کر کے ہی سکون حاصل کرتا ہے۔

باپ کا پاپ

میں نے نذیر کو وہیں الگ بٹھا لیا اور اُس کے ساتھ اپنا رویہ ایک بے تکلف دوست اور مشفق باپ جیسا کر لیا۔ اس کا اتنا لمبا بیان لفظ بہ لفظ سنانے کی کوئی ضرورت نہیں، میں موٹی موٹی باتیں سنا دیتا ہوں...... اُس نے کہا کہ رشید اپنے باپ کی اس اینگلو انڈین بیوی کو قتل کرنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ وہ اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ نذیر کے ساتھ اُس کی رشتہ داری کے علاوہ دوستانہ بے تکلفی اور محبت تھی۔ رشید نے نذیر کو اپنے باپ کی جذباتی کیفیت سنائی۔ میں آپ کو یہ کیفیت نذیر کی زبانی سناؤں گا۔

نذیر رشید کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ قریشی تو ہوٹل میں رہتا تھا، اُس کے گھر میں مقتولہ اکیلی ہوتی تھی یا گھر میں نوکر تھا۔ دونوں نے یہ سکیم بنائی کہ اگلی رات اُس کے گھر جائیں گے اور دروازے پر دستک دیں گے۔ نوکر دروازہ کھولے گا تو اُس کو پکڑ کر باندھ دیں گے پھر اندر جا کر مقتولہ کا گلا گھونٹ دیں گے۔

دونوں وہاں گئے اور ویسے ہی ہُوا کہ دستک پر نوکر باہر آ گیا۔ اس وقت ان کو خیال آیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے واسطے وہ رسی تو ساتھ لائے ہی نہیں۔ نذیر نے سوچا کہ اس گھر میں چارپائی تو ضرور ہوگی، اُس کی ادوائن کاٹ لیں گے۔ نذیر کی جیب میں چاقو تھا لیکن انہوں نے دیکھا کہ نوکر نے پگڑی باندھی ہوئی تھی جو ویسے ہی سر پر رکھی ہوئی تھی، اُس میں کلاہ نہیں تھا۔ انہوں نے جس طرح نوکر کو باندھا وہ میں پہلے سنا چکا ہوں۔

نذیر نوکر کے پاس کھڑا رہا اور رشید اندر گیا۔ اُس نے بتی جلائی اور اس کو مقتولہ پلنگ پر سوئی ہوئی نظر آئی لیکن اس کی آنکھ کھل گئی۔ نذیر نے رشید کو تو اپنی آنکھوں دیکھا ہی نہیں

تھا کہ اُس نے مقتولہ کو کس طرح ختم کیا تھا۔

رشید اپنا کام کر کے باہر آیا اور نذیر کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا اور وہاں سے کچھ دور آ کر نذیر کو بتایا کہ بدبخت عورت نے ناخنوں سے اس کا منہ چھیل دیا ہے۔ نذیر نے اُس کو اپنا رومال دیا کہ یہ زخم پر رکھ لے۔ یہ پٹی نذیر نے ہی کی تھی۔

میں نے نذیر سے پوچھا کہ اس واردات کا علم قریشی اور اس کی پہلی بیوی کو بھی ہے یا نہیں...... نذیر نے کہا کہ اُس کے اور رشید کے سوا کسی کو معلوم نہیں، یعنی نہ قریشی کو نہ اس کی پہلی بیوی کو۔

نذیر کا اتنا ہی بیان سنانے کے قابل ہے حالانکہ اس کا بیان بہت ہی لمبا تھا۔ اصل دلچسپ اور جذباتی بیان رشید کا تھا۔ وہ بھی نذیر کی طرح بغیر تشدد اور دھمکیوں کے بیان دینے پر راضی ہو گیا تھا۔ اس کے بھی میں چیدہ چیدہ حصے سناؤں گا۔ آپ غور کریں کہ انسان کی فطرت گہرے سمندر جیسی ہے جس میں سے کوئی نہیں بتا سکتا کس وقت کیا سامنے آ جائے۔

اب رشید کا بیان سنیں۔ اپنے باپ کی کمیشن خوری کے بارے میں رشید نے کہا کہ دوسری شادی سے پہلے اس کو معلوم نہیں ہو سکا کہ اُس کا باپ حرام کی کمائی گھر لاتا تھا یا نہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر وہ اوپر سے کچھ کماتا بھی تھا تو وہ بہت ہی تھوڑا ہوتا تھا۔ گھر میں کوئی عیاشی اور امیری والی بات نہیں تھی۔ اگر اس کے باپ نے حرام خوری شروع کر دی تھی تو وہ دوسری شادی کے بعد کی ہوگی...... رشید نے کہا کہ جب اُس کو پتہ لگا کہ اُس کا باپ دوسری شادی کر رہا ہے تو وہ باپ کے آگے بہت رویا تھا۔ باپ نے اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر اُس کو بہلا لیا تھا۔ رشید کی ماں نے قریشی کو صاف کہہ دیا تھا کہ دوسری کی بجائے تیسری اور چوتھی شادی بھی کر لو لیکن اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ قریشی نے یہ گھر ہی چھوڑ دیا۔

قریشی پہلے ہی ایک مکان نئی آبادی میں بنوا رہا تھا اور اُس کے دونوں بیٹے بہت خوش تھے کہ نئے مکان میں جا کر آباد ہوں گے لیکن باپ نے ان کی خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ باپ ان سے الگ ہو گیا اور دوسری شادی کر لی۔ رشید کو اپنے باپ کے ساتھ بہت پیار تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ باپ اُس کو بہت ہی پیار دیتا تھا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ رشید، اس کے بھائی اور اس کی ماں نے قریشی کے بغیر

کس طرح وقت گزارا اور رشید کی ماں کا ردعمل کیا تھا۔ سنانے والی بات یہ ہے کہ رشید باپ کے دفتر میں جا کر گھر کا خرچہ لے آتا تھا۔

ایک سال گزر گیا تو رشید کو اپنے باپ کے دفتر کے کسی آدمی نے بتایا کہ اُس کے باپ کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے، اس واسطے کہ اُس نے اتنی بڑی رقم ہضم کی ہے جو چھپ نہیں سکتی تھی۔ رشید کو اس کا بہت صدمہ ہُوا اور وہ باپ کے پاس گیا۔ باپ نے اس کو تسلی دی کہ یہ سب جھوٹ ہے اور انکوائری اُس کے حق میں ہوگی۔ رشید نے یہ نوٹ کیا کہ اس کا باپ پریشان رہنے لگا تھا۔ رشید کو کسی طرح یہ پتہ لگ گیا کہ وہ دوسری بیوی سے تنگ آ چکا ہے۔

اب یہ وقت آ گیا جب ایک روز رشید باپ کے پاس دفتر گیا تو باپ نے اس کو بتایا کہ وہ فلاں ہوٹل میں شفٹ ہو گیا ہے اور اب وہیں رہے گا۔ رشید کے واسطے یہ بات بہت ہی دکھ والی تھی۔ اُس نے گھر آ کر ماں کو بتایا تو ماں نے کہا کہ وہ دوسری بیوی کو طلاق دے دے اور گھر آ جائے۔ رشید کا خیال تھا کہ اس کا باپ دوسری بیوی سے اتنا زیادہ تنگ آ چکا تھا کہ پہلی بیوی اس کو قبول کرتی تو وہ دوسری بیوی کو طلاق دے دیتا۔

رشید ہوٹل میں باپ کو ملا تو اُس نے باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ رشید نے اُس کو کہا کہ وہ دوسری بیوی کو طلاق دے دے۔ باپ نے اُس کو بتایا کہ اُس نے بیوی کے ساتھ یہ بات کی ہے اور بیوی نے اس کو دھمکی دی ہے کہ جس دن وہ اُس کو طلاق دے گا وہ دن اس کی یعنی قریشی کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ باپ نے رشید کو بتایا کہ اُس عورت کے تعلقات اور دوستانے بڑے نامی گرامی بدمعاشوں کے ساتھ بھی ہیں اور یہ عورت جو چاہے کروا سکتی ہے۔

باپ کی یہ باتیں سن کر رشید کے دماغ میں کچھ اور ہی ارادہ آ گیا۔ اس کو مقتولہ پر اتنا غصہ تھا کہ اُس کا بس چلتا تو وہ اس عورت کو فوراً ہی قتل کر دیتا لیکن اس کو کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا۔

اب دیکھئے کیا واقعہ سامنے آتا ہے۔ دوسری بار رشید باپ کو ملنے گیا۔ دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ دروازہ کھل گیا۔ اس سے پہلے اس کا باپ دروازہ اندر سے بند رکھتا تھا۔ جونہی دروازہ کھلا رشید کو ایک عجیب ہی منظر نظر آیا۔ اُس کا باپ چھت والے پنکھے کے نیچے کرسی رکھ کر اُس پر کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں مضبوط رسی تھی جو وہ اوپر پھینک کر پنکھے میں

اڑا چکا تھا۔ اب وہ رسی کو نیچے کھینچ رہا تھا۔ رشید نے یہ منظر دیکھا تو پوچھا، ابا جان، یہ کیا ہو رہا ہے؟ باپ نے کہا کچھ نہیں بیٹا، تم ابھی چلے جاؤ کچھ دیر بعد آ جانا۔

رشید کو کچھ شک ہُوا۔ اس نے لپک کر رسی کھینچ لی اور اپنے ہاتھ میں لپیٹ کر رکھ لی۔ اس نے باپ کا بازو پکڑ کر کرسی سے اتارا۔ رشید کی نظر پلنگ کے پاس پڑی ہوئی تپائی پر گئی تو وہاں ایک فل سکیپ کاغذ پڑا ہُوا تھا جس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ رشید نے جھپٹ کر وہ کاغذ اٹھا لیا اور پڑھنے لگا۔ اُس کے باپ نے اس کو نہ روکا بلکہ باپ پلنگ پر بیٹھ کر چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگا تھا۔ رشید کاغذ کی تحریر پڑھتا گیا اور اس کا پسینہ پھوٹ آیا۔ باپ نے یہ تحریر اپنی پہلی بیوی اور دونوں بیٹوں کے نام لکھی تھی۔ تحریر لمبی تھی جس کا لب لباب یہ تھا کہ اُس نے اپنی پہلی بیوی اور دونوں بیٹوں سے معافی مانگی تھی اور آگے چل کر لکھا تھا کہ اُس نے بہت بڑا گناہ کیا جس کی سزا اس کو دنیا میں ہی ملی اور اب وہ اپنی جان اپنے ہاتھوں لے کر اللہ کے حضور جا رہا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ پنکھے کے ساتھ لٹک کر مرجانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

اُس نے لکھا کہ دوسری بیوی یعنی مقتولہ کے ساتھ اُس نے دلی محبت کی تھی اور وہ خوش تھا کہ اس نے ایک غیر مسلم کو مسلمان کر لیا ہے اور یہ عورت مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کرے گی لیکن اُس عورت کو نہ اُس کے مذہب کے ساتھ دلچسپی تھی نہ اس کے ساتھ محبت تھی بلکہ اُس کے دل میں صرف روپے پیسے کی اور سونے چاندی اور قیمتی کپڑوں کی محبت تھی۔ قریشی نے لکھا کہ اس عورت کی فرمائشوں نے اُس کو مجبور کر دیا کہ وہ حرام کی آمدنی میں اضافہ کرے جو اس نے کیا اور پکڑا بھی گیا اور اب انکوائری ہو رہی ہے۔ اُس نے صاف لکھا کہ وہ حرام خوری کا مجرم ہے اور اس کی وہ اپنے محکمے سے بھی اور اللہ کی ذات سے بھی معافی مانگتا ہے۔

پھر اُس نے لکھا کہ جس بیوی نے اتنی مدت اس کے ساتھ پیار اور محبت سے گذاری تھی اور جس نے اس کو دو بیٹے بھی دیئے تھے، اس کو اُس نے ناراض کیا اور ایسی عورت کی خاطر ناراض کیا جس نے دھوکہ دیا، گناہگار بنایا اور وفا نہ کی۔ اُس نے لکھا کہ اُس عورت کو طلاق نہیں دے سکتا ورنہ یہ مجھ کو مروا دے گی۔

اس طرح اُس نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور اپنی مجبوریاں بھی بیان کیں اور سب سے معافی مانگی اور پھر یہ وصیت لکھی کہ پرانا مکان اُس کے دونوں بیٹوں کے نام کر دیا جائے اور نیا مکان اس کی بیوی کو دیا جائے یعنی اُس کے بیٹوں کی ماں کو۔ نیچے اُس نے اپنا نام لکھا تھا اور اب وہ چھت کے ساتھ رسی باندھ کر کرسی پر کھڑا ہُوا تھا کہ پھندہ اپنے گلے میں ڈال کر اپنے آپ کو پھانسی دے لے۔

اُس نے دروازہ اس لئے اندر سے بند نہیں کیا تھا کہ ہوٹل کا کوئی نوکر یا کوئی آدمی آ جائے تو وہ پولیس کو اطلاع دے کر لاش اتار لے اور یہ آخری تحریر اس کے بیوی بچوں تک پہنچا دے۔

رشید کو چکر آنے لگے۔ اس نے باپ کو روتے دیکھا تو اُس کے ساتھ بغلگیر ہو گیا اور بہت رویا لیکن فوراً ہی اپنے آپ کو قابو میں لے آیا اور باپ کی منتیں کرنے لگا کہ وہ اُس کو دو دنوں کی مہلت دے دے تو اللہ کرے گا کہ نجات کا کوئی ذریعہ مل جائے گا۔ باپ نے بیٹے کو کہا کہ اب نجات کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا۔ مختصر بات یہ کہ رشید نے اُس کو اللہ، قرآن اور رسولؐ کی قسمیں دے کر راضی کر لیا کہ وہ دو یا تین دن خودکشی کا ارادہ ملتوی کر دے۔

رشید نے باپ کو یہ بھی کہا کہ وہ اُس کے ساتھ گھر چلے لیکن باپ کہتا تھا کہ وہ پہلی بیوی کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے۔ بہر حال رشید نے اُس کو ٹھنڈا کر لیا اور پھر اپنے گھر گیا لیکن اس نے اپنی ماں کو نہ بتایا کہ باپ خودکشی کرنے لگا تھا۔ یہ تو قریشی کی زندگی لکھی ہوئی تھی کہ رشید عین اُس وقت پہنچا جب باپ پنکھے سے لٹکنے لگا تھا۔

پھر جس طرح نذیر نے بیان میں کہا تھا، اُسی طرح رشید نے بھی بیان مین کہا کہ اس نے نذیر کے ساتھ بات کی اور دونوں نے قتل کا پروگرام بنا لیا۔ پھر انہوں نے جس طرح مقتولہ کو قتل کیا وہ پہلے سنایا جا چکا ہے۔

رشید نے اپنے چہرے کے زخم کے بارے میں یہ بتایا کہ مقتولہ بڑی تندرست اور سمارٹ عورت تھی۔ رشید نے جب اُس کا گلا دبایا تو وہ اُس کے اوپر اتنا جھک گیا کہ اس کا منہ مقتولہ کے منہ سے تھوڑی ہی دُور رہ گیا۔ مقتولہ نے اُس کے چہرے پر ناخن گاڑ دیئے اور نیچے کو کھینچے جس سے چہرے کی کھال ادھڑ گئی۔ رشید نے اپنے ہاتھ کی گرفت اور سخت کر دی تب مقتولہ نے ناخن اس کے چہرے سے ہٹائے۔ پھر وہ مر گئی۔

رشید نے اپنی اس واردات کا ذکر اپنے باپ کے ساتھ نہ کیا اور ماں کو بھی نہ بتایا۔

قتل کے بعد رشید باپ کو ملا اور اُس کو کہا کہ دیکھا اللہ کیسا ذریعہ پیدا کر دیا ہے۔ قریشی کے ساتھ بعد میں میری بات ہوئی تو اُس نے تصدیق کی کہ اس کا بیٹا رشید اگر اُسے بتا تا بھی کہ

اس نے مقتولہ کو قتل کیا ہے تو قریشی کبھی نہ مانتا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا بیٹا اور بھتیجا اتنا سنگین جرم کر سکتے ہیں۔ بہر حال انہوں نے یہ جرم کیا اور پکڑے گئے۔

دونوں نے مجسٹریٹ کے سامنے اقبالی بیان زیر دفعہ 164 دے دیئے اور دونوں کو جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔ میں نے مقدمہ تیار کیا جس میں میرے انگریز ڈی ایس پی نے بہت مدد اور راہنمائی کی۔

قریشی امیر کبیر آدمی تھا۔ اُس کے پاس حرام کا بہت مال تھا۔ اس نے اس شہر کا سب سے زیادہ قابل وکیل کیا اور اُس کی مدد کے لئے ایک اور قابل وکیل کر لیا۔ مجھ کو ڈر تھا کہ میرا مقدمہ یہ دونوں وکیل ناکام کر دیں گے لیکن میں نے بھی بہت محنت کی تھی۔ مقدمہ چلا اور آخر میں سیشن جج نے رشید کو سزائے موت دی اور نذیر کو اعانت جرم میں آٹھ سال قید بامشقت دی۔

قریشی نے ہائیکورٹ میں اپیل دائر کی۔ ہائیکورٹ نے رشید کی نوعمری دیکھ کر سزائے موت عمر قید میں بدل دی اور نذیر کی سزائے قید آٹھ سال بحال رہی۔

تھوڑے عرصے بعد مجھ کو کسی سے خبر ملی تھی کہ قریشی اپنی پہلی بیوی کے پاس گیا تو بیوی نے اُس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اُس کی کرتوت کی وجہ سے اس کا جوان بیٹا عمر بھر کے لئے جیل میں بند ہو گیا ہے۔ پھر اُس کی جوانکوائری ہو رہی تھی اُس کی بھی خبر ملی۔ میرا خیال ہے اُس نے رشوت چلا کر فیصلہ اپنے حق میں کروا لیا تھا۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں کہ یہ شخص کہاں گیا اور کہاں رہا۔

* * *

بہن، بیوی اور بلیک میلنگ

ایک روز صبح سویرے سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا کہ تھانے سے ایک کانسٹیبل برے گھر آیا۔ میرا گھر تھانے کے قریب ہی تھا۔ کانسٹیبل نے بتایا کہ ایک صوبیدار تھانے یں کوئی اطلاع لایا ہے، شاید کسی کی لاش کی اطلاع ہے۔ میں تھانے جانے کے واسطے ابھی الکل ہی تیار نہیں تھا لیکن میں بڑی ہی پھرتی سے تیار ہو کر تقریباً دوڑتا ہوا تھانے پہنچا۔

اتنی پھرتی کی بابت بتاتا ہوں کہ میں نے کیوں کی تھی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ گریزوں کی حکومت تھی جس نے پولیس کے واسطے حکم دے رکھا تھا کہ جونہی کسی واردات کی اطلاع ملے تم جس حالت میں بھی ہو اور جہاں کہیں بھی ہو، فوراً پہنچو۔ قتل اور ڈکیتی کے عاملے میں تو انگریز یہ توقع رکھتا تھا کہ پولیس والے جن بھوت بن جائیں اور تیزی سے رکت کریں۔

دوسری وجہ میری پھرتی کی یہ تھی کہ اطلاع لانے والا ایک فوجی تھا۔ وہ جنگ عظیم دوم ا زمانہ تھا۔ پولیس کے واسطے حکم تھا کہ کوئی فوجی سپاہی بھی آ جائے تو اس کی بات فوراً سنو راس پر عمل کرو۔ یہ فوجی جو تھانے میں آیا تھا، مجھ کو بتایا کہ صوبیدار ہے۔ وہ حاضر نوکری کا وبیدار تھا اور ایک مہینے کی چھٹی آیا ہوا تھا۔

اس صوبیدار نے مجھ کو جو اطلاع دی وہ یہ تھی کہ وہ علی الصبح حسب عادت اٹھا اور کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ یہ بھی ذہن میں رکھ لیں کہ یہ دیہاتی علاقہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک بہ تھا جو آج اچھا بھلا شہر بن گیا ہے۔ اس وقت یہ چھوٹا سا قصبہ تھا جس کا ریلوے سٹیشن ی تھا اور اناج کی بہت بڑی منڈی تھی۔ اس کے اردگرد سے کھیت شروع ہو جاتے تھے راس سے آگے دیہاتی علاقہ تھا۔ تھانہ قصبے میں تھا۔ دیہاتی علاقے کا بھی کچھ حصہ میرے انے کے تحت آتا تھا۔ یہ صوبیدار اسی قصبے کا رہنے والا تھا۔

صوبیدار نے اطلاع یہ دی کہ وہ کھیتوں سے آگے چلا گیا جہاں سے بنجر علاقہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا بڑی اچھی نسل کا پالتو کتا تھا۔ صوبیدار نے دور ایک گیدڑ دیکھا جو منہ میں کچھ اٹھائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ یہ پتہ نہیں لگتا تھا کہ گیدڑ نے منہ میں کیا پکڑا ہوا ہے۔ اس کو کتے نے دیکھ لیا اور اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ گیدڑ بہت ہی بزدل جانور ہوتا ہے۔ اس گیدڑ نے کتے کو اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ بھاگا لیکن منہ میں پکڑی ہوئی چیز اس واسطے اس کو تیز بھاگنے نہیں دیتی تھی کہ یہ اس کی ٹانگوں کو لگتی تھی۔ کتا اس کے قریب پہنچ گیا۔ گیدڑ نے منہ میں پکڑی ہوئی چیز پھینکی اور اتنا تیز بھاگا کہ وہیں کہیں غائب ہو گیا۔

کتے نے وہ چیز اٹھا لی اور صوبیدار کی طرف آیا۔ کتا جب قریب آیا تو صوبیدار نے دیکھا کہ یہ تو کسی انسان کا بازو ہے جو جسم سے کاٹا گیا تھا۔ صوبیدار نے کتے کو اشارہ کیا۔ اس نے یہ انسانی بازو پھینک دیا۔ صوبیدار نے جھک کر دیکھا۔ بازو کی حالت بتا رہی تھی کہ یہ زیادہ دن پرانا نہیں ہوا۔ صوبیدار کو یہ اندازہ اس طرح ہوا کہ بازو میں ابھی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

صوبیدار نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے دو آدمی نظر آئے۔ اس نے دونوں کو آوازیں دے کر بلایا۔ دونوں آئے تو صوبیدار نے ان کو بازو دکھا کر کہا کہ اس بازو کو دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ اس علاقے میں کوئی آدمی قتل ہوا ہے اور بازو اس کی لاش سے کاٹا گیا ہے۔

"تم دونوں یہیں کھڑے رہو" ___ صوبیدار نے کہا ___ "میں تھانے اطلاع دینے جاتا ہوں"۔

اس زمانے میں پولیس دیانتداری اور فرض کی لگن سے اپنا کام کرتی تھی اس واسطے پبلک پولیس کے ساتھ تعاون کرتی تھی۔ یہ شخص صوبیدار تھا اس واسطے ڈسپلن اور قانون کا پابند تھا۔ وہ تھانے پہنچا اور مجھ کو رپورٹ دی۔

صوبیدار نے اچھا کیا تھا کہ بازو وہیں چھوڑ آیا تھا۔ یہ تو مانا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ کسی نے کوئی نئی قبر کھود کر میت کا بازو الگ کر لیا ہوگا۔ میں ایک ہیڈ کانسٹیبل اور چار کانسٹیبل ساتھ لے کر صوبیدار کے ساتھ چل پڑا اور اس جگہ جا پہنچا جہاں بازو پڑا تھا۔

تسکین حاصل کرنے کی کوشش

سب سے پہلے بازو کو اس طرف سے دیکھا جس طرف سے یہ جسم سے الگ کیا گیا تھا۔ یہ کسی درندے نے کھینچ کر الگ نہیں کیا تھا بلکہ کلہاڑی سے یا قصائیوں کے بڑے چھرے سے جسم سے کاٹا گیا تھا۔ صوبیدار کا اندازہ ٹھیک تھا۔ دو یا تین دن پہلے یہ بازو زندہ جسم کے ساتھ تھا۔ یہ بایاں بازو تھا۔ درمیانی اور چھوٹی انگلی میں سونے کا رنگ تھا۔ بازو کچھ مرجھایا ہوا تو تھا پھر بھی یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی جوان آدمی کا بازو ہے۔

صوبیدار سے پوچھا کہ گیدڑ کدھر سے آ رہا تھا۔ صوبیدار نے جو سمت بتائی میں اُدھر کو چلا گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل کو یہ سمجھا کر آگے دوڑا دیا کہ میں کیا دیکھنا چاہتا ہوں...... ہیڈ کانسٹیبل ابھی بمشکل پچاس گز دور گیا ہوگا کہ رک گیا اور ہاتھ اوپر کیا۔ میں بہت تیز چلتا وہاں گیا۔ میرا شک صحیح تھا۔ وہاں ایک لمبوترا گڑھا کھودا گیا اور بازو اس میں دبایا گیا تھا۔ گڑھا زیادہ گہرا نہیں کھودا گیا تھا اس واسطے اس گیدڑ نے مشک پا کر بازو نکال لیا تھا۔ اگر شیر، چیتا یا بھیڑیا ہوتا تو بازو کو وہیں بیٹھ کر کھا لیتا لیکن گیدڑ کی یہ روایتی بزدلی تھی کہ بازو اپنے گھر لے جا کر اور چھپ کر کھانا چاہتا تھا۔

میرے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور چار کانسٹیبلوں کے علاوہ وہاں بہت سے تماشائی اکٹھے ہو گئے تھے۔ میں نے سب سے کہا کہ تھوڑی دور دور گھوم پھر کر دیکھیں، تازہ کھدی ہوئی مٹی کی ڈھیریاں نظر آئیں گی۔ ڈھیریاں نہ ہوں تو کھدی ہوئی جگہیں نظر آئیں گی اور ان پر مٹی ہموار کی ہوئی ہوگی...... لوگ پھیل گئے اور زمین کو کھوجنے لگے۔

یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ زمین کیسی تھی۔ ہرے بھرے کھیت جہاں ختم ہوتے تھے وہاں سے سیم زدہ زمین شروع ہوتی تھی جو بالکل خشک تھا اس کا رنگ سفیدی مائل تھا اور اس میں چھوٹی چھوٹی کئی کئی نوکوں والی کنکریاں بکھری ہوئی تھیں۔ زمین اونچی نیچی تھی۔ کہیں گہرائی اور کہیں بلندی تھی۔ زمین کٹی پھٹی بھی تھی۔ وہاں ایک بھی درخت نہیں تھا۔ گھاس کا نام ونشان نہ تھا۔ ایسی زمین کو اس علاقے کی زبان میں کلری زمین کہتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ کچھ دور تین گدھ اتر رہے تھے۔ وہ جہاں اترے وہ جگہ ایک ٹیلے کے پیچھے تھی۔ یہ ٹیلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ابھی اس ٹیلے کے پیچھے کوئی نہیں گیا تھا۔ میں اس طرف گیا اور ڈھیری جیسی ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر دیکھا۔ تھوڑی دور چند ایک گدھ

زمین پر کچھ کھاتے ہوئے آپس میں لڑ رہے تھے۔

میں صوبیدار کو ساتھ لے کر وہاں پہنچا۔ گدھوں کو پتھر مارے۔ صوبیدار نے اپنا کتا چھوڑا اور گدھوں کو اڑایا۔ وہاں اوپر کا انسانی دھڑ پڑا تھا۔ اوپر سے سر غائب، کمر کے نیچے ٹانگیں غائب تھیں۔ دونوں بازو نہیں تھے۔ کپڑوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ سینے کا گوشت، پھیپھڑے، کلیجی وغیرہ کھائے جا چکے تھے۔ پسلیاں اور دیگر ہڈیاں کہیں کہیں سے ننگی ہوگئی تھیں۔ جسم کا یہ حصہ یہاں دبایا گیا تھا۔

اتنے میں مجھ کو بتایا گیا کہ دو اور جگہیں دیکھی گئی ہیں جہاں کھدائی کی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں وہاں گیا اور ایک جگہ کھدوائی۔ وہ تو پہلے ہی کھودی ہوئی تھی، مٹی نکالی تھی، نکلوائی تو اس میں سے دایاں بازو نکلا۔ یہ بھی بائیں بازو کی طرح کسی جوان آدمی کا لگتا تھا۔ اس کی مشک ابھی گیدڑوں وغیرہ کو نہیں ملی تھی اس واسطے یہ ابھی زمین میں دبا ہوا تھا۔

پھر میں دوسری جگہ گیا۔ وہاں بھی زمین کھودی ہوئی اور اوپر مٹی ڈالی ہوئی لگتی تھی۔ مٹی نکلوائی تو ایک سر نکلا اور زری کلے پر لپٹی ہوئی مشہدی لنگی نکلی۔ اس سے مقتول کی شناخت ہوسکتی تھی۔ آپ سوچیں گے کیا چہرے سے شناخت نہیں ہوسکتی تھی؟ چہرہ بھی تو سر کے ساتھ برآمد ہوا تھا!...... نہیں! کلہاڑی مار مار کر چہرے کی ہڈیاں توڑ دی گئیں اور گوشت کا قیمہ بنا دیا گیا تھا۔ چہرہ گوشت کا لوتھڑا بنا ہوا تھا۔

لوگوں کی تلاش اور نشاندہی پر دو جگہوں سے ایک ایک ٹانگ برآمد ہوئی۔ ٹانگیں کولہے سے کاٹی گئی تھیں۔ پاؤں میں زری جوتی تھی۔

یہ تمام اعضاء ایک دوسرے سے دور دور زمین میں دبائے گئے تھے۔ میں بتاتا ہوں کہ بازو جو گیدڑ کے منہ سے چھڑایا گیا تھا، دیکھ کر میں نے کیوں کہا تھا کہ کچھ دور دور دیکھو، دور سے اعضاء بھی ملیں گے۔ یہ میرا تجربہ تھا۔ ایسے قتل انتقامی طور پر کئے جاتے ہیں۔ قاتل کے دل میں مقتول کی اتنی زیادہ دشمنی اور نفرت ہوتی ہے کہ قتل کر کے بھی انتقام کی آگ سرد نہیں ہوتی اس واسطے وہ مقتول کے اعضاء کاٹ کر تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس واردات سے چھ سال پہلے میں نے ایک قاتل کو پکڑا تھا۔ اس نے اپنے گھر میں اپنے ایک دوست کے ساتھ اپنی بیوی کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیا تھا۔ بیوی کو اس نے طلاق دے دی تھی لیکن دوست کو اس نے باہر غیر آباد اور ویران علاقے میں لے

کر چاقو سے قتل کیا اور اس کے اعضاء اس طرح کاٹے کے بازوؤں کے بھی تین تین ٹکڑے کئے ٹانگوں کو بھی تین تین ٹکڑوں میں کاٹا۔ کان بھی کاٹ دیئے اور ناک بھی۔ سر کاٹا اور یہ سارے اعضاء ایک دوسرے سے دور دور دبا دیئے۔ میں نے اس کو پکڑ لیا تھا۔ اس نے اقبالی بیان دیا اور خود یہ تمام اعضاء برآمد کرائے تھے۔ اس کو صرف پانچ سال سزائے قید دی گئی تھی اس واسطے کہ فوری اشتعال ثابت ہوگیا تھا۔

اب جو واردات سنا رہا ہوں یہ بھی انتقامی قتل تھا۔ نفرت اور انتقام کی شدت کا اندازہ صرف کٹے ہوئے اعضاء دیکھ کر نہیں بلکہ چہرہ دیکھ کر ہوتا تھا جس کا اس نے قیمہ کر دیا تھا۔

اصل حرام کی اولاد تھا

پہلا مسئلہ تو لاش کی شناخت کا تھا۔ اس کو کپڑوں کے ٹکڑوں سے، کلے اور مشہدی لنگی سے، زری جوتی اور انگلی میں پڑے ہوئے سونے کے رنگ سے شناخت کیا جاسکتا تھا۔ میں نے تمام اعضاء ایک جگہ رکھوا دیئے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑے بھی پاس رکھ دیئے اور لوگوں کو کہا کہ اس کی شناخت کریں۔ ایسا تو کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ مقتول اس قصبے یا فلاں گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ کسی دور کے گاؤں کا بھی ہوسکتا تھا، کہیں جا رہا تھا یا کہیں سے اپنے گاؤں کو آ رہا تھا اور دشمنوں نے اس کو راستے میں روک کر قتل کر دیا۔

تماشائیوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں کو کہا تھا کہ لوگوں کو کہیں کہ لاش کے ٹکڑے اور دوسری چیزیں دیکھیں اور اس کو شناخت کرنے کی کوشش کریں۔ تماشائیوں میں زیادہ تعداد اس واسطے قصبے کے لوگوں کی تھی کہ قصبہ قریب تھا۔

آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ شناخت ہوگئی۔ شناخت کی تصدیق اس طرح ہوئی کہ ایک آدمی نے مجھ کو پھٹی ہوئی قمیض کا وہ ذرا بڑا ٹکڑا دیا جس کے ساتھ پہلو والی جیب تھی۔ یہ اس آدمی نے کہیں پڑا دیکھا۔ جیب میں کچھ پیسے تھے۔ بڑے سائز کا ایک چاقو تھا جو اس وقت بدمعاش اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔ دو اور چیزیں جیب سے برآمد ہوئیں جو مجھ کو بالکل یاد نہیں رہا کیا تھیں۔ شاید ایک کاغذ بھی تھا جس پر مقتول کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں کہنا یہ چاہ رہا ہوں کہ مقتول کی شناخت ایسی پکی ہوگئی کہ کوئی شک نہ رہا۔

''اس کی اخیر اسی طرح ہونی تھی'' ___ مجھ کو اپنے قریب ایک دبی ہوئی آواز سنائی

دی۔

میں نے ادھر دیکھا۔ یہ بات صوبیدار نے کہی تھی۔ میرے پاس نمبردار بھی کھڑا تھا اور ایک معزز آدمی بھی موجود تھا جو درپردہ تھانیداروں کا پیدائشی چمچہ اور مخبر تھا۔

''کیا یہ کوئی بدمعاش تھا؟'' ___ میں نے پوچھا۔

''اصل حرام کی اولاد تھا'' ___ نمبردار نے کہا۔

''اس کے مرنے کا کسی کو غم نہیں ہوگا'' ___ معزز چمچے نے کہا۔

میں نے وہاں زیادہ سوال جواب نہ کیے۔ یہ باتیں تفتیش میں معلوم کرنی تھی کہ کون کیسا ہے اور کیا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مقتول کے لواحقین آ گئے تھے اور دلوں کو ہلا دینے والا ماتم شروع ہو گیا تھا۔ مقتول کا باپ دھاڑیں مارتا ہوا میرے پاس آیا۔

''انسپکٹر صاحب!'' ___ باپ نے روتے ہوئے کہا ___ ''کل صبح تک میرے بیٹے کا قاتل میرے سامنے ہونا چاہیے ورنہ میں آپ کے خلاف اوپر انگریز افسروں تک شکایت پہنچا دوں گا۔ سارا شہر میرے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر حسد سے جلتا تھا''۔

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور اتنا ہی کہا، اللہ کو یہی منظور تھا۔

اب قاعدے قانون کی کارروائیاں کرنی تھیں۔ لاش کے ٹکڑوں کی برآمدگی کے گواہ بنائے۔ ان کے بیان لکھ کر دستخط لئے اور جو دستخط نہیں کر سکتے تھے ان کے انگوٹھے لگوائے اور یہ تمام ٹکڑے نمبردار کے انتظام سے دو بوریوں میں بند کر کے ہسپتال بھجوا دیے۔

مقتول کے باپ اور چند دیگر اشخاص کو ساتھ لیا اور میں قصبے کی طرف چل پڑا۔ مقتول کا باپ غم کا مارا کئی قدم پیچھے آ رہا تھا۔ اسے غم کیوں نہ ہوتا، اس کا جوان بیٹا مارا گیا تھا۔ مقتول کی عمر بیس اکیس سال تھی۔ میں صوبیدار، نمبردار اور معزز آدمی سے مقتول کی بابت پوچھتا گیا۔

انہوں نے مقتول کا جو اخلاق اور کردار بتایا وہ مختصر طور پر یہ تھا کہ وہ امیر زمیندار کا بیٹا تھا اور تین بہنوں میں اکلوتا لڑکا تھا۔ یہ علاقہ بارانی تھا یعنی زراعت کا دارومدار بارشوں پر تھا اور وہاں آبپاشی کے واسطے نہریں نہیں تھیں۔ مقتول کے باپ کی بارانی زمین بہت تھی اور نہری علاقے میں بھی خاصی زمین تھی۔ ایسے زمیندار بڑے امیر زمیندار کہلاتے ہیں۔

مقتول کا نام ساجد تھا اور سب اسے ساجا کہتے تھے۔ باپ کی امیری ساجے کے دماغ کو چڑھ گئی تھی اور ماں باپ نے اس کے دماغ میں یہ بات ڈالی تھی کہ تم شہزادے

ہو اور گھر میں ہی نہیں بلکہ سارے شہر میں تمہاری حکمرانی چلتی ہے۔ اس قسم کے اوچھے امیر زادے بڑھکیں مار کر سمجھتے ہیں کہ ہر کوئی ان سے ڈرتا ہے اور پھر وہ اس وہم میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہر لڑکی ان پر مرتی ہے۔ تیسری خرابی یہ کہ ان کے ذہنوں میں جنسی لذت بھری رہتی ہے اور ان کے ہر قول اور ہر فعل پر جنسیت کا غلبہ ہوتا ہے اور سب سے بڑی خرابی یہ کہ ان کے والدین ان کی اوچھی اور بے حد گھٹیا حرکتوں پر فخر کرتے ہیں اور دوسروں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ان کی تعریفیں کریں۔

مجھ کو زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اس ٹائپ کے شہدے شہزادوں کو بہت اچھی طرح جانتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ چلو ایک آوارہ بدمعاش مارا گیا۔ کوئی کتنا ہی بدکار کیوں نہ ہو، کوئی معمر بھکاری یہ ہو یا کوئی ٹی بی یا کینسر کا مریض ہی ہو جس کی زندگی ایک آدھ دن رہ گئی ہو، اگر کوئی اسے مار ڈالے گا تو قاتل کو پکڑ کر سزا دلانا لازمی ہوگا۔ قانون سب کے واسطے برابر ہوتا ہے۔ میرے دل میں مقتول کے خلاف خواہ کتنی ہی نفرت بھری ہوئی کیوں نہ تھی، مجھ کو تفتیش پوری محنت اور دیانتداری سے کر کے اس کے قاتل کو پکڑنا تھا ورنہ انگریز افسر میری جان کو آ جاتے

میرے بیٹھنے کا انتظام نمبردار کی بیٹھک میں کیا گیا۔ میں نے سب سے پہلے مقتول کے باپ کو بلایا۔

بھنگن کی بیٹی کے ساتھ دوستی

اس باپ سے میں نے سب سے پہلی بات وہی پوچھی جو ایسے موقع پر ہر باپ سے پوچھی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اس کی کسی کے ساتھ خاندانی دشمنی تھی یا مقتول کی ذاتی دشمنی کسی کے ساتھ ہوگی۔ مقتول ساجے کے باپ نے جو جواب دیا اس سے میرا پارہ چڑھ گیا۔

''توبہ کرو جی!'' ___ اس نے گردن اکڑا کر کہا ___ ''کسی نے میرے ساتھ دشمنی رکھ کر اپنا خاندان تباہ کرانا ہے!''

''چوہدری صاحب!'' ___ میں نے غصے کو دباتے ہوئے کہا ___ ''میں جو بات پوچھوں اس کا صحیح اور سیدھا جواب دیں۔ مجھ پر رعب کسنے کی دوبارہ جرأت نہ کرنا، آپ کا خاندان تو کسی دشمن نے تباہ کر دیا ہے۔ آپ کسی کو کیا تباہ کریں گے...... میں نے جو پوچھا تھا

اس کا جواب دیں''۔

وہ ٹھنڈا پڑ گیا اور نرم سے لہجے میں بولا کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں۔

میرا دوسرا سوال اس کے بیٹے کے چال چلن اور اخلاقی حالت کی بابت تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے چال چلن کی تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے اور یہ الفاظ بھی کہے کہ سارا شہر اس کو شریف لڑکا سمجھتا تھا۔

''چوہدری صاحب!'' ___ میں نے کہا ___ ''اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بیٹے کا قاتل پکڑا جائے اور میں اس کو پھانسی کے تختے تک پہنچا دوں تو جھوٹ بولنا چھوڑ دیں۔ میں صرف آپ کا ہی بیان نہیں لوں گا بلکہ کئی اور لوگوں سے یہی سوال کروں گا اور آپ کو پتہ ہونا چاہئے کہ میرے مخبر بھی ہیں جو اس شہر کے بندے بندے کو صرف جانتے ہی نہیں بلکہ اندر سے بھی جانتے ہیں۔ اگر آپ کا بیٹا شریف ہوتا تو اس طرح قتل نہ ہوتا۔ یہ بھی سن لیں کہ آپ مجھ کو اس طرح گمراہ کریں گے تو یہ جرم ہوگا''۔

اس نے سر جھکا لیا اور ذرا دیر بعد سر اٹھایا اور بولا، وہ آخر میرا بیٹا تھا۔ وہ مر گیا ہے، میں اس کے عیب کس زبان سے بیان کروں۔

''نہ کریں'' ___ میں نے کہا ___ ''میں خود معلوم کروں گا۔ آپ صرف یہ بتا دیں کہ آپ تک کبھی ایسی شکایت پہنچی تھی کہ آپ کے بیٹے نے کسی عورت پر دست درازی کی ہے یا کسی کی بہو بیٹی کو چھیڑا ہے؟''

''نہیں!'' ___ اس نے جواب دیا ___ ''مجھ تک ایسی شکایت کبھی نہیں پہنچی''۔

میرے دماغ میں یہ سوچ آئی کہ اس سے اس کے بیٹے کی بابت مزید دریافت کرنا بے کار ہے۔ صرف یہی نہیں، ہر وہ باپ جس کا بیٹا قتل ہو جاتا ہے یہی کہتا ہے کہ اس کا بیٹا بڑا ہی شریف لڑکا تھا۔ میرے پاس اپنے ذرائع موجود تھے جو مجھ کو ہر کسی کی اخلاقی حالت سو فیصد صحیح بتا سکتے تھے۔ میں نے اس سے یہ پوچھا کہ اُس کا بیٹا کب سے گھر سے غائب تھا۔ اس نے جواب دیا تین دنوں سے!

''وہ تین دنوں سے غائب تھا'' ___ میں نے پوچھا ___ ''تو کیا آپ نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں چلا گیا ہے؟''

''نہیں!'' ___ اس نے بڑے تحمل سے جواب دیا ___ ''پتہ لگانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ بتا کر گھر سے نکلا تھا کہ گاؤں کے ایک دوست کے پاس جا رہا ہے اور تین چار

دن اسی کے ساتھ رہے گا''۔

میں نے اس سے اس گاؤں کا نام پوچھا جو اس نے بتا کہ کہا کہ وہاں اس کا بڑا گہرا دوست رہتا ہے۔ کبھی وہ اس کے پاس آ جاتا تھا اور کبھی یہ اس کے پاس چلا جاتا تھا۔ یہ گاؤں قصبے سے کوئی دو میل دور تھا۔ وہ بنجر اور کلری جگہ جہاں سے مقتول کی لاش کے ٹکڑے ملے تھے، قصبے اور گاؤں کے درمیان تھی۔ میں نے اس کے اس دوست کا نام بھی دریافت کر کے لکھا لیا۔ نام ایوب تھا۔

''یہ بتائیں چوہدری صاحب!'' ___ میں نے پوچھا ___ ''کیا آپ تین دن بالکل مطمئن رہے کہ آپ کا بیٹا اپنے دوست کے گاؤں ہی ہوگا؟''

''ہاں جی!'' ___ اس نے جواب دیا ___ ''یہ کوئی پہلی بار تو نہیں تھی کہ بیٹا وہاں گیا تھا، میں نے بتایا ہے کہ دونوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا''۔

میرے سراغ رساں دماغ میں ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا۔ وہ یہ کہ مجھ کو یہ معلوم کرنا تھا کہ مقتول اس گاؤں پہنچا بھی تھا یا نہیں یا وہاں پہنچا تھا اور واپسی پر قتل ہو گیا۔ اس کے باپ نے بتایا تھا کہ مقتول تین دن پہلے گیا تھا۔ میں نے اس کی لاش کے ٹکڑوں پر غور کیا تو خیال آیا کہ یہ اعضاء دو تین دن پہلے کاٹے گئے ہوں گے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ گاؤں کو جاتے ہوئے قتل ہوا۔ مقتول کے باپ کی بابت تو میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اس سے بیٹے کے بارے میں کچھ پوچھنا محض بے کار ہے لیکن میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ بہت ہی غم زدہ تھا اور ہچکیاں اور سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ میں نے اس کو جانے کی اجازت دے دی اور کچھ تسلیاں بھی دیں۔ اس کے جانے کے بعد نمبردار کو اور اس کے بعد اس معزز مخبر کو اپنے پاس بٹھایا جو موقعہ واردات پر میرے ساتھ تھا۔

اب میں نے ان دونوں سے مقتول کے چال چلن اور اخلاق وغیرہ کی بابت تفصیلی رپورٹ لی۔

وہ راستے میں مجھ کو یہی رپورٹ دیتے آئے تھے۔ اب میں نے ان سے مزید باتیں پوچھیں لیکن ان کے پاس کوئی اضافہ نہیں تھا۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ مقتول نے کسی کی بہو بیٹی پر دست درازی یا اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی ہوگی اور اس عورت کے لواحقین نے مقتول سے اس طرح انتقام لیا یا اس کے کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات ہوں گے اور یہ راز کھل جانے پر مقتول قتل ہو گیا۔

دونوں مجھ کو کوئی ٹھوس واقعہ نہ سنا سکے۔ نمبر دار نے کہا کہ مقتول کوئی خوبصورت جوان نہیں تھا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ وہ عورتوں کے پیچھے پھرتا تھا اس سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ وہ اچھے یا باوقار گھروں کی عورتوں کے ساتھ چھیڑ خانی کرتا تھا، ایسی جرأت اس نے کبھی نہیں کی تھی۔ غریب گھرانوں کی لڑکیوں کے پیچھے پھرتا تھا اور ایک بار اس نے محلے کی بھنگن کی نوجوان بیٹی کے ساتھ دوستی کر لی تھی۔

نمبر دار اور معزز آدمی نے بتایا کہ ڈیڑھ پونے دو سال پہلے مقتول نے ایک باوقار خاندان کی لڑکی کے ساتھ گلی سے گزرتے چھیڑ خانی کی تھی۔ لڑکی نے رک کر اس کو گالیاں دیں اور محلے کے آدمی اکٹھے ہو گئے۔ لڑکی کے دو بھائی آ گئے اور انہوں نے مقتول کو بہت مارا پیٹا اس مار پیٹ میں محلے کے تین چار اور لڑکے بھی شامل ہو گئے۔

مقتول کا باپ شکاری بندوق لے کر باہر آ گیا اور سب کو للکارا۔ محلے کے بڑی عمر کے کئی آدمی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مقتول کے باپ کی بہت بے عزتی کی اور کہا کہ وہ یہ بندوق چلا کر دیکھے پھر دیکھے کہ وہ اس کے گھر کا کیا حشر ہوتا ہے۔

اس محلے میں دو رجسٹرڈ بدمعاش بھی رہتے تھے۔ ان کو پتہ چلا تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ اس محلے میں کسی کی بیٹی کو کسی کے بیٹے نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو اس کی آنکھیں نکال دیں گے۔ مختصر بات یہ ہے کہ مقتول اور اس کے باپ کو لوگوں نے اس قدر ذلیل کر دیا کہ تین چار دن باپ بیٹا گھر سے باہر نہ نکلے۔

میں نے پوچھا کہ پھر مقتول کا رویہ کچھ تبدیل نہیں ہوا؟''...... ان دونوں نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ یہ تو پوتڑوں کا بگڑا ہوا لڑکا تھا، اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی سوائے اس کے کہ محلے کی لڑکیاں اس کی نظر بازی اور چھیڑ خانی سے بالکل محفوظ ہو گئیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں اس سے یہ نہ سمجھوں کہ مقتول نے کچھ شریفانہ زندگی شروع کر دی ہو گی، اس نے یہ رویہ قائم رکھا کہ اپنے آپ کو بہت بڑا بدمعاش سمجھتا تھا اور عموماً بڑھکیں مارتا تھا۔

آپ کے محلے یا گاؤں میں ایک دو ایسے شہدے شہزادے اور اپنے آپ کو پنجابی فلموں کا ہیرو سمجھنے والے ضرور ہوں گے اس واسطے میں مقتول کی بابت کوئی مزید بات نہیں کروں گا...... میں نے ان دونوں سے پوچھا کہ مقتول کے کوئی راز دار دوست تو ہوں گے اور کیا وہ مجھ کو ان کے نام پتے دے سکتے ہیں؟ نمبر دار نے دو نام بتائے اور میں نے اس کو

کہا کہ ان دونوں کو فوراً یہاں بلائے۔

دوست کی بہن کی دوستی

سورج غروب ہو چکا تھا۔ نمبر دار دونو جوانوں کو ساتھ لے آیا اور مجھ کو اطلاع دی۔ میرے پاس اس وقت ایک اور مخبر آ گیا تھا اور ایک باہر بیٹھا تھا اور یہ میرے خاص آدمی تھے۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے مخبر نے ایک دو اچھے اشارے دیئے تھے جن میں ایک یہ تھا کہ مقتول گاؤں والے جس دوست کے پاس جایا کرتا تھا اس دوست کی جوان بہن تھی جس کی شادی کو تقریباً دو سال ہو گئے تھے۔ مقتول دراصل اس لڑکی کی خاطر وہاں جاتا تھا۔

جونہی نمبر دار نے مجھ کو اطلاع دی کہ وہ مقتول کے دو دوستوں کو لے آیا ہے تو میں نے مخبر کو باہر بھیج دیا اور نمبر دار سے کہا کہ ایک دوست کو میرے پاس بھیج دے...... بیس بائیس سال عمر کا ایک نوجوان میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اپنے پاؤں پر زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ میں نے اس کو بیٹھنے کو کہا تو وہ کرسی پر اس طرح بیٹھا جیسے گر پڑا ہو۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ وہ ملزم نہیں بلکہ میں اس کی مدد چاہتا ہوں۔

میرے دماغ میں ایک سوچ آئی۔ میں باہر نکلا اور نمبر دار کو ایک طرف کر کے پوچھا کہ مقتول کے ان دونوں دوستوں کی حیثیت اور خاندانی پوزیشن کیا ہے۔ میں ان کے خاندانی سٹیٹس معلوم کرنا چاہتا تھا۔ نمبر دار نے بتایا کہ نہایت معمولی خاندانوں کے لڑکے ہیں۔ آٹھ جماعتیں بھی پاس نہیں کر سکے۔ فارغ اور نکمے پھرتے رہتے ہیں۔ چار پیسے دے کر ان سے کوئی بھی کام کروایا جا سکتا ہے۔ میں جان گیا کہ کس قماش کے لڑکے ہیں۔ مقتول جیسے اوچھے امیرزادے اپنے ساتھ ایسی ہی قماش کے آدمی رکھتے ہیں۔ اس قسم کے دوست خوشامد اور ہاں میں ہاں ملانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ نمبر دار نے بتایا تھا کہ کسی اچھے خاندان کا کوئی لڑکا مقتول کے ساتھ دوستی نہیں رکھتا تھا۔

میں اندر چلا گیا اور اس لڑکے سے مقتول کی بابت پوچھنے لگا۔ میں نے اس کو خبردار کیا کہ وہ کوئی بات چھپا کر نہ رکھے اور ہر بات صحیح اور سچ بتائے...... میں آپ کو خاص طور پر ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ یہ نہ سمجھیں کہ یہ نہایت معمولی خاندان کا لڑکا تھا اس واسطے میں

نے اس پر رعب جھاڑا ہوگا اور ڈرا دھمکا کہ باتیں پوچھی ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مقتول کے ان دوستوں کے ساتھ اور اس حیثیت کے ہر فرد کے ساتھ میرا رویہ بہت ہی زیادہ نرم ہوا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ امیر کبیر خاندانوں کے لوگ اس حیثیت کے آدمیوں اور عورتوں کو اپنے مفاد اور اپنی بداعمالیوں میں استعمال کیا کرتے تھے پھر ان پر اس طرح دھونس جماتے تھے کہ یہ اُن کے راز پردے میں ہی رکھیں اور کبھی پکڑ دھکڑ ہوتی تو اس ہی کو آگے کر دیتے تھے۔ بڑے لوگوں کے ہاں آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔

مقتول کے اس دوست کو شاید یہ امید نہیں تھی کہ میں اس کے ساتھ ایسا دوستانہ سلوک کروں گا۔ اس کے منہ سے تو بات بھی نہیں نکل رہی تھی لیکن میں نے جب ہنستے مسکراتے دوستوں جیسی باتیں کیں تو اس کی زبان رواں ہوگئی۔ میں نے اس کو کہا کہ تم ساجے کے بڑے گہرے دوست تھے۔ میں کچھ اور کہنے ہی لگا تھا کہ وہ بول پڑا۔

''دوستی کہاں کی جی!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''وہ ہمیں ساتھ رکھتا تھا اور ہماری پیٹ پوجا ہو جاتی تھی۔ ہم باتوں میں اس کی گڈی چڑھائے رکھتے تھے''۔

میں نے بتایا ہے کہ مقتول جیسے آدمی اپنے ساتھ اس قماش کے آدمیوں کو رکھتے تھے جو ان کی ہر اوچھی حرکت اور بے معنی بات کی تعریف اور تائید کرتے تھے۔ اکثر شاعر اپنے ساتھ اسی طرح کے دو تین آدمی رکھتے ہیں جن کو شاعری اور شاعروں کی زبان میں مصرعہ اٹھانے والے کہا جاتا ہے۔ ادھر شاعر نے اپنا مصرعہ پورا بھی نہ کیا اور ان آدمیوں نے واہ واہ اور داد و تحسین کا غل غپاڑہ شروع کر دیا۔ وہ شاعر کے ہر مصرعے کو دوہراتے اور اچھل اچھل کر داد دیتے ہیں۔ مقتول کے یہ دونوں دوست بھی ایسے ہی مصرعہ اٹھانے والے تھے۔

میں ان دونوں دوستوں کی پوچھ گچھ تفصیل سے بیان نہیں کروں گا اس واسطے کہ ان سے میرے کام کی صرف ایک بات معلوم ہوئی تھی، میں وہی آپ کو سناؤں گا۔ دونوں سے میں نے باری باری پوچھ گچھ کی اور اچھا خاصا کریدا بھی لیکن دونوں نے مقتول کی اخلاقی حالت وہی بتائی جو میں مخبروں کی زبان سے پہلے سنا چکا ہوں۔ ان دونوں نے تصدیق کی مقتول اپنے آپ کو گلفام سمجھتا تھا اور زیادہ تر اس کا موضوع عورت ہی ہوتا تھا۔

انہوں نے تفتیش کے واسطے جو کارآمد بات بتائی وہ کچھ دیر پہلے میرا ایک مخبر بتا چکا تھا۔ ان دونوں لڑکوں نے مزید تفصیلات بتا دیں۔ وہ یہ تھیں کہ مقتول دو میل دور گاؤں کے جس دوست کو ملنے جایا کرتا تھا اس کی ایک جوان بہن تھی اور اس کی شادی ہو چکی تھی۔

مخبر نے تو اتنا ہی بتایا تھا کہ مقتول اس لڑکی کی خاطر وہاں جاتا تھا، مقتول کے دوستوں نے پورے یقین کے ساتھ بتایا کہ اس لڑکی کے ساتھ مقتول کی ناجائز دوستی تھی اور یہ بھی بتایا کہ اپنے خاوند کے پاس اتنا نہیں رہتی تھی جتنا اپنے ماں باپ کے گھر رہتی تھی۔

دونوں نے یہ بھی بتایا کہ مقتول ان کو اپنے معاشقے سناتا رہتا تھا جن میں اکثر جھوٹ کی آمیزش ہوتی تھی لیکن گاؤں والے دوست کی بہن کی بابت جو بتاتا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔

میں نے ان سے پوچھا کہ اپنے محلے یا شہر کے کسی اور محلے کی کسی عورت کے ساتھ اس کا دوستانہ ہوگا۔ دونوں نے بالکل وہی بات کی جو میں سن چکا تھا۔ وہ کہ مقتول انتہائی گھٹیا اور غریب گھروں کی لڑکیوں کو پھانس لیتا اور روپے پیسے سے ان کے منہ بند رکھتا تھا۔ پھر انہوں نے وہ واقعہ سنایا جس میں مقتول کی پٹائی ہوئی تھی۔

انہوں نے ایک انکشاف اور کیا۔ مقتول ان کو یہ بتا کر گاؤں گیا تھا کہ پہلے دوست کی بہن کے ساتھ ملاقات ہوگی پھر وہ گاؤں پہنچے گا۔ یہ بات سن کر میں نے پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے کہ پہلے اس کی بہن سے ملاقات ہوگی؟ دونوں دوست میرے اس سوال کا کوئی ٹھیک جواب نہ دے سکے۔ ایک نے کہا کہ شاید دوست کی بہن کو مقتول نے پیغام بھیجا ہوگا کہ وہ آرہا ہے اور بہن اس کو راستے میں ملے۔

مزید کریدنے پر یہ معلوم ہو کہ دوست کی بہن کے ساتھ مقتول کی ملاقاتیں عموماً رات کے وقت گاؤں سے باہر ہوتی تھیں۔ لڑکی اتنی دلیر تھی کہ رات کو گھر سے نکل آتی اور وہاں پہنچ جاتی تھی جہاں مقتول اس کو بتاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مقتول کا یہ دوست جس کا نام میں ایوب لکھوں گا، معمولی خاندان کا فرد ہوگا لیکن ان دونوں نے بتایا کہ ایوب کے خاندان کا سٹیٹس مقتول کے خاندان جیسا ہی تھا۔ وہ بھی امیر زمینداروں کا خاندان تھا۔ ایسے خاندانوں کی لڑکیاں بھی دلیر ہی ہوا کرتی ہیں۔ یہ اونچی ذاتوں کے لوگ ہوتے ہیں جن پر کوئی تنقید کرنے کی جرأت ہی نہیں کرتا۔

دو آدمی کلہاڑیوں سے مسلح

مجھ کو کچھ اس طرح نظر آنے لگا جیسے قتل کا باعث ایوب کی بہن ہی ہے۔ ایوب اور اس کی بہن جس کو میں زرینہ لکھوں گا اگر واقعی اونچی ذات کے خاندان کے تھے تو ان کا منہ

مقتول روپے پیسے سے بند نہیں کر سکتا تھا جس طرح وہ غریب لوگوں کے ساتھ کرتا تھا۔

ایوب کو یا زرینہ کے خاوند کو پتہ لگ گیا ہوگا کہ مقتول نے زرینہ کے ساتھ درپردہ دوستی لگائی ہوئی تھی تو ان دونوں میں سے کسی نے مقتول کا کام ہی تمام کر دیا۔ پہلے میں نے یہ سوچا تھا کہ ایوب کو تھانے بلا کو پوچھوں گا کہ مقتول اس کے گھر تک پہنچا بھی تھا یا نہیں لیکن اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس گاؤں کے مخبروں کو پہلے بلا کر پوچھوں گا۔ ان کی رپورٹوں کے مطابق ایوب کی طلبی کروں گا۔

رات بہت گزر گئی تھی۔ تھکن سے برا حال ہو گیا تھا۔ نمبردار نے بڑا پُرتکلف اور مرغن کھانا کھلایا تھا جس سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور دماغ نے پہلے جیسا کام کرنا چھوڑ دیا۔ میں مقتول کے دونوں دوستوں کو فارغ کر کے اپنے گھر کو چلا تو دونوں نے راستہ روک کر میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہنے لگے کہ میں مقتول کے باپ کو یا کسی اور کو یہ پتہ نہ چلنے دوں کہ ہم نے مقتول کی بابت یہ باتیں بتائی تھیں۔

ان دونوں کی یہ درخواست اور پریشانی میرے واسطے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ اونچی ذاتوں اور دولت والے ایسے ہی چھوٹے چھوٹے حاجت مند اور نادار لوگوں کو اپنے گناہوں میں شامل کر کے پکڑے جانے کی صورت میں ان کو ہی آگے کر دیتے تھے۔ میں ایسے لوگوں کا خاص خیال رکھتا تھا۔ ان کو دلی طور پر تسلیاں دے کر رخصت کر دیا اور میں اپنے گھر چلا گیا۔

میں اگلے روز معمول کے وقت سے بہت پہلے تھانے چلا گیا۔ اس گاؤں کے دو خاص آدمیوں کو بلانا تھا۔ ایک کانسٹیبل کو کہا کہ وہ بغیر وردی یعنی اپنے پرائیویٹ کپڑوں میں اس گاؤں جائے اور ان دونوں کو اس طرح تھانے آنے کو کہے کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ ان کو بلانے کے واسطے یہ کانسٹیبل آیا تھا۔ کانسٹیبل میری بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور وہ ان دونوں کو جانتا تھا۔ وہ سائیکل لے کر اسی وقت روانہ ہو گیا۔

اگر لاش سالم ہوتی اور یہ عام قسم کا پوسٹ مارٹم ہوتا تو گزشتہ روز ہی مجھ کو رپورٹ مل جاتی لیکن لاش کئی ٹکڑوں میں کٹی ہوئی تھی جس نے ڈاکٹر کا کام پیچیدہ کر دیا تھا۔ لاش کے ان ٹکڑوں میں جگر نہیں تھا اور دل بھی نہیں تھا۔ دماغ کھوپڑی میں موجود تھا۔ ڈاکٹر نے لکھا کہ موت تیز دھار آلے کے زخموں سے واقعہ ہوئی ہے اور ڈاکٹر نے موت کا اندازاً وقت بھی لکھ دیا۔ یہ وقت رات نو اور دس بجے کے درمیان بنتا تھا اور دنوں کے حساب سے

دن وہی بنتا تھا جو مقتول کے باپ نے بتایا تھا۔

ایوب کے گاؤں کے وہ دو آدمی خاصی دیر بعد آئے جن کو میں نے بلایا تھا۔ ان کو اکٹھا ہی اپنے پاس بٹھا لیا۔ ان کو قتل کی اس واردات کا علم تھا اور وہ خود ہی میرے پاس آنا چاہتے تھے۔ اس کام کو وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ میں نے ان کو کہا کہ مقتول ان کے گاؤں ایوب نام کے ایک دوست کے پاس جایا کرتا تھا۔ انہوں نے مجھ کو آگے بولنے نہ دیا اور اپنی رپورٹ دینی شروع کر دی۔

انہوں نے تصدیق کر دی کہ ایوب کی بہن کے ساتھ مقتول کا خفیہ دوستانہ تھا۔ یہ بھی کہ خاوند کے ساتھ اس لڑکی زرینہ کی نہیں بنتی تھی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ ان میاں بیوی کی ناچاقی کی وجہ یہی تھی۔ اس خفیہ دوستی کی بابت انہوں نے کچھ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی سنائیں جن سے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ ان میں دوستی تھی۔

میرے دماغ میں ایک بات آ گئی۔ اس قسم کی خفیہ دوستی میں ایک کردار اور آتا ہے جس کا کام پیغام رسانی ہوتا ہے۔ یہ عموماً کوئی عورت ہوتی ہے جو ملاقاتوں کے خفیہ پیغام ادھر اُدھر پہنچاتی اور وقت بتاتی ہے۔ میں نے ان دونوں مخبروں سے پوچھا کہ ایسی کوئی عورت یا کوئی نوکر ہے؟...... دونوں نے بتایا کہ یہ بات ان کو معلوم نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ مقتول اور زرینہ کی دوستی اتنی خفیہ تھی کہ یہ پتہ ہی نہیں لگتا تھا کہ ان کے پیغام کون پہنچاتا ہے۔ مخبروں نے اتنا ہی بتایا کہ ان کے گاؤں میں ایسی ایک عورت ہے جو ہر کام کرتی ہے اور وہ اس قسم کے کاموں میں مشہور بھی ہے لیکن اس قدر چالاک اور ہوشیار ہے کہ اپنا پردہ اٹھنے نہیں دیتی۔ میں نے ان سے اس عورت کا نام وغیرہ پوچھ لیا۔

ان میں سے ایک مخبر نے آخر میں ایک بات سنائی جو اس کو پہلے سنا دینی چاہئے تھی لیکن میں نے ان کے آتے ہی اپنی باتیں پوچھنی شروع کر دی تھیں۔ بات یہ سنائی کہ اس نے زرینہ کے خاوند کو تین چار دن پہلے رات کے وقت جائے واردات کی طرف سے گاؤں کی طرف آتے دیکھا تھا۔ وقت رات نو بجے کے لگ بھگ تھا خاوند کے پاس کلہاڑی تھی اور اس کے ساتھ ایک آدمی تھا۔ اس آدمی کے پاس بھی کلہاڑی تھی۔

کلہاڑی کی بابت ایک بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ صوبہ سرحد کے قبائلی علاقے کے پٹھان اب تو بہت بدل گئے ہیں، انگریزوں کے زمانے میں اور کچھ عرصہ بعد تک قبائلیوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ کوئی مرد رائفل یا بندوق کے بغیر باہر نہیں نکلتا تھا۔ رائفل

اور بندوق یا پستول کو وہ اپنے لباس کا حصہ سمجھتے تھے۔ اسی طرح پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں لوگ کلہاڑی یا لاٹھی کے بغیر اپنے آپ کو نامکمل سمجھتے تھے۔ کلہاڑی کا دستہ بڑا ہی خوبصورت اور رنگ دار ہوتا تھا اور اس کا پھل یعنی بلیڈ چمکا کر رکھا جاتا تھا۔ ایسے ہی لاٹھی بھی بڑی خوبصورت ہوتی تھی۔ اس وقت کسی کی بابت یہ کہنا کہ وہ جائے واردات کی طرف سے آرہا تھا یا ادھر جارہا تھا اور اس کے پاس کلہاڑی تھی تو اس کو مشتبہ نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ اس وقت تو جو بھی اِدھر اُدھر آتا جاتا تھا وہ کلہاڑی یا لاٹھی سے ضرور مسلح ہوتا تھا۔

زرینہ کے خاوند کے خلاف یہ شک کیا جاسکتا تھا کہ قاتل یہی ہے اس واسطے کہ قتل کی وجہ موجود تھی۔ اس کے ساتھ جو دوسرا آدمی تھا اس کی بابت میں نے معلوم کیا تو مخبر نے بتایا کہ لڑائی مارکٹائی کا شوقین ہے اور ڈیڑھ دو سال پہلے ایک لڑائی میں اس نے ایک آدمی کو اتنا زیادہ زخمی کر دیا تھا کہ اس کے بچنے کی امید نہیں رہی تھی۔ یہ شخص پکڑا گیا لیکن بری ہو گیا۔ ویسے بھی وہ مشکوک چال چلن کا آدمی تھا اور خطرناک حد تک دلیر۔

میں نے پوچھا کہ اس میں اتنی جرأت ہے کہ اس نے زرینہ کے خاوند کے ساتھ مل کر ساجے کو قتل کر دیا ہے؟...... مجھ کو جواب ملا کہ اس میں اس سے بھی زیادہ جرأت ہے اور زرینہ کے خاوند کے ساتھ اس کی دوستی بہت ہی گہری ہے۔ اتنی گہری کہ وہ ایک دوسرے کے واسطے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں۔

ان دونوں کو میں نے رخصت کر دیا اور ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ ایوب کو بلا لائے۔ مجھ کو خیال آگیا کہ ایوب شاید مقتول کے گھر ہی ہو۔ مجھ کو یہ پتہ لگا تھا کہ جنازہ دیر سے ہوگا۔ ایوب اس کا بڑا گہرا یار تھا، اس کو مقتول کے گھر ہی ہونا چاہئے تھا۔ کانسٹیبل کو میں نے کہا کہ پہلے وہ مقتول کے گھر جائے اگر ایوب وہاں نہ ہو تو اس کے گاؤں جا کر ساتھ لے آئے۔

ناجائز مراسم اور خاوند

ایوب مقتول کے گھر میں مل گیا اور کانسٹیبل اس کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ مقتول اس کے گھر جارہا تھا، کیا وہ اس کے ہاں پہنچا تھا؟

''نہیں جی!'' ___ اس نے جواب دیا ___ ''وہ میرے پاس نہیں آیا تھا۔ اس کے گھر والے بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ بتا کر گیا تھا کہ وہ میرے پاس آرہا ہے اور تین چار دن

وہیں ٹھہرے گا۔ ایسی تو کوئی بات نہیں کہ وہ مجھ کو اطلاع دے کر ہی آتا، وہ بغیر اطلاع ہی آیا کرتا تھا لیکن اب وہ میرے پاس نہیں آیا''۔

''وہ تمہارا بہت ہی گہرا دوست تھا'' ___ میں نے کہا ___ ''تمہیں ضرور معلوم ہوگا کہ اس کی کسی کے ساتھ اتنی زیادہ دشمنی تھی کہ وہ مارا گیا''۔

''نہیں جی!'' ___ اس نے جواب دیا ___ ''اس کی کوئی ایسی دشمنی نہیں تھی جس سے ساجے کو جان کا خطرہ ہوتا۔ کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ مجھ کو ضرور بتاتا۔ اس کا کسی کے ساتھ زبانی کلامی جھگڑا ہو جاتا تو بھی مجھ کو ضرور بتاتا تھا''۔

میں اس کو مقتول کی اخلاقی حالت کی طرف لایا اور اس بابت اس سے کچھ سوال پوچھے۔ چونکہ ایوب مقتول کا دوست تھا اس واسطے مجھ کو یہ خیال تھا کہ وہ مقتول کے اخلاق کی تعریف کرے گا لیکن اس نے پردہ ڈالنے کی ذرا سی بھی کوشش نہیں کی بلکہ مقتول کی بابت مجھ کو جو کچھ پہلے بتایا گیا تھا وہی باتیں ایوب نے بھی بتا دیں۔ البتہ یہ کہا کہ وہ مقتول کی یہ حرکتیں پسند نہیں کرتا تھا اس واسطے اس کے پیچھے پڑا رہتا تھا کہ ان سفلی حرکتوں سے باز آجائے۔ ایوب نے یہ بھی کہا کہ مقتول نے اپنی ان حرکتوں پر بہت حد تک قابو پا لیا تھا۔

میں نے ایوب کے ساتھ باتیں کچھ اس طرح شروع کر دیں جیسے دو دوست گپ شپ لگاتے ہیں اور میں نے کچھ اس طرح ظاہر کیا جیسے مجھ کو ایوب کے معاملات میں بہت دلچسپی ہے اور مجھ کو مقتول کے قتل کا بہت ہی افسوس ہے۔ باتوں کا رخ پھیرتے پھیرتے میں ایوب کی بہن زرینہ تک آگیا۔

''ایوب یار!'' ___ میں نے اپنائیت کے لہجے میں کہا ___ ''سنا ہے تمہاری بہن کا خاوند بڑا امیر آدمی ہے اور وہ تمہاری بہن کو ٹھیک طرح بساتا نہیں۔ یہ کیا معاملہ ہے؟''

ایوب نے اپنے بہنوئی کے خلاف بولنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنی بہن کو شریف اور مظلوم ثابت کیا۔

''وہ کچھ تو بتاتا ہوگا'' ___ میں نے کہا ___ ''تمہاری بہن پر کوئی الزام لگاتا ہوگا یا بدچلنی کا شبہ کرتا ہوگا''۔

''پاگل ہے کم بخت!'' ___ ایوب نے کہا ___ ''چال چلن اس کا اپنا ٹھیک نہیں، میری بہن پر وہ کیا شبہ کرے گا؟...... یہ ہماری بہن کی نیک نیتی ہے کہ پھر بھی نبھاہ کر رہی ہے۔ اگر وہ اپنی اس عادت سے باز نہ آیا تو میں اپنی بہن کو گھر بٹھا لوں گا اور اس سے طلاق

لکھوالوں گا‘‘۔

میں نے بہت کوشش کی کہ اس کے منہ سے کوئی اپنے کام کی بات نکلوا سکوں لیکن میں ناکام رہا یا یہ بات تھی کہ اس کے ذہن میں بتانے والی کوئی خاص بات تھی ہی نہیں۔ اس سے آپ نہ سمجھیں کہ میں نے اس کی ہر بات پر اعتبار کر لیا تھا اور اس کے خلاف میرے دل میں جو شبہ تھا وہ صاف کر دیا تھا۔ شبہ بدستور قائم تھا اس واسطے اس کو میں نے جانے کی اجازت نہیں دی اور تھانے میں پابند کر لیا۔ میں کچھ شہادت اکٹھی کر کے اس کو شامل تفتیش کرنا چاہتا تھا۔

اس شام میں نے زرینہ کے خاوند اور اس کے اس ساتھی کو تھانے بلایا جس کو ایک رات میرے مخبر نے جائے واردات کی طرف سے گاؤں کی طرف آتے دیکھا تھا۔ ان کو میں نے اکٹھے نہیں بلایا بلکہ اس طرح کیا کہ دو کانسٹیبلوں کو تھوڑا وقفہ ڈال کر بھیجا کہ ایک زرینہ کے خاوند کو لے آئے اور دوسرا کچھ دیر بعد اس کے ساتھی کو لے آئے اور دونوں کو اس طرح لایا جائے کہ ان کو ایک دوسرے کا پتہ نہ لگے۔ پہلے زرینہ کے خاوند کو جس کو میں عابد لکھوں گا، اپنے پاس بٹھایا اور کچھ رسمی سی باتیں کیں اور کچھ باتیں پوچھیں اور جب یہ میرے ساتھ ذرا کھل گیا تو میں آہستہ آہستہ سنجیدہ ہوتا گیا اور اپنے کام کی باتوں پر آ گیا۔

’’میری ایک بات سن لو عابد!‘‘ ___ میں نے کہا ___ ’’مجھے پریشان نہ کرو اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں پریشان نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے تمہیں ویسے ہی نہیں بلا لیا۔ تمہاری بابت اور تمہاری بیوی کی بابت ساری خفیہ باتیں معلوم کر کے تمہیں بلایا ہے۔ سچ بولو اور اس کا صلہ مجھ سے لو۔ تم اس بات کو چھپا نہیں سکتے کہ تمہاری بیوی کے ناجائز مراسم مقتول ساجے کے ساتھ تھے۔ بولو، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟‘‘۔

اس نے پہلے مجھ کو دیکھا اور نظریں میرے منہ پر لگائے رکھیں پھر سر جھکا لیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری بات کی تردید نہیں کر رہا۔ ذرا دیر بعد میں نے اس کو کہا کہ اس نے ابھی تک میری بات کا جواب نہیں دیا۔ تب اس نے سر ہلا کر کہا کہ میں ٹھیک کہتا ہوں۔

’’شاباش!‘‘ ___ میں نے بڑے پیار سے کہا ___ ’’اسی طرح سچ بولتے جاؤ اور دیکھو میں تمہارے ساتھ کیسی نیکی کرتا ہوں...... کیا یہ صحیح ہے کہ تمہاری بیوی تمہارے پاس اتنا نہیں رہتی تھی جتنا وہ اپنے ماں باپ کے گھر رہتی تھی؟‘‘

’’یہ ٹھیک ہے جناب!‘‘ ___ اس نے جواب دیا ___ ’’تم اپنی بیوی کی بابت یہ

بات جانتے تھے‘‘ ___ میں نے کہا ___ ’’تم نے بیوی کو طلاق کیوں نہ دے دی؟‘‘

’’سچی بات بتاتا ہوں جناب!‘‘ ___ عابد نے جواب دیا ___ ’’میں اپنی بیوی کے خاندان کے مقابلے میں کچھ کمزور ہوں۔ وہ لوگ میری چلنے ہی نہیں دیتے۔ میں نے بیوی کو ڈرایا دھمکایا بھی تھا اور منت ساجت بھی کی کہ وہ اپنے اور میرے خاندان کی عزت کا خیال رکھے لیکن جناب! اتنی ڈھیٹ لڑکی ہے کہ اس پر کچھ اثر نہیں ہوا‘‘۔

میں نے اس کو وہ رات یاد دلائی جب وہ اپنے ساتھی کے ساتھ رات کو گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ اس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آ رہا تھا۔ میں نے حساب کر لیا تھا۔ یہ وہی رات تھی جس رات مقتول قتل ہوا تھا۔

وہ یک لخت جیسے بدک کر بیدار ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھیں اور زیادہ کھل گئیں۔ اس نے ایک گاؤں کا نام لیا اور کہا کہ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ اس گاؤں گیا تھا۔ وجہ یہ بتائی کہ وہاں ایک آدمی کے ہاتھ اس نے بھینس بیچی تھی اور کچھ رقم ابھی اُس سے لینی تھی۔ وہ یہ رقم لینے گیا تھا۔ اس نے جس گاؤں کا نام لیا وہ گاؤں قصبے کی دوسری طرف تھا اور اس کے گاؤں اور اس گاؤں میں چار میل سے کچھ زیادہ فاصلہ تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے اپنے گاؤں سے چلا تھا۔

’’نہیں عابد!‘‘ ___ میں نے کہا ___ ’’تم اپنا وعدہ پورا نہیں کر رہے تو میں اپنا وعدہ پورا نہیں کروں گا۔ میں کسی شہادت کی بنیاد پر بات کر رہا ہوں...... تمہیں کس طرح پتہ چلا تھا کہ مقتول تمہارے گاؤں کو آ رہا ہے؟‘‘

’’مجھ کو پتہ ہی کیسے چل سکتا تھا جناب!‘‘ ___ اس نے جھنجھلا کر کہا ___ ’’میرے پاس کوئی ایسا جاسوس نہیں جو مجھ کو مقتول کی منٹ منٹ کی خبر دیتا رہا ہو۔ ویسے میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ وہ قتل نہ ہو جاتا تو کبھی میرے ہی ہاتھ سے قتل ہوتا اور میری بیوی بھی میرے ہاتھ سے قتل ہو جاتی۔ میرے پاس یہی ایک علاج رہ گیا تھا‘‘۔

میں نے اب ایک مخصوص انداز سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس سے مشتبہ یا ملزم تھوڑی سی دیر میں سخت پریشان ہو جاتا ہے اور گھبراہٹ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اس کو یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ ایک سوال کا پہلے کیا جواب دے چکا ہے۔ دوسرا طریقہ ایذا رسانی کا ہوتا ہے جس کو تھرڈ ڈگری کہتے ہیں لیکن میں یہ طریقہ اس وقت اختیار کیا کرتا تھا جب مشتبہ کے خلاف شک یقین میں بدل جاتا تھا اور شہادت مضبوط اور کافی ہوتی تھی۔ یہاں معاملہ

ابھی کچا تھا اس واسطے میں ابھی اس کو دوسرے طریقے سے جال میں لانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ جال میں آتا نظر نہیں آتا تھا۔ مجھ کو اس پر بڑا ہی پکا شک تھا۔ اس کو میں نے اتنی جلدی چھوڑنا نہیں تھا۔ میں نے تو شک رفع کر کے چھوڑنا تھا یا شک پختہ کر کے حراست میں لے لینا تھا لیکن اس نے اپنی صفائی میں جو باتیں بتائی تھیں وہ ابھی قابل غور تھیں۔ میں نے اس کے گھر کے افراد سے اور پھر اس شخص سے جس نے اس سے بھینس خریدی تھی، تصدیق کرانی تھی کہ یہ واقعی پیسے لینے گیا تھا اور واپس آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھ کو یہ شبہ بھی تھا کہ یہ اس گاؤں سے پیسے لے کر آ رہا تھا تو اس نے مقتول کو اپنے گاؤں کی طرف جاتا دیکھا اور اپنے ساتھی کی مدد سے اس کو قتل کیا اور پھر لاش کے ٹکڑے مختلف جگہوں پر دبا دیئے۔ دونوں کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔

اس کو میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر کے کہا کہ اس کو تھانے میں ہی بٹھا رکھنا ہے۔

اپنی مرغی پڑوسیوں کے گھر جا کر انڈے دے تو......

عابد کے ساتھی کو اندر بلایا اور بٹھا لیا۔ میری یادداشتوں میں اس کا جو اصل نام ہے اس کی بجائے میں اس کا نام ریاض لکھوں گا۔ یہ مشکوک ہسٹری والا آدمی تھا اس واسطے اس کے ساتھ میں نے رویہ سخت اور دھمکیوں والا اختیار کیا۔

''غور سے سن لو ریاض!'' ___ میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا ___ ''تمہارا مقدمہ تھانے کے ریکارڈ پر ہے۔ بے شک تم بری ہو گئے تھے لیکن تم نے جرم کیا تھا۔ تمہاری بہت ہی بری رپورٹیں آتی رہی ہیں جو یہاں لکھی ہوئی ہیں۔ اگر میرے ساتھ سی بھی ہیرا پھیری کرو گے تو میں یہ سارا ریکارڈ سامنے لے آؤں گا اور تمہیں پھانسی سے نہیں بچا سکے گا۔ سچ بولو گے تو میں تمہیں بچاؤں گا''۔

میں نے اس کو یہ جو بات کہی تھی یہ بالکل غلط تھی۔ تھانے میں اس کی کوئی رپورٹ نہیں آئی تھی اور جو مقدمہ تھا اس میں وہ بری ہو گیا تھا لیکن اس کو میری بات پر یقین اور اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ میں نے اس سے سوال جواب شروع کر دیئے۔ یہ بڑا لمبا ہے، میں مختصر بیان کروں گا۔

اس نے تسلیم کیا کہ وہ عابد کے ساتھ دوسرے گاؤں گیا تھا اور وہ پیسے لینے گئے تھے۔ اس نے جب محسوس کیا کہ میں اس پر قتل کا شبہ کر رہا ہوں تو اس نے بڑا اچھا جواب دیا۔

''میری یہ بات پورے غور سے سنیں جناب!'' ___ اس نے کہا ___ ''مقتول جس جگہ قتل ہوا ہے وہ جگہ ہمارے راستے میں آتی ہی نہیں تھی۔ ہم تو اس جگہ سے بہت دور دور گئے اور واپس آئے تھے۔ میں آپ کو وہ راستہ بتاتا ہوں''۔

اس نے میز پر انگلی سے راستہ بنایا اور کہا کہ بعد جب اس کو پتہ لگا کہ ساجا قتل ہو گیا ہے اور اس کی لاش کے ٹکڑے ملے ہیں تو وہ وہاں گیا تھا۔ وہ جگہ تو ان کے راستے سے بہت ہی دور ہے۔

میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ یہ شخص بڑے اعتماد اور بڑی جرأت سے بات کرتا تھا۔ مجھ کو اتنا تجربہ تو ہو ہی چکا تھا کہ دوسرے کے بولنے کے لہجے اور انداز سے میں سمجھ جاتا تھا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ میں نے زرینہ اور مقتول کے تعلقات کی بات شروع کر دی۔ ریاض سے پوچھا کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کہاں تک صحیح ہے۔ اس نے کہا کہ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے یہ نہیں کہ ان دونوں کے آپس میں قابل اعتراض تعلقات تھے۔ پھر میں نے پوچھا کہ عابد کا اس سلسلے میں کیا رویہ اور انداز تھا۔

''جناب! مجھ کو اجازت دیں میں ساری بات سنا دیتا ہوں'' ___ ریاض نے کہا ___ ''عابد اس معاملے میں بہت پریشان تھا۔ میں اتنی سی بات تو سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کو یہ شک ہے کہ ساجے کو عابد اور میں نے قتل کیا ہے۔ ظاہری طور پر بات یہی بنتی ہے لیکن آپ مجھ سے بہت زیادہ عقل والے ہیں۔ غور کریں اور پھر کسی نتیجے پر پہنچیں۔ سچی بات یہ ہے کہ عابد میرے ساتھ اس مسئلے پر بات کرتا رہتا تھا۔ ہم دونوں نے کئی بار سوچا تھا کہ ساجے کو صاف کر دیا جائے لیکن عابد کہتا تھا کہ اپنی مرغی پڑوسیوں کے ہاں جا کر انڈے دے تو یہ پڑوسیوں کا قصور نہیں بلکہ اپنی مرغی کا قصور ہے۔ عابد اپنی مرغی کو ذبح کرنے کی بات کیا کرتا تھا''۔

''عابد بیوی کو طلاق کیوں نہیں دیتا تھا؟'' ___ میں نے پوچھا۔

''ڈرتا تھا'' ___ ریاض نے کہا ___ ''ان کا خاندان ذرا کمزور ہے۔ پھر اس کا باپ شریف آدمی ہے اور وہ وقار کا زیادہ خیال رکھتا ہے۔ عابد کوئی بزدل آدمی نہیں لیکن میں بتا رہا ہوں کہ وہ مقتول کو اتنا قصوروار نہیں سمجھتا تھا جتنا اپنی بیوی کو۔ اگر وہ قتل کا ارادہ کر ہی لیتا تو دونوں کو قتل کرتا اور میں اس کے ساتھ ہوتا۔ ہماری دوستی کچھ ایسی ہی ہے''۔

''زرینہ کے بھائی ایوب کو تو اپنی بہن کا خیال رکھنا چاہئے تھا'' ___ میں نے کہا ___ ''یا یہ بات ہے کہ ساجے نے اس کی آنکھوں پر کوئی پٹی باندھی ہوگی''۔

''ایوب میں غیرت کی کمی ہے'' ___ ریاض نے کہا ___ ''اس کو یہ تو پتہ ہونا چاہئے تھا کہ ساجا کس قماش کا آدمی ہے۔ یہ بھی کوئی حیرانی والی بات نہیں ہوگی کہ ایوب نے ساجے کی کسی بہن کے ساتھ ایسی ہی دوستی لگائی ہوئی ہو۔ میں مان نہیں سکتا کہ ایوب کو اپنی بہن کی یہ دوستی معلوم نہیں تھی۔ ساجا یہاں آتا تھا تو ایوب کی بہن کو سسرال میں پتہ لگتا تو وہ کسی کو بتائے بغیر اپنے گھر پہنچ جاتی اور جتنی دیر ساجا یہاں رہتا وہ اپنے گھر ہی رہتی تھی''۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سب کچھ جانتے ہو'' ___ میں نے کہا ___ ''تمہیں یہ بھی پتہ ہوگا کہ یہ چوری چھپے ملتے کہاں تھے۔

''آپ خود سیانے ہیں'' ___ ریاض نے کہا ___ ''ان کی ملاقاتیں گھر میں تو نہیں ہوتی ہوں گی۔ اگر مجھ کو یا عابد کو پتہ لگ جاتا کہ زرینہ فلاں جگہ ساجے سے ملنے گئی ہوئی ہے تو خدا کی قسم، ہم دونوں کو وہیں رکھتے لیکن جو کام ہم نے کرنا تھا وہ کوئی اور کر گیا''۔

''تم مجھ سے زیادہ سیانے ہو ریاض!'' ___ میں نے کہا ___ ''تم جانتے ہو کہ اس طرح خفیہ ملاقاتیں گاؤں کی کوئی عورت کروایا کرتی ہے۔ کیا اس گاؤں میں کوئی ایسی عورت ہے جس پر تم نے اور عابد نے کبھی شک کیا ہو؟''

''جی، ایسی عورت ہے'' ___ ریاض نے کہا ___ ''لیکن اس کی بابت ہمیں یقین نہیں۔ چار پانچ مہینے پہلے اس پر شک ہوا تھا تو میں نے اور عابد نے اس کو بلا کر کمرے میں بند کیا اور خوب چھینٹی لگائی اور پوچھا لیکن وہ نہیں مانی۔ وہ انکار کرتی تھی کہ اس نے ایسا کام کبھی نہیں کیا۔ مجھ کو اسی پر شک ہے''۔

ریاض نے اسی عورت کا نام لیا جس کی بابت اس گاؤں کا ایک مخبر مجھ کو بتا چکا تھا۔ گاؤں کے ایک غریب سے کسان کی بیوی تھی۔ یہ کسان اکثر بیمار رہتا تھا۔ اس عورت نے خفیہ پیغام رسانی کو اپنی روزی کا ذریعہ بنایا ہوا تھا...... میرے دماغ میں یہ سوچ آئی کہ ریاض کو بھی تھانے میں پابند کر دوں اور ایوب کی بہن کو اور پھر اس عورت کو بلواؤں گا۔

ایوب سے میں نے بے شمار باتیں کی تھیں اور اس کی سنی تھیں اور لمبی چوڑی پوچھ گچھ بھی کی تھی۔ اس نے مجھ کو متاثر تو کر لیا تھا اور میرے دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ یہ قاتل نہیں لیکن کسی پر اس کی باتوں سے اعتبار کر لینا بڑے نقصان والی بات ہوتی ہے۔ میں

ریاض کو عابد کی طرح تھانے میں الگ تھلگ پابند کر لیا اور اسی وقت ہیڈ کانسٹیبل کو گاؤں بھیجا کہ وہ زرینہ کو ساتھ لے آئے۔

اس کے آتے آتے شام ہوگئی۔ اس کا باپ بھی ساتھ تھا۔ ایوب کو میں نے پہلے ہی تھانے میں پابند رکھا ہوا تھا۔ میں زرینہ کے باپ کو تسلی دلاسا دیا اور کہا کہ تفتیش کے واسطے زرینہ کو بلایا ہے اور وہ اطمینان سے باہر بیٹھا رہے۔ میں نے زرینہ کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

یہ جس علاقے کی واردات ہے اس علاقے کی بابت میں نے پہلے ایک بات نہیں بتائی، وہ اب بتاتا ہوں۔ اس علاقے کے لوگ پٹھانوں کی طرح اپنے آپ کو غیرت مند سمجھتے تھے۔ ذرا سے شک پر کسی کو قتل کر دینا ان کے واسطے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ خاندانی دشمنیاں، قتل اور انتقامی قتل اور نعرے لگاتے ہوئے پھانسی چڑھ جانا ان لوگوں کا رواج تھا۔ مقدمے لڑتے تھے اور زمین ہندو ساہوکاروں کے پاس گروی رکھ کر قرضے لیتے اور مقدموں پر خرچ کرتے تھے پھر باقی عمر سود ہی ادا کرتے رہتے تھے۔ قتل کو یہ بالکل معمولی سی بات سمجھتے تھے۔ اب تو اس علاقے کی آبادی باہر کے ملکوں میں بسلسلہ روزگار چلی گئی ہے جس کا اثر یہ ہوا ہے کہ اس علاقے کا کلچر بالکل ہی بدل گیا ہے۔

دو دوست ___ بہنوں کا تبادلہ

اب زرینہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کوئی ایسی خوبصورت لڑکی نہیں تھی کہ کوئی اس پر مر ہی مٹتا لیکن شکل و صورت ایسی بری بھی نہیں تھی قبول صورت کہہ لیں، البتہ نوجوان تھی۔ میں نے اس وقت جو تفتیش کی تھی اور مخبروں سے جو رپورٹیں لی تھیں ان سے میرے دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ قتل کا باعث یہی لڑکی ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ قاتل اس کا خاوند ہے یا بھائی۔ میں نے بہتر یہ سمجھا کہ اس کے ساتھ سیدھی بات کی جائے اور اس کو دباؤ میں رکھا جائے۔ میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ دباؤ میں کس طرح رکھا جاتا ہے اور سیدھی بات کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ یہ تفتیش کے مختلف طریقے ہوتے ہیں جو تفتیش کرنے والا افسر صحیح طرح استعمال کرے تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

میں نے زرینہ کو قتل کی رات یاد دلائی اور پوچھا کہ اس شام اس کا خاوند اپنے دوست ریاض کے ساتھ کہیں گیا تھا۔ وہ بتائے کہ یہ دونوں کہاں گئے تھے...... زرینہ نے

بتایا کہ اس رات میں اپنے ماں باپ کے گھر میں تھی اس واسطے اس کو کچھ پتہ نہیں کہ اس کا خاوند گھر تھا یا کہیں گیا تھا۔

''دیکھو زرینہ!''____ میں نے کہا____ ''یہ سوچ لو کہ یہ تھانہ ہے اور تم عورت ذات ہو۔ یہاں جھوٹ بول کر مجھ کو چکر دو گی تو تمہیں ایسے چکر دیئے جائیں گے کہ اپنی اور اپنے پیدا کرنے والوں کی ہوش کھو بیٹھو گی۔ مجھ سے عزت کروانی ہے تو سچ بولنا...... تمہیں خاوند ساجے سے ملنے سے منع کرتا رہتا تھا۔ کیوں منع کرتا تھا؟''

''وہی آدمی ہے''____ زرینہ نے جواب دیا____ ''ساجا میرے بھائی کا دوست تھا اس واسطے ہمارے گھر آتا رہتا تھا۔ میرا خاوند شک کرتا تھا کہ میں اس کو کہیں ملتی ہوں''

''یہ تم نے پہلا جھوٹ بولا ہے''____ میں نے کہا____ ''تم پر میری بات کا کچھ اثر نہیں ہو...... یہ بالکل صحیح ہے کہ ساجے کے ساتھ تمہاری خفیہ دوستی تھی۔ کیا یہ اچھا ہوگا کہ چار بندے یہاں آکر تمہارے منہ پر کہیں؟''

ظاہری طور پر وہ ڈھیٹ بنی ہوئی تھی اور انکار ہی کرتی جارہی تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس میں دلیری اور جرأت موجود تھی لیکن میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس کا انکار بالکل جھوٹا ہے۔ یہ تجربے کی بات ہوتی ہے۔ اگر وہ سچی ہوتی اور میں اس پر یہ بیہودہ الزام لگاتا تو وہ اچھل اچھل کر انکار کرتی اور کہتی کہ جو کوئی مجھ پر یہ الزام لگاتا ہے اس کو میرے سامنے لائیں۔ مختصر یہ کہ اس کا انکار ڈھیلا ڈھیلا سا تھا۔ میں نے ہوا میں تیر چلایا۔

''تم چاہتی ہو کہ میں حسو کو یہاں بلا لوں''____ میں نے کہا____ ''میں اس عورت کو اس واسطے نہیں بلانا چاہتا کہ وہ بہت چھوٹی ذات کی غریب عورت ہے اور تم اونچی ذات اور امیر گھرانے کی لڑکی ہو۔ اس سے تمہاری بہت بے عزتی ہوگی۔ بہتر ہے اپنی زبان سے مان لو''۔

حسو وہ عورت تھی جس کے بارے میں اس گاؤں کے مخبر نے مجھ کو بتایا تھا اور ریاض نے بھی کہ یہ خفیہ پیغام رسانی کرتی اور خفیہ ملاقاتیں کراتی ہے۔ میں نے جب اس کا نام لیا تو زرینہ فوراً مان تو نہ گئی لیکن اس کے چہرے پر جو تبدیلی دیکھی اس سے میں جان گیا کہ اس کا حسو کے ساتھ رابطہ ہے۔ میں نے زرینہ کو یہ بھی کہا کہ مقتول کے ساتھ اگر اس کی درپردہ دوستی تھی تو یہ کوئی جرم نہیں، میں تو ساجے کے قاتل کو پکڑنے کے واسطے اشارے اور سراغ تلاش کر رہا ہوں۔ پھر اس کو یہ بھی کہا کہ قاتل پکڑا گیا تو عدالت میں یہ بات آئے گی یہ نہیں مقتول کے جائز و ناجائز تعلقات کس کس کے ساتھ تھے۔

زرینہ کا سر جھک گیا تھا اور یہ بالکل ہی چپ ہو گئی۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ اس کا انکار ختم ہو چکا تھا لیکن اقرار کرتے ڈرتی اور شرماتی تھی۔ میں کوئی فرشتہ نہیں تھا، ہر تھانے دار کو یہ تجربہ ہوتا ہے کہ مشتبہ کے انداز یا ذرا سی ایک حرکت سے جان لیتا ہے کہ اب یہ اقبال جرم کے موڈ میں آگیا ہے لیکن جھجک رہا ہے اور اس کو تھوڑی سی حوصلہ افزائی چاہئے۔

میں نے زرینہ کی حوصلہ افزائی اپنی زبان کا جادو چلا کر کی اور کچھ جذباتی باتیں بھی کیں اور اب زرینہ نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے سر اوپر نیچے ہلا کر اقرار کر لیا کہ مقتول کے ساتھ اس کے تعلقات تھے۔ میں نے ہمدردانہ رویہ اختیار کر لیا اور کہا کہ اب وہ مجھ کو ایسا راستہ دکھائے کہ میں قاتل کو پکڑ کر پھانسی دلاؤں۔ میں نے اس کے ساتھ اس اعتراف کروانے کے واسطے جو جذباتی باتیں کی تھیں وہ دراصل فلمی مکالمے تھے۔ میں بطور نمونہ ایک مکالمہ پیش کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں قاتل کو ترسا تڑپا کر ماروں گا، وہ ایک انسان کا نہیں بلکہ تمہارے پیار کا قاتل ہے۔ بہرحال حسو کا نام کام کر گیا تھا۔ میں نے تو تکا چلایا تھا لیکن یہ تیر نکلا اور ٹھیک نشانے پر جا لگا۔

اب میں نے زرینہ سے پوچھا کہ وہ مجھ کو ٹھیک ٹھیک بتائے کہ قاتل اس کا بھائی ایوب ہے یا اس کا خاوند۔

''میں یہ نہیں بتا سکتی''____ زرینہ نے کہا____ ''یہ نہ سمجھیں کہ مجھ کو اپنے بھائی پر شک ہے تو میں اس کو بچانا چاہتی ہوں، ایسی بات نہیں۔ معلوم ہوتا تو میں فوراً بھائی کا نام لے لیتی۔ میرا بھائی ایوب ساجے سے میری دوستی کی پوری پوری قیمت لے رہا تھا۔ اس نے ساجے کی ایک بہن کے ساتھ دوستی لگائی ہوئی تھی۔ اپنے خاوند کی بابت مجھ کو یقین نہیں''۔

''یہی بتا دو''____ میں نے پوچھا____ ''کیا اس رات ساجا تمہارے گھر پہنچا تھا؟''

''نہیں!''____ اس نے جواب دیا____ ''اس نے ہمارے گھر آنا ہی نہیں تھا''۔

''لیکن اس کا باپ تو کچھ اور کہتا ہے''____ میں نے کہا____ ''اس نے مجھ کو بتایا کہ ساجا یہ بتا کر گھر سے نکلا تھا کہ تین چار دن ایوب کے گھر رہے گا''۔

زرینہ کے شاید منہ سے بلا سوچے نکل گیا تھا کہ ساجے نے ان کے گھر آنا ہی نہیں تھا۔ اس سے میں یہی سمجھ سکتا تھا کہ زرینہ کو ساجے کا پروگرام معلوم تھا۔ یہ بات ذہن میں رکھ کر میں نے زرینہ سے سوال جواب کئے تو اس نے اصل بات بتا دی۔

اصل بات یہ تھی کہ اس رات ساجے اور زرینہ کی ملاقات تھی جو حسو کے ذریعے

طے ہوئی تھی۔ ان کے ملنے کی جگہ اس جگہ کے قریب تھی جہاں سے مقتول کی لاش کے ٹکڑے ملے تھے۔ ملاقات کی جگہ زرینہ کے گاؤں کی طرف تھی۔ اس رات چاندنی بہت ہی صاف تھی۔ اتنی صاف کہ کچھ دور سے بھی چیز ٹھیک نظر آتی تھی۔ اس زمانے میں لوگ، خاص کر دیہات کے لوگ، شام کا کھانا کھا کر فوراً سو جایا کرتے تھے۔ زرینہ صحیح وقت تو نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ آٹھ بجے گھر سے نکلی یا ساڑھے آٹھ بجے، بہرحال وہ گھر سے اس وقت نکلی جب سب گہری نیند سو گئے تھے۔

ملاقات کی جگہ پہنچی تو ساجا پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ ان کی یہ ملاقات آدھا گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ رہی اور زرینہ اپنے گاؤں کی طرف تیز تیز چل پڑی۔ اس کو جلدی سے جلدی اپنے گھر پہنچنا تھا اس واسطے کہ پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ وہ ایک گھاٹی چڑھی جو ملاقات والی جگہ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ زرینہ نے مقتول کو دیکھنے کے واسطے رک کر پیچھے دیکھا۔ وہاں سے چہرے نہیں پہچانے جاتے تھے۔ زرینہ کو وہاں اب ایک کی بجائے تین آدمی دکھائی دیئے۔ زرینہ صرف مقتول کو پہچان سکتی تھی اس واسطے کہ ابھی ابھی اس کے پاس سے آئی تھی۔

زرینہ نے مجھ کو سنایا کہ وہ قریب ایک درخت کے پیچھے ہوگئی اور ان تینوں کو دیکھنے لگی۔ انہوں نے قصبے کا رخ کر لیا۔ مقتول دونوں کے درمیان میں تھا۔ آگے بہت بڑی ایک ڈھیری تھی جس کو ٹیکری کہہ لیں۔ تینوں وہاں سے دائیں طرف مڑ گئے اور زرینہ کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ زرینہ ذرا بھی پریشان نہ ہوئی۔ وہ پریشان اس صورت میں ہوتی کہ مقتول کے ساتھ پکڑی جاتی۔ وہ اطمینان سے اپنے گاؤں کی طرف چل پڑی۔

میں نے زرینہ سے پوچھا کہ ان دونوں کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں؟ زرینہ کوئی ٹھیک جواب نہ دے سکی۔ اس نے ایک تو توجہ نہ دی اور دوسری یہ بات تھی کہ چاندنی میں اتنی دور سے ایسی باریکیاں نظر نہیں آ سکتی تھیں۔

میں نے اس سے ایوب کی بابت پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ایوب کو وہ گھر سوتا چھوڑ گئی تھی اور جب واپس آئی تو ایوب سویا ہوا تھا...... میں نے زرینہ سے اور بھی بہت سی باتیں پوچھیں۔ وہ تفصیل سے بتاتی رہی لیکن میرا مسئلہ جہاں تھا وہیں رہا۔

میں نے آخر اس کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔ باقی سب کو جن کو میں نے تھانے میں پابند رکھا ہوا تھا، تھانے میں ہی رہنے دیا اور گھر چلا گیا۔ آدھی رات ہونے کو آ گئی تھی۔

میری ذہنی حالت کچھ اور ہی ہو گئی

میں اگلی صبح تھانے گیا تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک کانسٹیبل کو زرینہ کے گاؤ ں کام کے واسطے بھیجا کہ حسنو کو ساتھ لے آئے۔ کانسٹیبل چلا گیا تو میں نے اے ایس آئی لو یہ کام بتایا کہ عابد اور ریاض نے جو بیان دیئے ہیں کہ وہ دوسرے گاؤں بھینس کے بقایا یسے لینے گئے تھے اور ان کا راستہ جائے واردات سے دور تھا، اے ایس آئی دونوں گاؤں ں جائے اور اس بیان کی تصدیق کرے۔ میں نے اے ایس آئی کو دونوں کے بیانات چھی طرح سنا دیئے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کام کس طرح کرنا ہے۔

میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ دو اڑھائی گھنٹے بعد کانسٹیبل حسنو کو ساتھ لے آیا۔ اس عورت کی اب مجھ کو ضرورت نہیں رہی تھی، صرف ایک بات دریافت کرنی تھی۔ زرینہ نے مجھ کو بتا دیا تھا کہ اس کی مقتول کے ساتھ ملاقات کا انتظام حسنو نے کروایا تھا، یعنی یہ پیغام رسانی اس نے کر کے ملاقات کا وقت ایک دوسرے کو بتایا تھا۔ اس سے یرے دماغ میں یہ شبہ آ گیا کہ ہو سکتا ہے حسنو نے زرینہ کے خاوند کو بتا دیا ہو کہ آج رات للاں وقت زرینہ اور مقتول فلاح جگہ اکٹھے ہوں گے۔ خاوند نے اپنے دوست کو ساتھ لے کر جا کر مقتول کو قتل کر دیا۔

مجھ کو یہ سوچ بھی آئی کہ خاوند ان دونوں کو گاؤں سے دور ویرانے میں رات کے وقت اکٹھا دیکھ لیتا تو دونوں کو قتل کر دیتا۔ یہ فوری اشتعال ہوتا ہے جو آدمی کو صحیح معنوں میں پاگل بنا دیا کرتا ہے لیکن دوسری سوچ آ گئی جو یہ تھی کہ زرینہ کے خاوند نے اپنے دوست کو کہا ہوگا کہ زرینہ جب وہاں سے چلی جائے تو ساجے کو قتل کر دیا جائے۔

میں نے حسنو جیسی کئی عورتیں دیکھی تھیں۔ اس عورت سے سچ اگلوانا میرے واسطے مشکل نہیں تھا۔ میں نے دو چار باتیں کر کے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ اس نے دوسری ساری باتیں بتا دیں لیکن یہ بات تسلیم نہ کی کہ اس نے زرینہ کے خاوند کو اس ملاقات کی بابت پہلے بتا دیا تھا۔ میں اس کی وجہ سمجھ گیا۔ حسنو تو ساجے اور زرینہ کو زندہ رکھنا چاہتی تھی کہ ان دونوں نے اس کا باقاعدہ وظیفہ لگایا ہوا تھا اور ان سے اس کو اپنے واسطے اور بچوں کے واسطے کپڑے بھی مل جایا کرتے تھے۔ میں نے حسنو کو جانے کی اجازت دے دی۔

اے ایس آئی اپنے کام پر روانہ ہو گیا تھا وہ شام سے پہلے نہیں آ سکتا تھا، اس نے دوسرے گاؤں بھی جانا تھا۔ مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ دن کے دو بجنے والے تھے۔ بائیس تیئس سال عمر کا ایک نوجوان میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی قمیض خون سے لال ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ کپڑوں سے اور ڈیل ڈول سے اچھے خاندانوں کے آدمی لگتے تھے۔

ایک آدمی اس نوجوان کا باپ تھا اور دوسرا بڑا بھائی تھا۔ اس نوجوان کو میں صدیق لکھوں گا۔ ان کی رپورٹ یہ تھی کہ اس کے ایک دوست نے اس پر چاقو سے حملہ کیا تھا۔ اس کے کندھے پر چاقو لگا اور لوگوں نے چھڑا لیا ورنہ حملہ آور اس کو قتل کر دیتا۔

میں نے اٹھ کر اس کی قمیض اتروائی اور زخم دیکھا جس میں سے خون رس رہا تھا۔ زخم صاف کروایا اور میں نے معائنہ کیا۔ یہ کوئی لمبا اور گہرا زخم نہیں تھا لیکن یہ لوگ قاتلانہ حملے کا پرچہ کروانا چاہتے تھے۔ ایسے زخمی عام طور پر یوں کیا کرتے ہیں کہ سارے کپڑے خون سے لال کر کے تھانے جاتے ہیں تاکہ تھانے دار گھبرا جائے اور زخمی کو بہت ہی شدید زخمی سمجھے۔ دوسرے لوگ تو یہی سمجھ لیتے ہیں لیکن پولیس کی نظر کچھ اور ہوتی ہے۔ پولیس خون سے رنگے ہوئے کپڑوں سے متاثر نہیں ہوا کرتی بلکہ وہ زخم کی پوری پیمائش لکھا کرتی ہے۔

میں نے زخم دیکھ کر سوچا کہ یہ عام قسم کی لڑائی جھگڑے کا کیس ہو گا۔ زخمی کو میں نے ایک کانسٹیبل کے ساتھ فوراً سرکاری ہسپتال بھیج دیا اور حملہ آور کا نام پتہ معلوم کر کے ان کو تھانے طلب کر لیا۔

پہلے حملہ آور تھانے پہنچا۔ میں نے اس کو اندر بٹھا کر پوچھا کہ اس نے اس لڑکے کو چاقو کیوں مارا ہے۔ یہ میں پہلے بتا دوں کہ حملہ آور کی عمر زخمی کی عمر جتنی ہی تھی۔ حملہ آور نے کہا کہ زخمی صدیق اس کی بیوی کو تنگ کرتا تھا اور وہ گلی میں سے گزرتی تو چھیڑ خانی کرتا تھا۔ اس نے صدیق کو منع کیا تو وہ لڑنے پر اتر آیا۔ حملہ آور جس کا میں نام اقبال لکھوں گا، اور زیادہ بھڑک اٹھا اور اس نے چاقو نکال لیا۔ صدیق نے گلی میں پڑی ہوئی ایک اینٹ اٹھالی اور اقبال پر حملہ کرنے لگا تو اقبال نے اس کو چاقو تو مارا لیکن دانستہ کندھے پر مارا تاکہ وہ ڈر جائے۔ اس کا ارادہ قتل کا نہیں تھا۔ اتنے میں دو چار آدمیوں نے ان کے درمیان آ کر لڑائی روک دی۔

میں نے اقبال کو باہر بٹھا دیا اور دل میں یہ طے کر لیا کہ ان کا راضی نامہ کرا دوں گا۔

یہ کوئی ایسا سنگین معاملہ نہیں تھا کہ میں تفتیش کے چکر میں پڑ جاتا اور مقدمہ تیار کرتا۔ اس سے زیادہ شدید زخمی آدمیوں کے بھی صلح سمجھوتے کرا دیئے جاتے تھے۔

زخمی صدیق ہسپتال سے مرہم پٹی کرا کے واپس آ گیا۔ ڈاکٹر نے زخم کی جو تفصیل لکھی تھی اس کے مطابق زخم معمولی تھا۔ میں نے اس کا بیان لیا تو اس نے اقبال کے خلاف بہت باتیں کیں اور کہا کہ وہ اس پر الزام لگاتا ہے کہ وہ اس کی بیوی کے ساتھ چھیڑ خانی کرتا ہے۔ صدیق نے اس الزام کی تردید کی اور کہا وہ گلی میں سے گزر رہا تھا تو اقبال نے اس پر حملہ کر دیا۔

میں نے دیکھا کہ صدیق بہت ہی غصے میں تھا اور میں اس کو صلح سمجھوتے کی نصیحت کرتا تھا تو وہ نہیں مانتا تھا میں نے اور زیادہ باتیں کیں اور پھر صاف کہہ دیا کہ میں یہ مقدمہ نہیں لوں گا اور پھر اس کو یہ بھی کہا کہ گواہوں نے اگر اس کے خلاف بیان دے دیا تو پھر میں اس کو اقبال کے ساتھ ہی گرفتار کر لوں گا اور دونوں کو سزا دلواؤں گا۔

''میں آپ کو راز کی ایک بات بتانا چاہتا ہوں'' ___ صدیق نے کہا ___ ''مجھ کو اجازت دیں کہ میں یہ بات آپ کے آگے رکھ دوں''۔

اس وقت اس کا باپ اور بھائی میرے کمرے میں موجود تھے۔ وہ بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے تھے جن میں زیادہ تر سچی نہیں تھیں۔ ان کے لڑکے کو چاقو لگا تھا اس واسطے وہ اقبال کو بخشنے پر آمادہ نہیں تھے۔ میں نے ان دونوں کو باہر بھیج ک دیا اور صدیق کو کہا کہ وہ راز کی بات بتائے۔ اس نے جب بات منہ سے نکالی تو میری ذہنی حالت کچھ اور ہی ہو گئی۔ اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔

''ساجے کو اقبال نے قتل کیا ہے'' ___ صدیق نے کہا ___ ''میں اس کے ساتھ تھا لیکن میں قتل میں شامل نہیں تھا''۔

خون جو سر چڑھ کر بولا

صدیق نے جو بیان دیا وہ میں یہاں مختصر سناؤں گا، تفصیلی بیان آگے چل کر آئے گا۔ صدیق نے کہا کہ اقبال کے ساتھ اس کی بڑی ہی گہری دوستی ہے۔ اس نے جب اس دوستی کو بیان کیا تو یہ ویسی ہی دوستی سمجھیں جیسی عابد اور ریاض کی تھی جو ایک دوسرے کی خاطر

بڑی سے بڑی قربانی دینے کے واسطے تیار رہتے تھے۔

صدیق نے بتایا کہ اقبال کی شادی بیس بائیس روز پہلے ہوئی ہے۔ اقبال نے صدیق کو ولیمے والے دن الگ کر کے بتایا کہ گذشتہ رات یعنی شادی کی پہلی رات اقبال کی بیوی نے کہا کہ کچھ دن گزرے ساجے نے اس کے ساتھ کھیتوں میں بہت بری طرح دست درازی کی تھی۔ بیوی نے اقبال کو کہا کہ جب تک تم میری بے عزتی کا انتقام نہیں لو گے میں تمہیں اپنے اوپر حرام سمجھوں گی۔ اقبال نے بیوی کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ انتقام لے کر ہی اس کو اپنی بیوی سمجھے گا۔

میں نے پہلے بتایا کہ اس علاقے کے لوگ اپنے آپ کو اتنا زیادہ غیرت مند سمجھتے تھے کہ ذرا سی بات پر خون خرابہ کر ڈالتے اور قتل کو تو معمولی سی واردات سمجھتے تھے۔ اقبال نے جب یہ بات صدیق کو بتائی تو صدیق نے اس سے پوچھا کہ وہ کس طرح انتقام لینا چاہتا ہے۔ اقبال نے کہا کہ وہ موقعہ دیکھ کر ساجے کو قتل کر دے گا۔

صدیق نے بیان میں کہا کہ اس نے اقبال کو منع کیا کہ اتنی شدید اور خطرناک کارروائی نہ کرے ورنہ وہ پھانسی چڑھ جائے گا اور اس کی بیوی اسی نوجوانی میں بیوہ ہو جائے گی۔ اقبال نے صدیق کو بزدلی اور بے وفائی کے طعنے دیئے۔ اقبال چاہتا تھا کہ صدیق اس کا ساتھ دے اور وہ ساجے کو قتل کرے۔

صدیق نے بیان میں کہا کہ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے وہ اقبال کو قتل کے ارادے سے باز رکھنے کی کوششیں تیز کرتا جا رہا تھا۔ ان کی دوستی اتنی گہری تھی کہ صدیق اقبال کے گھر جاتا اور اس کی بیوی بھی ان کے پاس بیٹھ جاتی تھی۔ صدیق نے اقبال کی بیوی کو بھی کہا کہ وہ اقبال کو قتل کے ارادے سے روکے لیکن اقبال نے بیوی کی بات بھی نہ سنی۔

صدیق کے بیان کے مطابق قتل کی رات یوں ہوا کہ اقبال اور وہ شام کے کھانے کے کچھ دیر بعد اکٹھے ہوئے اور ویسے ہی ٹہلتے ٹہلتے پہلے بازار گئے اور وہاں ایک دکان سے دودھ پیا وہاں سے چلتے چلتے گپ شپ لگاتے قصبے سے باہر نکل گئے۔ اقبال اس واسطے سیر سپاٹے کے موڈ میں تھا کہ اس کی بیوی دو تین دنوں کے واسطے اپنے ماں باپ کے گھر گئی ہوئی تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ قصبے کی دوسری طرف جا نکلے جہاں سے کھیت شروع ہوتے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ساجا کھیتوں میں اس طرف جا رہا ہے جس طرف اس کے

دوست ایوب کا گاؤں تھا۔ اقبال نے صدیق کو کہا کہ یہ موقع اچھا ہے، میں گھر سے کلہاڑی لے آتا ہوں اور تم بھی کلہاڑی لے آؤ اور ساجے کے پیچھے جا کر اس کو ختم کر دیتے ہیں۔

صدیق نے اس کو پھر منع کیا لیکن اقبال نے پھر اس کو بزدلی اور بے وفائی کے طعنے دیئے۔ صدیق نے مجھ کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ اس نے اقبال کو کہا کہ وہ کلہاڑی لے آئے، میرے پاس چاقو ہے۔ اقبال دوڑا گیا اور گھر سے کلہاڑی لے آیا اور یہ دونوں ساجے کے پیچھے چلے گئے۔

صدیق نے راستے میں اقبال کو کہا کہ اس کو قتل نہیں کریں گے بلکہ اتنا زیادہ ماریں پیٹیں گے کہ یہ ساری عمر یاد رکھے۔ اقبال کسی حد تک مان گیا کہ چلو ایسا ہی کرتے ہیں۔

صدیق کھیتوں سے بھی آگے اس بنجر علاقے میں چلا گیا جہاں اس کی لاش کے ٹکڑے دبائے گئے تھے۔ اس سے بھی ذرا آگے جا کر ساجا رک گیا۔ یہ دونوں بھی رک گئے اس واسطے کہ یہ محتاط رہنا چاہتے تھے اور یہ بھی دیکھنا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ یہ دونوں ذرا آگے جا کر چھپ گئے اور دیکھتے رہے۔

ایک عورت آئی جو ساجے کے پاس رک گئی اور دونوں ایک ٹیلے کی اوٹ میں چلے گئے۔ اقبال ساجے کو اس عورت کے ساتھ ہی پکڑنا چاہتا تھا لیکن صدیق نے روک دیا کہ یہ عورت ان کے خلاف گواہ بن جائے گی۔ آخر کچھ دیر بعد وہ عورت چلی گئی۔

اب یہ دونوں اٹھے اور ساجے تک پہنچے۔ اس کے ساتھ ویسے ہی کوئی بات کر کے اپنے ساتھ لے آئے۔ صدیق نے بیان میں کہا کہ اس کا پروگرام مار پٹائی کا تھا لیکن اقبال ذرا پیچھے ہو گیا اور ساجے کی گردن پر کلہاڑی کا ایسا بھرپور وار کیا کہ اس کی آدھی گردن کٹ گئی۔

صدیق بہت گھبرایا۔ وہ تو بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن اقبال کی دوستی نے اس کو بھاگنے نہ دیا۔ ساجا گرا تو اقبال نے گردن پر ہی کلہاڑی مار کر اس کا سر الگ کر دیا۔ پھر اقبال نے لاش کے اعضاء کاٹنے شروع کر دیئے۔

اقبال نے کہا کہ یہ ٹکڑے دور دور زمین میں دبانے ہیں۔ صدیق نے اپنے بیان میں کہا کہ اس وقت یوں پتہ چلتا تھا جیسے اقبال وہ اقبال ہی نہیں جو اس کا پیارا دوست تھا بلکہ یہ کوئی وحشی درندہ تھا۔ صدیق نے یہ ٹکڑے زمین میں دبانے میں اقبال کی مدد کی۔ انہوں نے گڑھے کلہاڑی سے کھودے لیکن زیادہ گہرے نہ کھودے اس واسطے کہ اتنا وقت نہیں تھا۔

صدیق نے اپنا بیان ختم کیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ اتنی گہری دوستی میں ایسی

لڑائی کیوں ہوگئی کہ اقبال نے اس کو چاقو مارا ہے؟......صدیق نے کہا کہ اقبال قتل تو کر چکا تھا اور اس نے انتقام لے لیا تھا لیکن اس طرح پتہ لگتا تھا جیسے اس کا دماغ یا ذہن اپنے قابو میں نہیں رہا۔ کسی وقت عجیب اوٹ پٹانگ سی باتیں کرنے لگتا تھا اور کبھی اس طرح جیسے وہ صدیق کو پہچانتا ہی نہیں۔ صدیق اس کے گھر جاتا تھا لیکن اب اقبال نے اس کو اپنے گھر آنے سے منع کر دیا۔ صدیق نے دوستی قائم رکھنی چاہی لیکن اقبال نے دوستی جاری نہ رکھی۔ پھر بھی صدیق اقبال کے ہاں گیا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اقبال گھر نہیں تھا۔ صدیق اس کی بیوی کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر آ گیا۔ اقبال نے اس کو کوئی اور ہی رنگ دے دیا یعنی یہ کہ صدیق اس کی بیوی کے پاس آیا تھا۔ یہ وجہ بنی کہ اقبال نے صدیق پر قاتلانہ حملہ کیا۔

آخر میں صدیق نے کہا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے کہ قاتل کی نشاندہی کر دی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اعانت جرم میں سزا بھگتنے کے لیے تیار ہے...... میں اس کا یہ بیان خاموشی سے سنتا رہا۔ بیان اتنا ہی نہیں تھا جو میں نے یہاں تحریر کیا ہے۔ یہ تو بڑا ہی لمبا بیان تھا جو میں نے پوری توجہ سے سنا اور اس بات پر زیادہ غور کیا کہ یہ شخص اپنے جرم سے کیوں پردہ اٹھا رہا ہے۔ بات یقیناً کچھ اور تھی۔ میں نے اس کو خراج تحسین پیش کیا کہ اس نے اپنا فرض ادا کیا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی بیک گراؤنڈ میں ڈرامہ کچھ اور ہی ہے۔

صدیق کو میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر دیا۔ وہ تو اب حراست میں تھا۔ باقاعدہ گرفتاری اقبال کے بیان کے بعد کرنی تھی۔ اقبال کو بلایا اور کوئی فالتو بات کئے بغیر کہا کہ وہ ساجے کے قتل کا اقبالی بیان دے دے۔ یہ سن کر اس کی حالت ایسی ہوگئی کہ رنگ لاش کی طرح ہوگیا اور اس طرح لگتا تھا کہ یہ بے ہوش ہو جائے گا لیکن سنبھل گیا اور صاف انکار کر دیا۔ میں نے اس کو بتایا کہ اس کا ساتھی پورا بیان دے چکا ہے اور بہتر یہ ہے کہ وہ بیان دے دے ورنہ اس سے دوسرے طریقے سے بیان لے لیا جائے گا۔ پھر بھی وہ انکار پر ڈٹا رہا۔ مجھے کوتسلی تھی کہ یہ نوجوان سالڑکا زیادہ دیر پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا لیکن میں دوسرا طریقہ ابھی استعمال کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

یہ بڑی ہی لمبی بات ہے کہ میں نے کس طرح اس کو بیان دینے پر آمادہ کیا۔ میں ابھی اس کو یہ نہیں بتا رہا تھا کہ صدیق نے کیا بیان دیا ہے۔ اس کو شاید شک تھا کہ صدیق نے کوئی بیان نہیں دیا اور میں شک پر اس کو گھیرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس نے اگر ایسا سوچا تھا تو ٹھیک سوچا تھا۔ کوئی شخص قتل جیسے جرم کا اس طرح اقبال نہیں کیا کرتا جس طرح

صدیق نے کیا تھا۔ بے شک اس نے ظاہر یہ کیا تھا کہ قتل میں وہ شامل نہیں تھا لیکن لاش کے ٹکڑے دبانے میں شامل تھا اور یہ بھی جرم تھا کہ اس نے یہ بات پولیس سے چھپا کر رکھی۔

اقبال نے ایسی صورت پیدا کر دی کہ میں نے ضروری سمجھا کہ صدیق کے بیان کے حصے اس کو سنا دوں۔ میں نے کہا کہ صدیق نے اس کو قتل سے منع کیا تھا اور آخر اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ ساجے کو مار پیٹ کر چھوڑ دیں گے۔ پھر صدیق کا بیان سناتے ہوئے جب میں نے یہ کہا کہ صدیق قتل میں شامل نہیں تھا تو اقبال اچھل پڑا۔

''بکواس کرتا ہے حرام زادہ!''___اقبال نے بھڑک کر کہا___''میں نے کہا تھا کہ ساجے کو اتنا ماریں پیٹیں گے کہ اس کی ایک دو ہڈیاں ٹوٹ جائیں اور پھر چھوڑ دیں گے لیکن صدیق نے کہا کہ اس طرح ہم پکڑے جائیں گے، قتل کر کے پھینک آئیں گے''۔

یہ بات اقبال کے منہ سے سخت غصے کے عالم میں نکل گئی تھی۔ وہ آخر نوجوان اور نادان تھا۔ صدیق نے جو بیان دیا تھا وہ بھی غصے اور نوجوانی اور نادانی کی وجہ سے دیا تھا۔ یہ کوئی پکے جرائم پیشہ تو تھے نہیں کہ تھانے میں آ کر محتاط رہتے۔ میں آپ کو اقبال کا بیان سناتا ہوں۔

بلیک میلنگ مہنگی پڑی

اقبال کا بیان یوں تھا کہ اس کی شادی بیس بائیس روز پہلے ہوئی تھی۔ پہلی رات ہی اس کی دلہن نے اس کو کہا کہ چار پانچ مہینے گزرے وہ سہیلی کے گھر جا رہی تھی۔ دن کا وقت تھا۔ اس کو قصبے سے نکل کر کھیتوں میں سے گزرنا تھا اور اس کے آگے سہیلی کا گھر تھا۔ اس وقت کھیتوں میں باجرے کی فصل کھڑی تھی جو بہت اونچی تھی۔

اس دور میں لڑکے اس طرح لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے تھے جس طرح آج کل ہوتا ہے۔ لڑکیاں بے دھڑک کھیتوں میں سے گزرتیں اور اکثر کھیتوں کو نکل جایا کرتی تھیں لیکن ساجا بہت ہی گھٹیا آدمی تھا۔ اقبال کی بیوی کھیتوں میں سے گزر رہی تھی کہ ساجان سامنے آ گیا اور اس لڑکی کو روک کر عشق و محبت کے مکالمے شروع کر دیئے۔ یہ شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس نے کچھ کہے بغیر وہاں سے بھاگنا چاہا تو ساجے نے اس کا بازو پکڑ لیا اور فصل میں گھسیٹنے لگا۔ لڑکی نے مزاحمت کی اور پھر روئی اور گالیاں بھی دیں لیکن ساجا جو اپنے آپ کو شہزادہ سمجھتا تھا اس کو فصل میں لے گیا اور گرا لیا۔

لڑکی نے ساجے کی ناک پر بڑی زور سے مکا مارا اور اپنے آپ کو چھڑا کر وہاں سے بھاگ آئی۔ اس لڑکی کی کمزوری یہ تھی کہ باپ بہت ہی شریف اور معزز آدمی تھا اور بڑا بھائی ایک ہی تھا باقی چھوٹے تھے۔ لڑکی زہر کا گھونٹ پی کر چپ رہی۔ اس نے سوچا یہ تھا کہ ساجا امیر اور بدمعاش خاندان کا لڑکا ہے جو لڑکی کے باپ اور بھائی کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور پھر بے عزتی الگ ہوگی۔ لڑکی نے زبان تو بند رکھی لیکن ساجے کی اس حرکت کو نہ بھول سکی نہ برداشت کر سکی۔ یہی سوچتی رہتی تھی کہ اس سے انتقام کس طرح لیا جائے۔

اس کی شادی ہوئی تو اس نے اقبال کے ساتھ یہ بات کی اور کہا کہ وہ ساجے سے اپنی بے عزتی کا انتقام لینا چاہتی ہے اور اس معاملے میں وہ بہت ہی بے تاب ہے۔ اقبال نے جذبات میں آ کر وعدہ کیا کہ وہ انتقام لے کر دکھائے گا۔ لڑکی ایک تو اقبال کی بیوی تھی اور دوسری بات یہ کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے اور شادی کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہوگئی اور دونوں ایک دوسرے کے لیے ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو گئے۔ لڑکی نے اقبال کو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ اس کو اس وقت خاوند تسلیم کرے گی جب وہ ساجے سے انتقام لے لے گا۔ ایسے ہی جذباتی الفاظ اقبال نے بھی کہہ دیئے۔

اقبال نے صدیق کے ساتھ بات کی۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ اقبال اور صدیق کی بڑی گہری دوستی تھی۔ ان کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا بھی تھا۔ صدیق اور ہی زیادہ جذباتی لڑکا تھا۔ اس نے کہا کہ ساجے کو قتل ہی کر دیتے ہیں۔ اس علاقے میں قتل تو کوئی جرم سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ یہ غیرت مندی کی انتہا تھی اور یہ لوگ دوستی میں بھی اتنے پکے تھے کہ ایک دوسرے پر جانیں قربان کرتے تھے۔ یہ کوئی عجیب واقعہ نہیں تھا۔

پھر ویسے ہی ہوا جیسے صدیق نے مجھ کو سنایا تھا کہ قتل کی رات وہ باہر گھوم پھر رہے تھے کہ ان کو ساجا جاتا نظر آ گیا۔ اس وقت اقبال نے کہا کہ وہ کلہاڑی لے آتا ہے لیکن اس کو قتل نہیں کریں گے بلکہ مار پیٹ کر چھوڑ دیں گے لیکن صدیق نے کہا کہ یہ دیکھی جائے گی۔ تم کلہاڑی لے آؤ۔ اس دن اقبال کی بیوی اپنے ماں باپ کے گھر تھی۔ اقبال گھر سے کلہاڑی لے کر واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ صدیق کے ہاتھ میں چارہ کترنے والا ٹوکا تھا۔ انہوں نے گھر میں بھینس رکھی ہوئی تھی جس کے لیے وہ چارہ کترا کرتے تھے۔

صدیق صرف دوستی کا حق ادا نہیں کر رہا تھا بلکہ اس کے دل میں بھی ساجے کی دشمنی بھری ہوئی تھی۔ تین چار مہینے پہلے اس کی کسی بات پر ساجے کے ساتھ لڑائی ہوگئی تھی اور

ساجے نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر صدیق کو مارا پیٹا تھا۔

آگے ویسے ہی ہوا جیسے صدیق نے سنایا تھا۔ زرینہ اور ساجے کی ملاقات ہوئی۔ اقبال اور صدیق کو معلوم نہیں تھا کہ وہ عورت کون ہے۔ وہ چلی گئی اور ساجا واپس گھر کو چل پڑا۔ اقبال اور صدیق نے اس کو روک لیا اور اقبال نے کہا کہ وہ آج اپنی بیوی کی بے عزتی کا انتقام لے گا۔ صدیق نے اپنی دشمنی بتائی۔ ساجے نے دیکھا کہ ایک کے پاس کلہاڑی اور دوسرے کے پاس ٹوکا ہے تو اس نے معافیاں مانگنی شروع کر دیں۔ اقبال نے پیچھے ہو کر ساجے کی گردن پر کلہاڑی ماری۔ ساجا گرنے سے پہلے گھوما تو صدیق نے اس کی گردن پر ہی ٹوکا مارا۔ ساجا گرا تو اقبال نے اس کی گردن پر کلہاڑی مار کر گردن بالکل ہی کاٹ ڈالی۔

ان دونوں قاتلوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس لاش کے ٹکڑے کر کے مختلف جگہوں میں دبا دیئے جائیں۔ ان کے دماغوں کو خون چڑھا ہوا تھا۔ یہ ایک طرح کا پاگل پن ہوتا ہے۔ دونوں نے مل کر لاش کی ٹانگیں کاٹیں پھر بازو کاٹے اور اس طرح ٹکڑے کر کے کلہاڑی سے زمین کھود کھود کر مختلف جگہوں میں دبا دیئے اور ان کو تسلی ہوگئی کہ اب وہ پکڑے نہیں جائیں گے۔ دونوں بڑے اطمینان سے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

ان کم عقل نوجوانوں کو معلوم نہیں تھا کہ کسی انسان کا خون کوئی پیشہ ور قاتل بھی ہضم نہیں کر سکتا۔ صدیق نے غصے کی حالت میں یہ راز فاش کر دیا تھا لیکن اصل بات یہ تھی کہ اس کا ضمیر انسانی خون کو برداشت نہیں کر سکا تھا اور اس بہانے اس نے یہ راز اگل دیا۔

اقبال کو میں نے تیار کر لیا تھا کہ وہ مجسٹریٹ کو اپنا یہ بیان قلمبند کرا دے۔ اس کی حوصلہ افزائی اور تسلی کی خاطر میں نے وعدہ کیا تھا کہ اس کو بری کروانے کی پوری کوشش کروں گا یا کم سے کم سزا دلواؤں گا۔

اب میں آپ کو ایک دلچسپ بات سناتا ہوں۔ شاید آپ بھی سوچتے ہوں کہ اقبال اور صدیق کی دوستی اتنی گہری تھی تو پھر وہ ایک دوسرے کے دشمن کیسے بن گئے۔ میں خود اقبال کے بیان کے دوران یہ بات سوچتا رہا۔ اقبال کے واسطے یہ بات بالکل معمولی تھی کہ صدیق اس کی غیر حاضری میں اس کے گھر گیا تھا۔ وہ تو جاتا ہی رہتا تھا۔ پھر بات چاقو زنی تک کیسے پہنچ گئی۔

اصل واقعہ یہ ہوا تھا کہ قتل کے فوراً بعد اور ان چار پانچ دنوں میں ہی صدیق نے اقبال کی بیوی کو اسی رات بتا دیا تھا کہ اس نے اور صدیق نے ساجے کو قتل کر دیا ہے۔ بیوی

کچھ پریشان ہوگئی تھی کہ وہ پکڑے جائیں گے۔ اقبال نے اس کو اطمینان دلایا کہ ان کا کھرا کھوج بالکل نہیں ملے گا۔

صدیق کو معلوم تھا کہ اقبال کس وقت گھر نہیں ہوتا۔ اقبال کی بیوی کو میں نے اچھی طرح دیکھا تھا۔ بھولی بھالی اور اچھی خوبصورت لڑکی تھی۔ صدیق کی نیت خراب ہوگئی اور اس نے لڑکی کو کہا کہ وہ کسی بھی وقت اقبال کو پھانسی کی سزا یا عمر قید دلوا سکتا ہے۔ اس نے لڑکی کو یہ بتایا کہ وہ خود قتل میں شامل نہیں تھا۔ لڑکی بہت گھبرائی اور صدیق کی منتیں کرنے لگی۔ آپ جانتے ہیں کہ صدیق نے اس سے کیا مطالبہ کیا ہوگا لیکن آپ نے اس کہانی سے محسوس کیا ہوگا کہ لڑکی غیرت والی تھی اس واسطے اس نے صدیق کا مطالبہ قبول نہ کیا۔

صدیق اگلے روز بھی اقبال کی غیر حاضری میں اس کے گھر جا پہنچا اور پھر اس کی بیوی کو بلیک میل کرنے لگا۔ اس لڑکی نے اس کو کہا کہ وہ جتنی رقم مانگے وہ دے دے گی لیکن اپنی عزت نہیں دے گی۔ صدیق نے ڈھیٹ پن جاری رکھا اور لڑکی کو بہت پریشان کرتا رہا۔ لڑکی نے ابھی اقبال کو نہیں بتایا تھا۔

آخر ایک روز صدیق نے لڑکی پر اسی طرح دست درازی کی جس طرح مقتول نے کی تھی۔ لڑکی نے صدیق کو کہا کہ وہ شور مچا کر سارا محلہ اکٹھا کر لے گی۔ اس دھمکی نے کچھ کام کیا اور صدیق اس کو دھمکی دے کر گھر سے نکل گیا۔

صدیق کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد اقبال آ گیا اور اپنی بیوی کو پریشان حالت میں دیکھا اور اس کی آنکھیں کچھ سرخ دیکھیں۔ اقبال نے پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ اس کی بیوی نے اس کو ساری بات اور صدیق کی بلیک میلنگ سنا دی۔

اقبال کے خون میں ایسا ابال آیا کہ اس کا دماغ پھر گیا۔ اس نے بیوی کو بغیر بتائے چاقو اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ اس واقعہ نے چونکہ ہونا تھا اس واسطے صدیق اس کو گلی میں ہی مل گیا۔ اقبال نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ وہ صدیق کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے صدیق کو یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ اس کی بیوی کو بلیک میل کرتا ہے۔ اس سے ان کی ترش کلامی ہوئی اور دو تین آدمی رک گئے۔

اقبال نے صدیق کو چاقو مارا لیکن چاقو کندھے پر تھوڑا سا لگا۔ اگر لوگ درمیان نہ آ جاتے تو اقبال صدیق کو قتل ہی کر دیتا۔

میں بتا رہا تھا کہ اقبال مجسٹریٹ کو بیان لکھوانے پر تیار ہو گیا۔ میں نے اس کو

حوالات میں بند کر دیا اور صدیق کو بلایا۔ اس کو کہا کہ اس نے پہلے جو بیان دیا تھا وہ بالکل جھوٹا ہے اور اب وہ صحیح بیان دے دے۔ یہ بھی بتایا کہ اقبال نے اقبالی بیان دے دیا ہے۔

صدیق کچھ تڑپا اور انکار کیا لیکن میں نے اس کو پولیس والا تھوڑا سا دوسرا ہاتھ دکھایا۔ پھر اس کو اقبال کے بیان کے ایک دو حصے سنائے اور میں نے اس کو گالیاں دے کر کہا کہ اتنی گہری دوستی میں وہ ایک دوست کی بیوی کو بلیک میل کرتا رہا ہے۔ بہر حال تھوڑے سے تشدد سے وہ اقبالی بیان پر آ گیا۔

دونوں نے مجسٹریٹ کو اقبالی بیان قلمبند کروا دیئے۔ میں نے مقدمہ بڑی ہی محنت سے تیار کیا۔ خالی خانے بڑی خوش اسلوبی سے پُر کئے اور چالان عدالت میں پیش کر دیا۔

دونوں کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ دونوں نے اپیلیں کیں جو ہائی کورٹ نے مسترد کر کے دونوں کی سزائیں بحال رکھیں۔

﴿ختم شد﴾